بسم اللہ الرحمن الرحیم

علوم القرآن

از

حضرت علامہ مولانا سید شمس الحق صاحب افغانی

شیخ التفسیر، جامعہ اسلامیہ، بہاولپور

شائع کردہ

المکتبۃ الاشرفیہ

شارع جلال الدین رومی (فیروز پور روڈ)

جامعہ اشرفیہ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علوم القرآن

از

حضرت علامہ مولانا سید شمس الحق صاحب افغانی

شیخ التفسیر، جامعہ اسلامیہ، بہاولپور

شائع کردہ

المکتبۃ الاشرفیہ
شارع جلال الدین رومی (فیروزپور روڈ)
جامعہ اشرفیہ لاہور

طبع في المطبعة العربية
[illegible]

قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ

کہہ دیجیے کہ یہ قرآن ایمان والوں کے لیے عظیم الشان راہ نما اور نسخۂ شفا ہے

اَلَا اِنَّ هٰذَا شَمْسُ عِلْمٍ تَلَأْلَأَتْ ‍ ‍ ‍ عَلٰى اُفُقِ الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ

خبردار یہ کتاب علم و معرفت کا ایک آفتاب ہے، جو قرآن کے اُفق پر ہر طرف چمک گیا ہے!

كِتَابٌ وَّنِبْرَاسٌ وَّنُوْرٌ وَّحِكْمَةٌ ‍ ‍ ‍ وَّفِيْ كُلِّ سَطْرٍ مِّنْهُ عِلْمُ الْعَجَائِبِ

یہ ایک کتاب ہے اور ایک چراغ ہے۔ نور اور حکمت ہے اس کی ہر سطر میں عجائب قرآن کا علم موجود ہے!

فَاِنْ اَنْتَ تَشْتَهِيْ اَنْ تَفُوْزَ فَفُزْ بِهٖ ‍ ‍ ‍ مَعَارِفُ شَمْسِ الْحَقِّ فَوْقَ السَّحَائِبِ

اگر تم کو علومِ قرآنیہ پر فائز ہونے کی خواہش ہو تو اس کتاب سے کامیاب ہو سکتے ہو کیونکہ حضرت مولانا شمس الحق صاحب دامت برکاتہم کے معارف بادلوں کی بلندی سے کہیں اُوپر ہیں۔

لَهٗ عِلْمُ اَسْلَافٍ وَّتَدْبِيْرُ خَالِفٍ ‍ ‍ ‍ وَّشَرْحُ كَلَامِ اللّٰهِ جُلُّ الْمَطَالِبِ

حضرت موصوف کا علم تو اسلاف کا ہے اور تدبیر متاخرین کی ہے اور کلام اللہ کے زبردست جلیل المطالب شارح ہیں

بِهٖ تَدْفَعُ الزَّيْغَ الَّذِيْ شَاعَ عِنْدَنَا ‍ ‍ ‍ لِاَهْلِ الْهَوٰى مِنْ كُلِّ اَهْلِ الْاَكَاذِبِ

اس کتاب سے تم وہ کجی درست کر سکتے ہو جو فی زمانہ رواج پا چکی ہے اور جس کو اہلِ ہوا اور کاذبین نے رواج دیا ہے!

احقر الخُدّام

لطافت الرّحمٰن الافغانی کان اللہ لہٗ

فہرست مضامین

تمت بالخیر

پیش لفظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَهٗ

احقر چالیس سال سے زیادہ عرصہ قرآن حکیم کی خدمت میں مصروف رہا ہے اور قرآنی علوم سے متعلق تفاسیر اور دیگر مصنفات جن سے قرآن فہمی میں مدد لی جاسکتی تھی خواہ قدیم ہوں یا جدید ان کا بقدر استطاعت مطالعہ کیا گیا اور جو معارف قلب پر منجانب اللہ وارد ہوئے، ان سب کو وقتاً فوقتاً درس قرآن کی شکل میں پیش کرتا رہا۔

احقر کے ان دروس سے قدیم وجدید دونوں طبقوں کو بحمد اللہ امید سے زائد نفع ہوا۔ احباب کا اصرار تھا کہ میں تفسیر لکھوں لیکن میں نے بجائے تفسیر لکھنے کے یہ مناسب سمجھا کہ قرآنی علوم کے مختلف شعبوں پر مختلف کتابیں لکھ دوں تاکہ مختصر وقت میں ناظرین ان کو پڑھ سکیں، اور ضخامت کی کمی کی وجہ سے کم مالی استطاعت رکھنے والے حضرات بھی ان سے مستفید ہوسکیں، لیکن تالیف میں اس امر کا خیال رکھا گیا کہ:۔

(۱) مطالب قرآن کے تعین میں جادۂ سلف سے انحراف نہ ہو اور جو کچھ معارف وحقائق بیان ہوں وہ اپنے اندر مسلک سلف کی تائیدی شان رکھتے ہوں نہ تحریفی۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ دورِ حاضر چونکہ دورِ عقلیت وتفلسف ہے لہٰذا مقاصد شرعیہ نقلیہ کو عقل اور فلسفہ کے رنگ میں بیان کیا جائے تاکہ مغرب زدہ طبقہ کے لئے سامان ہدایت ہو۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ تعبیرات مقاصد میں اصطلاحی تعبیرات سے کم کام لیا جائے اور زیادہ تر وہی تعبیر اختیار کی جائے جو مذاق جدید کے مطابق ہو۔ احقر چونکہ بیحد مصروف ہے لہٰذا غیر ضروری بسط وتفصیل سے اجتناب کیا گیا اور مطلب خیز اختصار پر اکتفا کیا گیا، ورنہ عام مصنفین دور حاضر کے انداز پر اگر تالیف ہوتی تو اس سے کئی گنا زیادہ ضخیم کتاب مرتب ہوسکتی تھی۔

کتاب کی ترتیب حسب ذیل ہے۔

① ضرورۃ القرآن
یعنی نوعِ انسانی کے لئے وحی الٰہی اور قرآن کی ضرورت پر عقلی و فلسفی دلائل۔
② صداقۃ القرآن
یعنی قرآن کے منجانب اللہ ہونے اور معجز ہونے کی عقلی دلائل اور مستشرقین یورپ کی تردید۔
③ تنزیل القرآن و تدوینہ
نزول قرآن و جمع قرآن کی تحقیق۔
④ محفوظیۃ القرآن
قرآن کی محفوظیت کے دلائل اور مستشرقین کے شبہات کی تردید۔
⑤ مہمات القرآن
یعنی قرآن کے اہم مقامات کا حل اور ان کے حکم و اسرار اور ازالۂ شبہات۔
⑥ احکام القرآن
قرآن کے فقہی احکام اور ان کی حکمت اور دورِ حاضر کے شبہات کے جوابات۔
⑦ تعبیرات القرآن
قرآنی تعبیرات کا تحقیقی حل تاکہ صحیح مطالب قرآنی معلوم ہوسکیں اور جدید الخیال اہلِ قلم کی خامیاں واضح ہوجائیں۔

پہلے پانچ باب کو ایک کتابی شکل میں شائع کر رہا ہوں جس کا نام "علومُ القرآن" ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس خدمت کی تکمیل کی توفیق دے اور اس کو قبول فرما کر میرے لئے ذریعہ نجات آخرت کر دے اور محترم الحاج سید عبدالرشید شاہ صاحب مہتمم مدرسہ فاروقیہ بہاولپور کیلئے اللہ جل جلالہ یہ کتاب سعادت کا موجب بنا دے کہ ان کی دینی محبت اور مجاہدانہ مساعی اس کتاب کی اشاعت کا سبب بنیں۔

احقر:
شمس الحق افغانی عفا اللہ عنہ

ضرورۃ الوحی والقرآن

انسان کی سعادت وشقاوت کے اصُول بتلانے کے لئے عقل انسانی کافی نہیں۔ ایک تو اس وجہ سے کہ عقل کے معلومات سائنس کے اصُول کے تحت تجربات اور مشاہدات کے تجزیہ وتحلیل سے ماخوذ ہیں اور سعادت وشقاوت کے اصُول عقائد، اخلاق اور اعمال کی خصوصیات کی معرفت سے ماخوذ ہیں جو کہ تجربات، مشاہدات اور محسوسات کے دائرہ سے خارج ہیں، تجربہ اور مشاہدہ کے ذریعہ اُن کا تجزیہ وتحلیل نہیں کیا جاسکتا اور نہ ان کے لئے کوئی لیبارٹری ہے۔

دوم اس وجہ سے کہ عقل کے فیصلوں میں وہم کی مداخلت ہوتی ہے، جس کی وجہ سے عقل کے فیصلوں میں غلطی واقع ہوجاتی ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ عقول متفاوت ہیں۔ عقل صحیح کی صورتیں کم اور عقول فاسدہ کی صورتیں ان امور کے متعلق زیادہ ہیں۔

چوتھی یہ کہ عقل کے فیصلے بسا اوقات جذبات کے تحت ہوتے ہیں، جن کی وجہ سے ان کے فیصلے اکثر غلط ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقوام عالم کی عقلوں کے فیصلے معرفت الٰہی، دریافتِ حقیقتِ نبوّت، اور مجازاتِ اعمال اور امورِ آخرت اور صحیح اور غلط اعمال کے متعلق متضاد ہیں۔ کوئی قوم شرک کو صحیح سمجھتی ہے کوئی تثلیث کو، کوئی خدا پرستی کو، کوئی مخلوق پرستی کو۔ کوئی قوم گائے کا گوشت کھانے کو معصیت سمجھتی ہے کوئی اس کے خلاف۔ کوئی خنزیر خوری کو اچھا سمجھتا ہے، کوئی اس کے خلاف۔ کسی کا طریقہ عبادت و رضاء الٰہی کچھ ہے کسی کا کچھ۔ کسی کا تصوّرِ نبوّت اور ہے کسی کا اور۔ کوئی مجازات اعمال جنّت و دوزخ کی شکل میں مانتا ہے، کوئی بصورت راحت والم رُوحانی، کوئی بصورت تناسخ۔ یہی حال تمام امور روحانیہ میں ہے جو اس امر

کی دلیل ہے کہ مذکورہ امور میں عقل کافی نہیں۔ اب ہم وہ دلائل عقلی پیش کرتے ہیں جن سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ ان امور کی معرفت کے لئے خالق کائنات کی وحی اور کلام الٰہی یا بالفاظ دیگر قرآن کی ضرورت ہے تاکہ انسان کی سعادت و شقاوت کے اصول کا قطعی فیصلہ اس طرح طے ہو جائے کہ جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ جس کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ضرورۃ القرآن کی دلیل بقائی

پہلی دلیل، دلیلِ بقائی ہے۔ فطرۃً ہر انسان کی خواہش ہے کہ اس کو دوام بقار و حیات حاصل ہو۔ کیونکہ انسان کی کل نعمتیں وابستہ حیات ہیں، اگر حیات نہ ہو تو کل نعمتیں، مال، جاہ، اقتدار، خوراک، پوشاک بیوی سب بیکار ہیں۔ اس فطری جذبے کی دلیل یہ ہے کہ ہر انسان کی بقار حیات پر اگر کوئی دشمن حملہ کرے تو وہ حبِ ذات اور حبِ بقار کے جذبے کے تحت مدافعت کی کوشش کرتا ہے اور حیات و بقار کو محفوظ رکھنے کی جد و جہد کرتا ہے۔ اسی طرح اگر اس پر کسی بیماری کا حملہ ہو جس سے حیات و بقار کو خطرہ لاحق ہوتا ہے تو وہ علاج معالجہ پر بڑی رقم خرچ کرکے بقار حیات کے لئے سعی کرتا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ حبِ بقا کا جذبہ فطری ہے اب اس عالمِ تغیّرات اور جہانِ فنار میں کسی انسان کو یہ فطری مقصد حاصل نہیں۔ اب اگر زندگی کے کسی دور میں بھی انسان کو دوام حیات اور استمرار بقار کا مقصد حاصل نہ ہو تو ایسی صورت میں یہ کہا جائے گا کہ انسان نے ایک ناممکن چیز کی فطری خواہش کی جو علم النفسیات کے لحاظ سے درست نہیں، کیونکہ ناممکنات فطری مطلوب نہیں ہو سکتے اور نہ ایک ناممکن مقصد پر تمام افرادِ انسانی متفق ہو سکتے ہیں۔ یہ بات ناممکن ہے کہ ۲ دو دونے پانچ ہو تو کیا پوری انسانی تاریخ میں صرف ایک شخص ایسا مل سکتا جس کی یہ خواہش ہو کہ دو دونے پانچ ہو جائے۔ یہ ناممکن عقلی ہے۔ اسی طرح ناممکن عادی بھی فطرۃً تمام انسانوں کا مطلوب نہیں بن سکتا۔ کوئی انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے یہ خواہش نہیں رکھتا کہ وہ انسان ہو کر ساری عمر کھانے پینے اور سانس لینے سے بے نیاز ہو جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ناممکن امر خواہ عقلی ہو یا عادی، تمام انسانوں کا فطری مطلوب نہیں بن سکتا۔ تو دوام حیات جو فطرۃً تمام انسانوں کا مطلوب ہے وہ ناممکن نہیں بلکہ ممکن الحصول ہے۔ اب دوام بقار کے لئے اس دنیا میں

جو عالم تغیرات ہے ایسی چیزیں موجود ہیں جو انجام خراب اور بدلنے والی چیزوں کے ساتھ لگ جائے تو ان کے ربط و تعلق سے اس کو ایک محدود زمانے تک بقاء حاصل ہو جاتی ہے۔ مثلاً تازہ مچھلی کو نمک لگا کر اور خشک کر کے ایک مدت تک باقی رکھا جا سکتا ہے۔ چین وغیرہ میں شہد سے بھرے ہوئے صندوق میں آدمی کی لاش کو رکھ کر بقاء محدود کا سامان کیا جاتا ہے۔ مصر کے آثار قدیمہ میں ایسے سیب دریافت ہوئے کہ اس پر لکھی ہوئی تاریخ سے یہ معلوم ہوا کہ پانچ ہزار سال سے وہ سیب ممی کی وجہ سے جو فرعونوں کے ایک عالم تغیر میں ایک دریافت کردہ حیلہ ہے محفوظ ہے۔ تو کیا جب عالم تغیر میں اضافی بقاء کا یہ سامان موجود ہے تو ابدی اور لازوال اشیاء میں ایسا کوئی معاملہ نہیں جس کا ربط و تعلق انسان کی روح سے حاصل ہو کر اس کو دوام بقاء اور استمرار حیات کی دولت سے متمتع کر دے۔ ابدی اور لازوال چیزیں اللہ اور اس کی صفات ہیں جن سے انسان کے ساتھ قابل اتصال چیز صرف اللہ کا وصف کلام یا وحی الٰہی ہے جو اپنی ابدیت کی وجہ سے انسان کے لئے دوام حیات اور بقاء مستمر کا سامان ہو سکتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے مختلف انبیاء علیہم السلام پر اپنا کلام اتارا تاکہ انسان کو دوام حیات جو اس کا فطری مطلوب ہے حاصل ہو۔ یہ شبہ کہ کلام الٰہی مثلاً قرآن تو دنیا میں نازل ہوا تو دنیا میں اس نے دوام حیات کیوں نہیں بخشا، نامعقول ہے کیونکہ دوام حیات کے لئے دار الفناء (دنیا) سے منتقل ہونا ضروری ہے تاکہ مؤثرات فنا کے حوالے سے اس کو خارج کر کے دوام حیات کے معاملہ سے ایسے محفوظ جہان حیات میں اس کو بقاء دوام حاصل ہو، جہاں پر اس کی ضد اور مخالف مؤثرات موجود نہ ہوں۔ اس کے علاوہ اس جہان میں اگر دوام ہو تو کرۂ ارضی کی تنگ دامانی تمام افراد انسانی کی سکونت کی متحمل نہیں ہو سکے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ دوام بقاء کے فطری جذبے کی تکمیل کے لئے کلام الٰہی اور وحی ربانی کی ضرورت ہے۔ یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اسلامی زاویہ نگاہ سے کلام الٰہی پر ایمان رکھنے والوں کو جس طرح جنت کی صورت میں دوام حیات حاصل ہوگا تو منکرین کلام الٰہی اور کفار کو بھی دوزخ کی صورت میں دوام حیات ہوگا، لیکن وہ حیات موت سے بدتر ہے۔ جس کا جواب یہ ہے کہ کلام الٰہی کا اثر دوام حیات ہے کیونکہ کلام الٰہی ابدی ہے اور اس کا اثر بھی حیات انسانی کو ابدی بناتا ہے جو مومنین اور کفار دونوں کے حق میں بشکل دوام جنت اور دوام دوزخ موجود ہے تو کلام الٰہی کا اصل اثر دوام حیات رہا۔ لیکن دوام حیات کی دو قسمیں ہیں۔ دوام با راحت اور دوام با درد و الم۔ یعنی ایک سکھ کا دوام اور دوسرا دکھ کا دوام۔ یہ فرق انسانی

استعداد اور طرزِ عمل نے پیدا کیا ہے کہ سکھ والوں نے ایمانی استعداد کے ساتھ کلام الٰہی سے ربط قائم کیا اور کفار نے مخالفت اور استعداد انکار کے ساتھ قائم کیا، اس لئے دوام کی نوعیت میں فرق آیا۔ جس کی مثال یہ ہے کہ سورج کے شعلوں کا اثر چیز کو سفید کرتا ہے لیکن جب دھوبی گھاٹ میں کپڑے دھوتا ہے اور سورج کی روشنی پڑتی ہے تو اس سے کپڑے تو سفید ہو جاتے ہیں لیکن خود دھوبی کا بدن سیاہ اور کالا ہو جاتا ہے حالانکہ سورج کا ربط دونوں سے یکساں ہے۔ یہ تفاوت کپڑے اور دھوبی کے بدن کے استعداد کے فرق کی وجہ سے ہوا۔ یہی حال اہل ایمان اور اہل کفر کا ہے۔ قرآن نے بھی اسی فرق کو واضح کیا ہے

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ	ہم قرآن کو اتارتے ہیں تمام کمزوریوں کو دُور کرنے
وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ	اور قوت و رحمت کا سامان کرنے کیلئے لیکن کفار کے معاندانہ
الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا۔ بنی اسرائیل آیۃ ۸۱	ظلم کی وجہ سے یہ قرآن اُن کیلئے نقصان کا سامان بن جاتا ہے

۲۔ دلیل قانونی

انسان میں فطرۃً دو قوتیں شہویہ (تزوعیہ) و غضبیہ موجود ہیں۔ قوتِ شہویہ قدرت نے اس کو اس لئے عطا کی ہے کہ اس کے ذریعہ اپنے فوائد کے لئے جد و جہد کرے اور غضبیہ اس لئے کہ اگر کوئی دوسری قوت انکے ساتھ ان فوائد کے حصول میں مزاحمت اور مقابلہ کرے تو قوت غضبیہ کے ذریعہ یہ مدافعت کر کے اس کا مقابلہ کرے۔ انسانی فوائد کے کلیات ماکولؔ، مشروبؔ، ملبوسؔ، مسکنؔ ہے اور بعد از بلوغ منکوحؔ یعنی بیوی ہے۔ یہی تمام انسانوں کے محبوب مقاصد ہیں۔ یہ سب جسمانی مقاصد ہیں۔ یعنی کھانے کا سامان، پینے کا سامان، پوشاک اور مکان رہائش اور روحانی اور معنوی مقاصد دو اور ہیں۔ دینؔ اور جاہؔ یعنی وہ دین اور عزت کی طلب بھی کرتا ہے اور اگر کوئی مزاحمت کردے تو قوت غضبیہ کے ذریعہ اس مزاحم سے مقابلہ بھی کرتا ہے جب یہ سب چیزیں تمام انسانوں کے مقاصد ہیں تو ہر ایک ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ان کے حصول کی راہ میں جو بھی مانع و حائل بنے گا تو اس کے ساتھ مزاحمت و مقابلہ کرے گا، جن کی وجہ سے ان امور میں افراد انسانی کے درمیان جھگڑے اور تنازعات اور مخاصمات قائم ہوں گے اور دیوانی و فوجداری مقدمات برپا ہوں گے جو ہر ملک اور ہر قوم میں ہمیں صاف نظر آ

رہے ہیں۔ اس لئے ان سات حقوق کی حفاظت کے لئے قانون عادلانہ کی ضرورت فطرتاً ناگزیر ہے تاکہ اقامتِ انصاف ہو اور نزاع ختم ہو۔ اب وہ قانون کس کا ہو؟ انسان کا یا خدا کا۔ تو یہ ظاہر ہے کہ اس قانون عادلانہ کے بنانے والے کے لئے مندرجہ ذیل چار اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔

۱۔ علمِ محیط ۲۔ رحمتِ کاملہ ۳۔ قدرتِ تامہ ۴۔ غیر جانبداری

علمِ محیط اس لئے ضروری ہے کہ انسانی حقوق کے ہر پہلو کا علم رکھتا ہو اور انسانی فوائد و حقوق کے متعلق اس کو انسان کے تمام ادوارِ حیات پر نظر ہو یعنی دنیا، قبر، آخرت تاکہ اس کا عادلانہ فیصلہ انسانی زندگی کے ان تمام منزلوں میں درُست ہو، ایسا نہ ہو کہ ایک دور کے لئے درست ہو اور باقی کے لئے غلط ہو اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ فیصلہ انسان کے انفرادی نتائج کے لحاظ سے بھی درُست ہو اور اجتماعی لحاظ سے بھی، اور ظاہری نتائج کے لحاظ سے بھی اور گہرے اور عمیق نتائج کے لحاظ سے بھی۔ مثلاً اگر انسان سُود کے جواز اور رضامندی کے ساتھ زنا اور لواطت کے جواز کا قانون بنائے جیسے یورپی قانون ہے تو اس میں شخصی آزادی کے خوش نما جذبے کا تو لحاظ رکھا گیا ہے، لیکن ان سب میں سوسائٹی اور معاشرے کے اجتماعی ضرر، اسی طرح سُود کے عمیق نتائج یعنی حرص میں اضافہ، انسانی ہمدردی کے فقدان اور زنا اور لواطت سے صحتِ جسمانی اور عملی قوتوں کی کمزوری کی مضرتوں کو نظرانداز کیا گیا ہے نیز قبر و آخرت میں جو ان پر عذاب ہوگا کو بھی پسِ پُشت ڈال دیا گیا ہے۔

رحمتِ کاملہ اس لئے ضروری ہے کہ قانون عادلانہ کی تدوین کے وقت غفلت نہ برتی جائے اور دیدہ و دانستہ قانون میں ایسے اجزا شامل نہ کر دے جو خلافِ انصاف ہوں۔

قدرتِ کاملہ اس لئے ضروری ہے کہ کسی دباؤ میں آکر راہِ عدل سے انحراف نہ کر دے یا مجرم کو سزا دینے میں کمزوری نہ دکھائے۔

لاجانبداریت یعنی قانون ساز کے لئے غیر جانبدار ہونا اس لئے ضروری ہے کہ وہ ہم قوم، ہم وطن، ہم رنگ اور ہم زبان لوگوں کی طرفداری نہ کرے اور قانون سازی میں ان کی رعایت کر کے اوروں کو نقصان نہ پہنچائے، جیسے کہ اہلِ یورپ آج کل ایسا کرتے ہیں۔

یہ چاروں صفات جو قانونِ عادلانہ کی تشکیل کے لئے ضروری ہیں وہ صرف ذاتِ خداوندی میں موجود ہیں

نہ اس کے برابر کسی کا علم محیط ہے نہ اس کے برابر کسی کی رحمت۔

اَللّٰہُ اَرْحَمُ بِعِبَادِہٖ مِنَ الْاُمِّ بِوَلَدِھَا۔ خدا کی رحمت اس سے زیادہ ہے جو ماں کو اولاد پر ہے

نہ اُس کے برابر کسی کی قدرت ہے کہ کسی سے دب کر قانون بنانے میں اس کی رعایت کرے یا مجرم کی سزا میں کسی سے ڈرے، اور صرف خدا کی ذات ہے جو غیر جانبدار ہے نہ وہ کسی کے ساتھ قومیت یا وطن میں شریک ہے کہ ہم قوم اور ہم وطن لوگوں کی رعایت کرے نہ کسی کا ہم رنگ اور ہم زبان ہے۔ بلکہ وہ ایسی ذات ہے جو لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ، لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْئٌ "نہ اس کی نسل ہے نہ کسی سے شرکت ہے"۔ اس لئے قانون عادلانہ جو انسان کا فطری حق ہے وہ صرف اسی ذات سے مختص ہے ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے　　حکمراں ہے اِک وہی، باقی بتانِ آذری

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ط یوسف آیۃ ۴۰　　قانون بنانا صرف خالقِ کائنات کا حق ہے۔

اور وہی قانونِ خداوندی، وحی الٰہی اور احکامِ ربانی یا قرآن کا نام ہے لہٰذا قرآن کی ضرورت نوعِ انسانی کیلئے ثابت ہوئی۔ بہرحال انسانی حقوق کے متعلق قانون خداوندی کے سوا کسی انسانی قانون کی حکمرانی جاہلیت کی حکمرانی ہے۔

اَفَحُکْمَ الْجَاھِلِیَّۃِ یَبْغُوْنَ ط وَمَنْ　　کیا لوگ انسان کے جاہلانہ قانون طلب کرتے ہیں اللہ سے بہتر
اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ حُکْمًا لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ۔　　قانون کس کا ہے اس قوم کیلئے جو حقیقت پر یقین کرتی ہو۔ مائدہ آیۃ ۴۹

غیر حق چوں ناہی و آمر شود　　زور بر ناتواں قاہر شود
زیر گردوں قاہری از آمری است　　آمری از ماسوی اللہ کافری است (اقبال)

۳۔ ضرورۃ القرآن کی دلیل غذائی

دلیل غذائی۔ انسان جسم اور روح سے مرکب ہے جس میں روح جسم کی نسبت اعلیٰ اور اشرف ہے اور بدن اس کی نسبت ادنیٰ اور خسیس ہے یہی وجہ ہے کہ جب موت کے ذریعہ بدن سے روح نکل جاتی ہے تو بدن بیکار ہو جاتا ہے اور روح کی یہ برتری اس قدر واضح اور بدیہی ہے کہ حیوانات اور جمادات تک اس سے

باخبر ہیں۔ مثلاً اگر روح بدن میں موجود ہو اور وہ کئی دن کسی جگہ سویا ہوا ہو تو کوئی چیز اس پر حملہ آور نہیں ہوتی نہ کیڑے مکوڑے پاس پھٹکتے ہیں نہ کتے گدھ اس کا گوشت نوچتے ہیں، نہ زمین اس کے بدن کو کھاتی ہے اور نہ ہوا اور سورج کی دھوپ اسکو بدبودار کر سکتی ہے۔ لیکن اسی انسان کے بدن سے جب جان اور روح نکل جاتی ہے تو جمادات اور حیوانات اس پر حملہ آور ہوتے ہیں حالانکہ مرنے سے پہلے وہ کائنات کا حاکم تھا نہ محکوم۔ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ[1]۔ پھر زمین اُس کے جسم کو کھاتی ہے اور دُھوپ بدبُو کرنا شروع کرتی ہے اور کیڑے مکوڑے ناک اور منہ میں گھسنا شروع کرتے ہیں اور کوّے گدھ اس کا گوشت نوچنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ سب چیزیں جو پہلے انسان سے مغلوب تھیں موت کے بعد کیوں غالب آگئیں، اسی وجہ سے کہ وہ الہامِ الٰہی کے ذریعہ اس امر سے واقف ہیں کہ انسان میں قوت و غلبے کی علت اس کی روح ہے۔ موت سے جب وہ جُدا ہوئی تو اب وہ غالب نہیں رہا بلکہ ان سب چیزوں سے مغلوب ہو گیا جو روح کی برتری کی دلیل ہے۔

اب جب بدن کم تر اور رُوح برتر ہے اور کمتر کی غذا کے لئے قدرت نے انتظام کیا ہے، یہاں تک کہ گندم کا دانہ جس کو انسان کھاتا ہے تو اُس کا پودا جب بنتا ہے کہ یہ وسیع کارخانہ عالم اسمیں اپنا کام کرے، زمین اور پانی تخم گندم سے پودا اُگاتے ہیں، ہوا اُس کو تازہ و تر رکھتی ہے، ستاروں کی کشش اس کی نشوونما کی خدمت کرتی ہے، سورج اس فصل اور دانے کے پکا کر دینے میں مددگار ہے۔ اس طرح یہ وسیع کارخانۂ عالم بدنِ انسانی کی تیاری میں لگا ہوا ہے یہاں تک کہ سورج سمندروں سے بخارات اُڑا کر بادل میں تبدیل کرتا ہے تاکہ پانی برسے اور اس حقیر جزءِ انسانی یعنی بدن کی غذا کی تکمیل ہو۔ اب یہ ضروری ہے کہ قدرت نے ضرور انسان کے اس اعلیٰ اور برتر جزء کی غذا کا بھی انتظام کیا ہو گا کیونکہ یہ ممکن نہیں اور حکمتِ خداوندی کے خلاف ہے کہ کمتر جزء کی غذا کا انتظام کیا جائے اور اعلیٰ جزء کی غذا کو نظر انداز کیا جائے۔ یہ تو ایسا ہو گا کہ کوئی گھوڑے پر سوار رئیس کسی کا مہمان ہو جائے وہ گھوڑے کے کھانے پینے کا انتظام کر دے لیکن خود گھوڑے کے سوار یعنی اس رئیس کو نظر انداز کر دے نہ کھانے کا بندوبست نہ پینے کا۔ یہاں بھی بدن سواری کی طرح ہے، اور روح اُس پر سوار ہے۔ اگر بدن اور سواری کی غذا کا انتظام قدرت کی طرف سے ہوا ہے تو روح کی غذا کا انتظام بھی ضروری ہے کیونکہ نہ گھوڑا غذا کے بغیر اپنے فرائض بجالا سکتا ہے نہ گھوڑے کا سوار فرائض پورے

---

[1] سورۃ الجاثیہ آیۃ ۱۳

کر سکتا ہے اس لئے کہ غذا کی ضرورت دونوں کو ہے دونوں یعنی بدن اور روح اسی عالم تغیر میں رہائش رکھتے ہیں اور دونوں اپنے اپنے فرائض کی بجاآوری میں غذا کے محتاج ہیں، ورنہ گھوڑا چل سکے گا اور نہ سوار، جو کئی دن سے غذا سے محروم ہو گھوڑے کے لگام کو قابو میں رکھ سکے گا اور ممکن ہے کہ ٹھوکر لگنے سے دونوں کا خاتمہ ہو جائے۔ بدن زمینی ہے اور اس کی غذا بھی زمینی ہے لیکن روح امر ربّی ہونے کی وجہ سے عالم بالا سے تعلق رکھتی ہے لہذا اس کی غذا بھی لطیف اور عالم بالا سے ہونی چاہیئے اور وہ غذا وحیِ ربانی اور کلام الٰہی یا قرآن ہے جس میں غذا ہونے کی دو خصوصیات موجود ہیں۔ میلان طبعی، اور نشو و ارتقاء۔ جیسے غذاء مثلاً روٹی اور گوشت کی غذا ہونے کی یہ دو علامتیں ہیں۔ اوّل طبیعت کا مائل ہونا۔ پتھر اور لوہا غذاء جسمانی اس لئے نہیں کہ اس کی طرف میلان نہیں۔ کوئی نہیں چاہتا کہ وہ پتھر لکڑی کو پیس کر کھائے یا لوہے کا برادہ بنا کر کھائے۔ دوم نشو و نما بھی، جو گوشت روٹی میں موجود ہے وہ پتھر اور لکڑی دونوں میں نہیں۔ اگر کوئی پتھر اور لکڑی پیس کر کھالے تو ترقی بدن نہیں ہوگی بلکہ بدن ہلاک ہوگا۔ یہی دو علامتیں غذاء روحانی ہونے کی قرآن میں موجود ہیں۔ میلان بھی کہ اجنبی زبان اور ضخیم کتاب ہونے کے باوجود لوگ اس کی تلاوت کرتے ہیں اور اس کو حفظ کرتے ہیں اور بقاء حفظ کے لئے موت تک اس کا دور و تکرار کرتے ہیں اور وقت اور محنت کی یہ قربانی قرآنی غذائیت کی رُوحانی کشش کا نتیجہ ہے اس لئے وہ غذاء رُوحانی ہے اگر غذاء جسمانی نہ ہونے سے موت جسم واقع ہوتی ہے تو غذاء روحانی نہ ہونے سے موت روح جو حقیقی موت ہے واقع ہو جاتی ہے اور اسی غذاء قرآنی سے حیاتِ حقیقی کا پیدا ہونا اس آیت میں مذکور ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ	اے ایمان والو! اللہ و رسول کا کہا مانو جبکہ وہ تم کو اس قرآن کی طرف بلاتے ہیں جس میں تمہاری حقیقی زندگی ہے۔
	سورہ انفال رکوع ۳ آیۃ ۲۴
وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ	اعلان کر دو کہ قرآنی غذا سے محروم مردہ لوگ ان لوگوں کے برابر نہیں جنہوں نے قرآن کی غذاء رُوحانی سے حقیقی حیات پائی ہے۔
سورۃ فاطر آیۃ ۲۲	

۴- دلیلِ دوائی

اس عالم تغیر میں بدنِ انسانی اور روحِ انسانی دونوں کو تغیرات پیش آتے رہتے ہیں جن کے اسباب بدن کے لئے یا مخالف آب و ہوا یا فاسد غذا یا کسی غیر موزوں فعل و حرکت کا ارتکاب، یا کوئی اور حادثہ ہوتا ہے۔ اسی طرح روح کے لئے گندہ، فاسقانہ، ملحدانہ، مُشرکانہ ماحول، بُری تعلیم، بُری تربیت، بُرا قانون اور بُرے افعال روحانی امراض کے اسباب ہیں جس کی وجہ سے ڈاکٹر یا حکیم کی طرف علاج کے لئے رجوع کیا جاتا ہے۔ قدرت نے جب انسان کو اس عالم تغیر میں بسایا ہے تو ساتھ ہی اسی عالم کون و فساد میں اس نے اُنکے امراض اور بدنی تغیرات کے علاج کے لئے قدرتی دوائیں بھی رکھی ہیں تاکہ ان کے استعمال سے وہ صحتیاب ہو۔ بدن اور اس کی دوا چونکہ دونوں مادی چیزیں ہیں اس لئے انسان اپنے تجربہ و تحلیل و تجزیہ کے ذریعہ اُن کی خاصیات کو دریافت کر کے بدنی امراض کے ازالہ کے لئے ان کو استعمال کر سکتا ہے اور مسلسل تجربہ کے ذریعہ ایک جسمانی طب کے قوانین کو مرتّب کرنے کی اہلیت رکھتا ہے لیکن روح انسانی اور اس کے صفات اور امراض تجربہ انسانی کے دائرہ سے خارج ہیں۔ اس لئے اس کے متعلق نہ انسان کوئی تجربہ کر سکتا ہے نہ اس کے امراض کی تشخیص کر سکتا ہے اور نہ موثر ادویہ کو متعین کر سکتا ہے۔ روح خود امرِ ربّی اور عالمِ بالا سے متعلق حقیقت ہے۔ لہٰذا اس کی دوا بھی عالمِ بالا سے ہوگی جس سے اس کے امراض کا ازالہ ہوگا۔ زمینی دوا اس پر اثر انداز نہیں ہوسکتی کیونکہ خود روح زمینی نہیں اور روحانی امراض کا علاج بدنی امراض کے علاج سے زیادہ اہم ہے کہ بدنی مرض سے وقتی موت اور روحانی مرض سے دائمی موت و ہلاکت واقع ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ بدن کا معالجہ خالقِ کائنات نے خود انسانی تجربے کے سپرد کر دیا ہے لیکن روحانی علاج کے لئے سلسلۂ انبیاء علیہم السّلام کے ذریعہ انتظام فرمایا۔ وہی انتظام وحی الٰہی اور کلامِ ربّانی ہے جو صحتِ روحانی کا علاجِ مجرّب اور نسخۂ بے خطار ہے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ	ہم نے قرآن اُتارا جسمیں رُوح کا علاج اور اسکی قوت بخشی کا
وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ - بنی اسرائیل آیۃ - ۸۱	سامان موجود ہے جو اللہ کی رحمت ہے یقین کرنے والوں کیلئے۔

اس لئے قرآن کے سوا اس وقت ازالۂ امراضِ روحانی و فیضانِ صحتِ روحانی کے لئے اور کوئی علاج اور نسخہ کائنات میں موجود نہیں کیونکہ مُھَیمِناً عَلَیہِ کے تحت قریباً تمام نسخہ جات انبیاء علیہم السلام سابقین کو شامل اور اس میں ابدی صحتِ روحانی کے ابدی اصول موجود ہیں یہی وجہ ہے کہ یورپ نے علوم کے انبار پڑھ ڈالے اور انہی کے ذریعہ آسمانِ ترقی پر پہونچے لیکن اس شفاءِ روحانی سے محرومی کی وجہ سے شرفِ انسانیت سے محروم ہیں۔ نہ ان میں نیکی ہے نہ خدا ترسی، نہ عدل نہ اطمینانِ قلب نہ امن۔ بلکہ ان کی مریض اور گندہ روحوں کی وجہ سے دنیا روز بروز جہنم کدہ بنتی جا رہی ہے اور فواحش و منکرات اور خونریزی کا وہ سیلاب موجزن ہے جس کے رُک جانے کی اُمید نہیں بلکہ پوری دنیا کی تباہی کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا ہے، کیونکہ بُرائی روز افزوں ہے۔

۵- دلیلِ نُوری

اشیاء کی دو قسمیں ہیں۔ ایک[۱] مبصرات جو آنکھوں سے نظر آتی ہیں جیسے زمین سے آسمان تک کی چیزیں۔ دوم[۲] غیر مبصرات بلکہ معقولات جیسے ایمان، کفر، طاعت، معصیت، اعمال انسانی کا حسن و قبح۔ پہلی قسم کی چیزوں کے لئے قدرت نے دو نُور پیدا کئے ہیں۔ داخلی[۱] نُور اور خارجی[۲] نُور۔

داخلی نُور یعنی آنکھ کی روشنی جو داخل انسان میں ہے۔ اگر کسی کی آنکھ اندھی ہو اور بینائی کے نُورِ داخلی سے محروم ہو تو وہ سانپ اور رسی میں فرق نہیں کر سکتا۔

دوم نُورِ خارجی جو انسان سے باہر ہے مثلاً سورج یا خاص مثلاً بجلی، لالٹین، چراغ وغیرہ جو انسانی بدن سے خارج اور باہر ہے۔ اگر یہ خارجی روشنی نہ ہو تو چاہے داخلی روشنی یعنی آنکھ کی بینائی درست ہو، جب بھی تاریکی میں وہ سانپ اور رسی میں فرق نہیں کر سکتا۔ دونوں نُور خارجی اور داخلی جمع ہوں تب علم و امتیاز حاصل ہوگا۔

اسی طرح دوسری قسم کی چیزوں کے لئے بھی داخلی اور اندرونی روشنی یعنی عقل کی روشنی اور خارجی یعنی آسمانی روشنی کی ضرورت ہے تاکہ وہ ایمان و کُفر، نیک و بد، خیر و شر میں فرق کر سکے۔ وہ خارجی روشنی رُوحانی

امور کے لئے کلام الٰہی ہے جو سورج کی طرح آسمانی نور ہے۔

وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۔ پیروی کرو اُس روشنی کی جو حضورؐ کے ساتھ نازل کی گئی ہے۔ اعراف۔آیۃ ۱۵۶

۶- دلیلِ حُبّی

انسان بدن اور روح کا مجموعہ ہے وہ بدن اور جسم کے لحاظ سے جسمانی محبوبات مثلاً کھانے پینے، پوشاک مکان اور جو ان محبوبات کی تحصیل کا ذریعہ ہو مثلاً مال کا خواہاں ہے یعنی ان سے فطرۃً محبت کرتا ہے۔ اسی طرح اپنی روحانی خواہش کہ فطری تقاضا کے تحت وہ فطرۃً خالقِ کائنات اور خدا سے بھی محبت کرتا ہے، جو اس کا فطری تقاضا ہے، یہی وجہ ہے کہ انسان اپنی پوری تاریخ میں اسی حُبِّ الٰہی کے تقاضا سے خالی نہیں رہا خواہ اُس نے اس فطری تقاضا کا صحیح اظہار کیا ہے جیسے موحدین و مؤمنین نے، یا غلط اظہار کیا ہے جیسے مُشرکین۔ اور بُت پرستوں نے کہ انہوں نے غیر اللہ کو اللہ کا مظہر سمجھ کر اس کی عبادت کی، لیکن ان دونوں صحیح اور غلط طریقوں کی پرستش کا اصلی محرک یہی حبِ الٰہی کا فطری جذبہ رہا یہاں تک کہ رُوس اور چین کے منکرین خدا بھی اسی جذبہ کی وجہ سے مجبور ہوئے، کہ چونکہ اس فطری جذبہ حبِ الٰہی کو مٹایا نہیں جاسکتا۔ اس لئے انہوں نے اس فطری جذبہ کی تسکین کے لئے لینن اور ماؤزے تنگ کی تصویریں اور مجسّمے قدم قدم پر نصب کر دیئے جن کی پرستارانہ تعظیم انہوں نے عملاً جاری کی۔ میں نے "کمیونزم اور اسلام" نامی اپنی کتاب میں کمیونسٹوں کا یہ قول نقل کیا کہ خدا کی جگہ پر لازم ہے کہ ہم ایک مصنوعی خدا لوگوں کے لئے بطور بدل تجویز کر دیں تاکہ اس فطری جذبے کی تسکین کا سامان ہو چنانچہ انہوں نے اشتراکیت کے ممتاز لیڈروں کو یہ مقام دیدیا۔ بہر حال اس سے ثابت ہوا کہ محبتِ الٰہیہ فطری جذبہ ہے اور ہر جذبے کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ اس حُبِّ الٰہی کے لئے مظہر ہونا ضروری ہے اور وہ مظہر خدا کی پسند اور ناپسند کی پیروی کرنا ہے کیونکہ ہر محبوب کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ جو امور اس کو پسند ہوں محبت اس کو بجالائے اور جو ناپسند ہوں اُن سے اجتناب کرے تاکہ جذبہ محبت کی تکمیل ہو لیکن اس امر کا فیصلہ کہ خدا کی پسند اور ناپسند چیزیں کونسی ہیں تاکہ اس کی مرضیات اور لامرضیات کا پتہ لگ سکے یہ اس وقت ممکن ہے

کہ خدا خود اپنے کلام کے ذریعہ اپنی پسند اور ناپسند امور کا تعین کر دے خدا تو بہت بلند ہے ۔ اپنے جیسے انسانوں کی مرضی اور لامرضی اور پسند اور ناپسند کا پتہ ہمیں نہیں لگ سکتا ، تاوقتیکہ وہ اپنے کلام کے ذریعہ سے اس کی وضاحت نہ کر دے یہاں تک کہ میزبان کے پاس اگر مہمان آجائے تو اُس سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ تمُ کس قسم کا کھانا پسند اور کونسا ناپسند کرتے ہو تاکہ اس کے مطابق انتظام کیا جائے ۔جب مہمان قول وکلام کے ذریعہ بتلا دے تب اس کے پسند کھانے کا انتظام کیا جاسکتا ہے ۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ خدا کی محبت کی تکمیل کے لئے وہ ہمیں بتلا دے کہ فلاں عقائد و اخلاق و اعمال و اقوال اس کو پسند ہیں اور فلاں ناپسند ۔جب جاکر اس کی رضامندی کی راہ کھل سکتی ہے اور محبت کا تقاضا پورا ہو سکتا ہے اور یہ بتلانا بغیر کلام الہٰی کے ناممکن ہے اس لئے وحی اور کلام الہٰی کی ضرورت ہے تاکہ اس کی مرضیات اور لامرضیات کا علم حاصل کیا جاسکے اور وہ کلام قرآن ہے جس سے ضرورت قرآن ثابت ہوئی ۔

۷۔ دلیل اتباعی

دنیا میں اتباع اور تابعداری موجود ہے ۔اولاد والدین کی اطاعت کرتی ہے ۔ تلامذہ اور شاگرد اپنے اساتذہ کی اطاعت کرتے ہیں۔ رعیت حکومت کی اطاعت گذار ہے ۔ ماتحت عملہ اپنے افسران کا تابع فرمان ہے ۔ زیر احسان افراد اپنے محسن کے وفا شعار ہیں ۔ یہ صورتیں اور ان صورتوں کے علاوہ تابعداری کی جتنی شکلیں ہیں وہ سب فطری اور معقول ہیں اور اسی اطاعت کی وجہ سے نظامِ تمدن قائم ہے ۔ اگر اولاد اپنے والدین کی اطاعت نہ کرے تو عائلی زندگی تباہ ہو جائے گی ۔شاگرد اُستاد کا کہانہ مانے تو نظامِ تعلیم درہم برہم ہو جائیگا۔ رعیت میں حکومت کے لئے اور ماتحت عملے میں افسران کی اطاعت نہ ہو تو نظامِ مملکت ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح جس پر احسان کیا جائے وہ اگر محسن کا تابع فرمان نہ ہو تو دنیا سے احسان کا وجود ختم ہو جائے گا۔ اب غور طلب امر یہ ہے کہ دنیا عالمِ اسباب ہے لہذا اس دنیا میں ہر چیز کے لئے کوئی نہ کوئی علت اور سبب کا ہونا ضروری ہے ۔ بنابراں ان مذکورہ اطاعتوں کے لئے علتِ اطاعت اور سبب اتباع کا ہونا ضروری ہے ۔ وہ سببِ اطاعت کیا ہے وہ خود ان امور میں غور کرنے سے نمایاں ہے اور وہ صرف دو چیزیں

ہیں۔ ایک احسان دوم اقتدار۔ اولاد پر والدین، شاگرد پر استاد اور زیر احسان افراد پر محسن کا احسان ہے۔ اور احسان ان تینوں صورتوں میں اطاعت کا جذبہ پیدا کرنے کا فطری سبب ہے۔ حکومت کو رعیت پر اور ماتحت عملہ پر اقتدار حاصل ہے جو اطاعت کا سبب ہے۔ ان پانچ صورتوں کے علاوہ دو صورتیں اور بھی ہیں جن میں اطاعت پائی جاتی ہے۔ مثلاً عاشق معشوق کی اطاعت کرتا ہے۔ عوام اہلِ علم مثلاً امام ابوحنیفہؒ امام بخاریؒ اور اہلِ معرفت مثلاً شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ و دیگر بزرگانِ دین کی اطاعت کرتے ہیں۔ ان دونوں صورتوں کا سبب ایک ہی چیز ہے وہ حُسن یعنی خوبی ہے خواہ ظاہری حُسن ہو جیسے معشوق کا حُسن عاشقوں کی نظر میں یا باطنی اور معنوی حُسن، ہو جو علماء دین اور بزرگانِ دین میں موجود ہے۔ لہٰذا اطاعت کی تمام صورتوں کے علل و اسباب صرف تین ہیں۔

۱۔ قدرت ۲۔ احسان ۳۔ حُسن

یعنی تین اسباب میں جہاں کہیں ایک سبب بھی موجود ہوگا اس کا فطری تقاضا یہ ہوگا کہ وہاں اطاعت کی جائے گی۔ اب ہم اسی معیار پر انسان اور خالقِ کائنات کا تعلق پرکھتے ہیں۔ اگر خدا میں اسبابِ اطاعت موجود ہوں تو اس کی اطاعت بھی انسان کے لئے لازمی ہوگی ورنہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ انسان میں جو قدرت ہے یا احسان جس کا معنی بخششِ نعمت ہے یا حُسن وہ سب خالقِ کائنات کا عطیہ اور بخشش ہے کہ وہی ہر قدرت و نعمت و حُسن کا اصلی مرکز ہے۔ اس کی قدرت کے برابر کسی حاکم اور انسانی بادشاہ کی قدرت نہیں نہ اس کے برابر کوئی احسان کر سکتا ہے اور نہ اس کے برابر کسی میں حُسن ہے کہ ہر حسین ظاہری و باطنی کا حُسن اسی ذات کا عطیہ ہے۔ انسانوں میں یہ تین اسباب ضعیف ہیں اور خدا میں قوی تر۔ پھر انسان میں ان تین اسبابِ ضعیفہ میں سے صرف ایک سبب موجود ہے اور خدا میں تینوں کے تین جمع ہیں، اور قوی تر درجے میں۔ تو کیا پھر فطرۃً اس کی اطاعت لازمی اور ضروری نہ ہوگی؟ ——— یقیناً ہوگی۔ لہٰذا خدا کی ہستی عقلاً واجب الاطاعت ٹھہری، اور اطاعت نام ہے حکم ماننے کا۔ لہٰذا اس فطری اتباع اور اطاعت کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسی خدا کے احکام کا مجموعہ بشکل کلام اور وحی انسانوں کو پہونچے تاکہ اتباع و اطاعت کے اس فطری جذبے کی تکمیل کا سامان ہو۔ وہی کلام قرآن ہے جو

ابد تک محفوظ ہے ـــــ لہٰذا قرآن کی نوعِ انسانی کے لئے ضرورت ثابت ہوئی۔

۸- دلیلِ نفسیاتی

انسان اگر اپنے نفس اور رُوح کے آئینہ پر نظر ڈالے تو کلام الٰہی یا قرآن کی ضرورت خود اس کے دل و دماغ اور ضمیر کی خاموش آواز ہے۔ ایک سلیم الفطرت انسان خواہ صحرائے افریقہ میں ہو یا آزاد قبائل کے کوہستان میں، جب وہ کسی برائی کا ارتکاب کرتا ہے۔ خواہ زنا ہو یا قتلِ ناحق تو اس کا دماغ اور ضمیر اس کے جُرم کے ارتکاب سے ضرور متاثر ہوتا ہے اور وہ خود اپنے ضمیر کے اندر اس جرم کے اثر سے ایک قسم کا انفعال تاثر اور تکدر و انقباض محسوس کرتا ہے اگرچہ اس کے اس فعل پر کوئی گرفت کرنے والا موجود نہ ہو اور نہ کوئی حکومت موجود ہو اور نہ کوئی عدالت یا پولیس اور نہ اس جگہ کوئی ضابطۂ قانون نافذ العمل ہو بلکہ وہ علاقہ جس میں یہ جُرم عمل میں آیا ہے، ہر قانون سے آزاد ہو۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی حالت میں اس تاثر، تکدرِ قلب اور انقباضِ دماغ کا سبب کیا ہے؟ ـــــ اگر کہا جائے کہ یہ تاثر اس وجہ سے ہے کہ اُس نے جُرم کیا یعنی قانون کو توڑا ہے تو مفروضہ صورت میں کوئی انسانی قانون موجود نہیں اور نہ سزا کا اندیشہ ہے پھر تاثر کیوں پیدا ہوا؟ ـــــ ظاہر ہے کہ چاہے غیر شعوری طور پر سہی لیکن مذکورہ جرم کے ضمیر نے محسوس کیا کہ اس نے کسی قانون کی خلاف ورزی ضرور کی ہے۔ اگر وہاں انسانی قانون ناپید ہے تو ایک حقیقی اور الٰہی ضابطہ انسانی اعمال کے متعلق ضرور موجود ہے، کہ اس جُرم سے اسی ضابطہ کو توڑا گیا ہے اور وہی حقیقی اور الٰہی قانون جس کی خلاف ورزی نے اس مجرم کے ضمیر میں تاثر پیدا کیا۔ وہ کلامِ الٰہی ہے ـــــ یا بالفاظ دیگر قرآن ہے جس سے قرآن کی ضرورت نفسیاتی تاثر سے ثابت ہوئی۔

۹- دلیلِ تخلیقی

عالَم یعنی ماسوا اللہ صرف دو چیزوں کا نام ہے ـــــ انسان اور خادمِ انسان ـــــ اور ان

دونوں کا نام عالم ہے ۔ عالم چونکہ تخلیقِ الٰہی اور فعلِ خداوندی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس کی تخلیق میں کوئی حکمت ہوگی جب کہ انسان حقیر کوئی فعل بلا منفعت و حکمت نہیں کرتا تو خالق حکیم کیونکر بے فائدہ اور بے مصلحت کام کرے گا۔ مشہور ہے فِعْلُ الْحَکِیْمِ لَا یَخْلُوْ عَنِ الْحِکْمَۃِ ——— اب مخلوقاتِ الٰہیہ میں عقلاً وجودِ حکمت ضروری ٹھہرا، خواہ انسان ہو یا خادمِ انسان ۔ مؤخر الذکر یعنی خادمِ انسان کی حکمت کی دریافت بالکل ظاہر ہے کہ عرش سے لے کر فرش تک کل کائنات خادمِ انسان ہے جن سے انسان کی پرورش ہوتی ہے خواہ انسان اس کو جانے یا نہ جانے ۔ زمین ، معدنیات ، نباتات ، حیوانات ، آگ ، ہوا سمندر سب سے انسان کی منفعت وابستہ ہے ۔ سورج کی گرمی اور روشنی ، ستاروں کی چمک اور کشش سب انسان کی فائدہ رسانی میں مصروف ہیں ۔ قرآن کا ارشاد ہے :-

وَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ	اور مسخر کیا تمہارے واسطے جو کچھ آسمانوں میں ہے
مَا فِی الْاَرْضِ ط سورۃ الجاثیہ آیۃ ۱۲	اور جو کچھ زمین میں ہے ۔

خالقِ کائنات نے زمین و آسمان کو تمہاری خدمت اور نفع رسانی میں لگا دیا ہے اور ایسی زبردست تسخیری اور جبری ڈیوٹی میں ان سب کو جکڑ دیا ہے کہ کسی نگران کی ضرورت نہیں اور نہ ادائے خدمتِ انسان میں سستی اور غفلت کا اندیشہ ہے ۔ لہٰذا ما سوائے انسان جو مخلوقات ہیں ان کی حکمتِ تخلیق واضح ہے کہ انسان کی خدمت گذاری اور اُس کی تربیت ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ان اشیاء میں ایک بھی موجود نہ ہو تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا ۔ جس سے یہ ثابت ہوا کہ انسان کی زندگی کو قائم رکھنا ان تمام چیزوں کی تخلیق کا مقصد ہے ۔ لیکن یہ چھوٹا سا انسان جس کی خدمت گذاری کے لئے قدرت نے اس قدر کائنات کا عظیم الشان کارخانہ پھیلا رکھا ہے ۔ اس کی تخلیق کس حکمت کے لئے ہوئی ہے ؟ کارخانۂ کائنات کا مقصد تو خود انسان ہے لیکن خود انسان کی تخلیق کس مقصد کے لئے ہوئی ۔ وہ مقصد ظاہر ہے کہ کارخانۂ عالم سے متعلق نہیں ، کیونکہ عرش سے فرش تک کی کائنات کو انسان کی تخلیق اور وجود سے کوئی فائدہ نہیں البتہ انسان کو ان سے فائدہ ہے جس کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر یہ کارخانہ نہ ہو تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا بلکہ معدوم ہوگا لیکن اگر انسان نہ ہو اور باقی کارخانہ موجود ہو تو وہ قائم رہ

سکتا ہے اور اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ انسان سب سے اشرف ہے لہٰذا اس کا مقصد بھی اشرف ہوگا جیسے گھوڑا اشرف ہے گدھے سے، تو اس کا مقصد بھی گدھے کے مقصد سے اعلیٰ ہوتا ہے۔ وہ مقصد تخلیق انسانی اس کے بغیر کچھ نہیں کہ جہاں انسان کے لئے ہے اور انسان خالق جہان یعنی خدا کیلئے ہے کہ وہ نائب اور خلیفہ خدا ہونے کی حیثیت سے وہ کام کرے جو اس کے آقا کا منشأ ہے۔ اسی منشاء الٰہی پر خود عامل ہو اور دوسروں کو عامل بنائے۔ اسی کا معنیٰ ہے عبدیت اور بندگی۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ الذریٰت آیۃ ۵۵

جن و انس کی تخلیق خالقِ کائنات کی عبدیت اور بندگی کے لئے ہے۔

اس بندگی اور منشاء الٰہی کی تکمیل میں خدا کا کوئی نفع نہیں بلکہ خود انسان کا فائدہ ہے کہ اس طرح وہ اپنے مقصد تخلیق کی تکمیل کر کے حیاتِ ابدی کی مسرتوں سے بہرہ ور ہو جائے گا۔ اب مقصدِ تخلیق یا منشاء الٰہی معلوم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ خود خدا اپنے منشاء کی وضاحت کر دے اور وہ وضاحت اللہ کے کلام اور وحی الٰہی کے بغیر ناممکن ہے۔ لہٰذا کلام الٰہی کی ضرورت ثابت ہوئی جو قرآن حکیم ہے۔

۱۰ - دلیلِ ترحمی

رحمت و شفقت صفات کمال اور خوبی ہے اور رحمت کا نہ ہونا نقص ہے جس سے اللہ کی ذات پاک ہے اس لئے قرآن میں جگہ جگہ رحمتِ الٰہی کا تذکرہ موجود ہے اور دیگر کتب سماویہ میں بھی اور عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ خالقِ کائنات میں رحمت کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ عالمِ کائنات کا موجودہ نقشہ اس کی رحمت کے مشاہدے کا آئینہ ہے۔ کائنات میں جو کچھ ہے وہ صرف دو چیزیں ہیں۔

۱۔ مرحوم و منعم یعنی جس پر رحمت اور انعام ہوا ہو۔ وہ انسان ہے۔

۲۔ رحمت و نعمت۔ وہ تمام مخلوقات علوی و سفلی کا نام ہے۔ جو خدا کی طرف سے انسان

کے لئے نعمت ہے اور اس کے لئے سامانِ رحمت ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ط اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ۔ — اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو گن نہیں سکتے بے شک انسان بے انصاف اور ناشکر ہے

ابراہیم آیۃ ۳۴

جب اللہ کی رحمت کا یہ حال ہے تو اب قیاس کرو کہ انسانی اعمال میں نہ سب مفید ہیں، نہ مضر بلکہ کچھ مفید اور نفع مند ہیں اور کچھ مضر اور تباہ کن ہیں۔ اس پر اقوامِ عالم کا اتفاق ہے۔ مثلاً عدل اچھا ہے ظلم بُرا، لیکن اعمال لطیف اشیاء ہیں جن کی مضرت اور منفعت کسی لیبارٹری کے ذریعہ تحلیل و تجزیہ کے ذریعہ معلوم نہیں کی جاسکتی۔ خواہ وہ اعمال وعقائد ہوں یا اخلاق وعبادات و معاملات۔ لہٰذا اگر ان امور کے متعلق جن تک انسانی فکر وعقل کی رسائی ناممکن ہے، اگر خداوند تعالےٰ کی طرف سے بھی ہدایت کا سامان موجود نہ ہو اور انسان تباہ کن اور زہر آلود عقائد واعمال میں مبتلا ہو جائے اور خالقِ کائنات صرف تماشائی بن کر رہے تو یہ اُس کی شانِ رحمت کے خلاف ہے۔ اگر ایک انسان کو یہ معلوم ہو کہ اس طعام میں زہر ملا دیا گیا ہے اور دوسرا بے خبر انسان اس کو کھا رہا ہو اور باخبر انسان خاموش رہے اور اُسکو نہ بتلائے تو یہ خاموشی اس خاموش انسان کی بے رحمی کی دلیل ہوگی۔ اسی طرح اگر اندھا کنوئیں یا گڑھے میں پاؤں رکھ رہا ہو اور بینا انسان اس کو اطلاع دینے سے چُپ رہے تو یہ بھی بے رحمی ہوگی۔ جب ایک انسان باخبر کا یہ فرض ہے کہ وہ دوسرے بے خبر انسان کو مضر امر کی مضرت کی اطلاع دے تو احکم الحاکمین اور ارحم الراحمین کے لئے کب یہ شایان شان ہے کہ وہ مضر و مہلک و تباہ کن اور زہریلے اعمال کی اطلاع ان انسانوں کو نہ دے جو ان کی تباہ کاریوں اور مضرت رسانیوں سے بےخبر ہیں اور ان کے پاس مضرت معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے ایسا ہدایت نامہ موجود ہو جس میں نجات دہندہ اور مہلک عقائد و اعمال کی تشریح کی گئی ہو —— یہی ہدایت نامہ کلامِ الٰہی یا قرآن ہے جس کی انسان کو ضرورت ہے۔

صداقۃ و اعجاز القرآن

قرآن کے اعجاز اور معجزہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کلام الٰہی اور ہدایت آسمانی و ربّانی ہے۔اس کے معارف و علوم اللہ تعالیٰ کی ذات کے لامحدود سرچشمۂ علم و عرفان کے ابدی قوانین ہیں اور کسی انسان کے محدود اور ناقص فکر و دماغ کا نتیجہ نہیں اور نہ ہی کسی انسانی افکار و نظریات کی طرح وہم و خیال اور جذبات اور خواہشِ نفسانی سے متاثر اور تبدل پذیر تصورات کا مجموعہ ہیں ۔ وہ فطرت اور حقیقت ہے جو کبھی نہیں بدلتی اور نہ اس میں غلطی کی گنجائش ہے اور نہ اس کے قوانین میں ترمیم و تبدّل کی ضرورت ہے اور نہ اس میں تمام اقوام بشریہ کے حقوق کے متعلق عدل و انصاف کی شاہراہ سے ہٹنے کا احتمال ممکن ہے ، جس کے متعلق بالترتیب قرآن حکیم کا خود اپنا دعوی یہ ہے۔

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ۔ حم السجدہ ۔ آیۃ ۴۲	قرآن کے مطالب میں آگے پیچھے کسی باطل کے گھسنے کی گنجائش نہیں وہ ایسی ذات کی نازل کردہ کتاب ہے جو حکمت و دانائی کا سرچشمہ ہے اور تمام صفاتِ کاملہ سے موصوف ہے۔
لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ ۔ انعام آیۃ ۱۱۴	قرآن میں کسی وقت بھی ترمیم و تبدیل کی گنجائش نہیں۔
وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۔ انعام آیۃ ۱۱۴	قرآن کی ہدایات سچائی اور عدل انسان میں تام اور مکمل ہیں۔

اب صرف یہ بات رہ گئی ، کہ قرآن حکیم جو انسانی صفات کی جامع کتاب ہے کیا یہ واقع میں

اللہ کی کتاب اور اس کا کلام ہے یا کسی انسان کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اگر پہلی صورت ہے، تو یہ معجزہ ہے یعنی ہر غیر الٰہی طاقت کو عاجز کرنے والی کتاب قرار پائے گی اور اس کے کلامِ الٰہی ہونے میں کوئی شُبہ نہیں رہے گا ——— اور اگر دُوسری صورت ہے تو پھر اس کا کلامِ الٰہی ہونا محلِ بحث رہیگا ——— ہم آئندہ یہی ثابت کریں گے کہ قرآن معجزہ ہے اور کُل انسانی قوتیں اسکے بنانے سے بلکہ اسکے معمولی جزو بنانے سے بھی عاجز ہیں۔ اسی وجہ سے یہ کلامِ الٰہی اور معجزہ ہے جو دیگر معجزاتِ انبیاء علیہم السّلام کی طرح وقتی نہیں بلکہ دائمی اور ابدی معجزہ ہے جس کا جواب منکرین قرآن قیامت تک پیش نہیں کر سکتے۔ جس سے یورپی عیسائی مترجم قرآن جارج سیل کے اس قول سے تصدیق ہوتی ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ قرآن ایسی کتاب ہے کہ کسی انسان کا قلم ایسی معجزانہ کتاب نہیں لکھ سکتا۔ یہ معجزہ مُردوں کے زندہ کرنے کے معجزے سے بھی بڑا معجزہ ہے۔ (تاریخ اسلام جلد ا صفحہ ۳۲۷ از عبدالقیوم ندوی)

سب سے پہلے ہم معجزہ کی تشریح کرتے ہیں۔ تاکہ قرآن کا اعجاز اور معجزہ ہونے کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

معجزہ اور اعجاز کی تشریح

دُنیا میں جس قدر امُورات رونما ہوتے ہیں اُن کی کُل تین قسمیں ہیں۔

۱۔ عادیات ۲۔ عجائبات ۳۔ معجزات

عادیات | عادیات سے مراد وہ اُمور ہیں جن کا تعلق ایسے اسبابِ مادیہ سے ہو، جن کو عام اور خاص سب لوگ جانتے ہوں جیسے گندم کاشت کرنے سے گندم کا پودا نکل آنا، گٹھلی کے دبانے سے درخت پیدا ہونا، دوا کے استعمال سے مرض دُور ہونا، روٹی کے کھانے اور پانی پینے سے بھوک اور پیاس کا دُور ہونا، تجارت سے نفع حاصل ہونا، سامانِ جنگ سے دشمن پر فتح پانا، یہ سب امور عادیہ ہیں یعنی عام عادات اور رواج کے مطابق ان مادی اسباب سے مذکورہ نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

عجائبات | عجائبات سے مراد ایسی چیزیں ہیں جو مادی اسباب کے نتیجے میں پیدا ہوں۔ لیکن

مخصوص ماہرینِ فن کے علاوہ عام اشخاص کو ان اسباب اور اُن سے پیدا شدہ نتائج کے متعلق کوئی علم نہ ہو۔ مثلاً جدید مصنوعات سائنس مشین کے ذریعہ ریل گاڑی دوڑانا، ہوائی جہاز اُڑانا، بحری جہاز چلانا، ریڈیو اسٹیشن سے آوازوں اور تقریروں کو پھیلانا، میزائیل، ایٹم بم، ہائیڈروجن بم بنانا، یہ سب عجائبات میں داخل ہیں۔ اسی طرح سحریات بھی کہ یہ سب کچھ مادی اسباب اور مہارتِ فن کے نتائج ہیں۔ لیکن مخصوص افراد کے بغیر عام اشخاص کو ان اسباب اور ان پر مسبّبات مرتّب ہونے کا علم نہیں اس لئے ان کو یہ امور عجیبہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان دونوں قسموں یعنی عادیات اور عجائبات میں ایک خاصیت مشترک ہے۔

مشترک خاصیت | ان دونوں قسموں کی نظیر دوسرے لوگ بنا سکتے ہیں اور بنانے پر قادر ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عادیات کے لئے خاص مہارتِ فن کی ضرورت نہیں۔ کوئی بھی گندم کاشت کرکے گندم کی فصل اسباب عادیہ کے تحت حاصل کر سکتا ہے، لیکن دوسری قسم کی عجائبات مثلاً مصنوعاتِ سائنس کے لئے مہارت فن کی ضرورت ہے اور جو شخص ان مادی اسباب کا ماہر ہوگا وہ ان عجائبات کو بنا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان عجائبات کا پہلا موجد ایک شخص ہوا لیکن اس کے بعد ہزاروں نے مہارت حاصل کرکے اِن عجائبات کو بنایا۔ خود یہ بات ہمارے سامنے ہے کہ امریکہ نے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بنایا بعد ازاں چین نے بنایا۔ اس لئے ان عجائبات میں اختصاص نہیں ہوتا بلکہ مہارتِ فن سے ہر شخص ان عجائبات کی نظیر بنانے پر قدرت رکھتا ہے کیونکہ قانون ہے جو کام ایک انسان کر سکتا ہے، کم و بیش دوسرا انسان بھی ویسی قابلیت پیدا کرکے اُس کو کر سکتا ہے۔ اس لئے عجائبات سائنس معجزات نہیں کہ دوسرا اُس کو نہ کر سکے۔

معجزات | معجزات وہ ہیں جن کا وجود مادی اسباب پر مبنی نہ ہو، خواہ عام اسباب ہوں جیسے امورِ عادیہ یا خاص اسباب ہوں جیسے سائنس کے امورِ عجیبہ ــــ بلکہ ان کا وجود خالقِ کائنات کی مخفی قوّت اور مشیّت کا نتیجہ ہو۔ جس کو نبی کے سوا کوئی دوسرا انسان حاصل نہیں کر سکتا۔ مثلاً یورپ بھی ہوائی جہاز اُڑاتا ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت بھی اُڑتا تھا۔ کام ایک ہے ــــ لیکن

تختِ سلیمانی کا اُڑانا معجزہ تھا اور ہوائی جہاز کا اُڑانا معجزہ نہیں۔ کیونکہ ہوائی جہاز مشین کے ذریعہ اُڑایا جاتا ہے جو ہر انسان ویسی مادی مشین بنا کر جہاز کو اُڑا سکتا ہے لیکن حضرت سلیمان کا تخت مشین سے نہیں، مشیتِ الٰہی کی تسخیرِ ہوا سے اُڑتا تھا جس کی نقل اتارنے پر نہ پہلے کوئی قادر ہوا اور نہ اب اور نہ آئندہ۔ کیونکہ مشیت کی کارسازی اوروں کے لئے ممکن نہیں۔

قرآنی معجزہ

بلاغی دلیل دُنیا میں دو قسم کی مصنوعات ہم دیکھتے ہیں۔ ایک الٰہی مصنوعات مثلاً سورج، چاند وغیرہ۔ ایک انسانی مصنوعات مثلاً موٹر سائیکل وغیرہ۔ پہلی قسم الٰہی مصنوعات ہیں، دوسری قسم انسانی مصنوعات ہیں۔ اب دونوں قسموں کے درمیان فرق اور امتیاز پر جب ہم غور کرتے ہیں کہ ان دونوں میں امتیازی معیار کیا چیز ہے تو کھلی اور بدیہی طور پر ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ جو خدائی مصنوعات ہیں وہ انسانی قوت سے خارج ہیں اور جو انسانی مصنوعات ہیں وہ انسانی قوت کے دائرے کی چیزیں ہیں، جن کو ہر ماہر انسان بنا سکتا ہے اور لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں مختلف ممالک میں بنتے ہیں۔ مگر خدائی مصنوعات مثلاً سورج، چاند نہ کسی سے بن سکتے ہیں نہ کسی انسانی کارخانے میں تیار ہوتے ہیں اور نہ کسی بازار میں بکتے ہیں۔ یہی حال بعینہٖ کتابوں کا بھی ہے۔ کچھ کتابیں اس دنیا میں انسانوں کی بنی ہوئی ہیں اور قرآن کے متعلق یہ دعویٰ ہے کہ یہ کتاب خالقِ کائنات کے علم و قدرت کا نتیجہ ہے نہ کسی انسانی علم و قدرت کا۔ اس کا فیصلہ بھی اسی معیارِ امتیازی پر ہوگا کہ اگر اس کتاب کا کل یا معمولی جزء انسانی قدرت سے بن سکتا ہے تب تو یہ انسانی کتاب ہوگی اور معجزہ نہیں ہوگا اور اگر انسانوں کی مجموعی قوت اس کی چھوٹی سورۃ یعنی سورۃ کوثر جو ایک سطر سے زیادہ نہیں بنا سکتی۔ تو اس کے معجزہ اور اللہ کی طرف منسوب ہونے اور کلام اللہ ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ سکتا۔ قرآنِ حکیم نے اسی معیار کی بنیاد پر اپنے اعجاز اور کلامِ الٰہی ہونے کی متعلق عرب کے فصحاء و بلغاء کو چیلنج دیا اور فرمایا:-

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى	اگر تم کو اس قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں شبہ ہے
عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ	تو تم سب مل کر اور اپنے کل مددگاروں کو بلا کر اس
وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ	کی چھوٹی سی سورت جتنی بنا لاؤ۔ اگر تم اپنے دعویٰ
اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ البقرہ ۲۲	میں سچے ہو۔

اور ساتھ فرمایا:۔

وَلَنْ تَفْعَلُوْا البقرہ ۲۳ یعنی تم ہرگز ایسا نہیں کر سکتے۔

دوسری آیت میں اس سے بھی زوردار الفاظ میں فرمایا۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ	اگر سارے انسان اور جن جمع ہو جائیں کہ قرآن
عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ	کا توڑ بنائیں اور نظیر اسکی لائیں تو نہیں لا سکتے
لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ	چاہے سب مل کر ایک دوسرے کی مدد کریں
لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا۔ بنی اسرائیل ۸	

اس آیت میں اس قوم کو خطاب کیا گیا جس کو اپنی ادبی قابلیت اور فصاحت و بلاغت پر ناز تھا اور جو قرآن کے دشمن تھے۔ قرآن کے دعویٰ کو توڑنا اُن کے لئے ہر چیز سے زیادہ اہم اور ضروری تھا اور یہ اعلان حضور علیہ السلام کی زبان سے کر دیا گیا کہ ساری عمر میں آپ نے نہ کوئی تعلیم پائی تھی نہ کسی وقت اُن کی شعر و شاعری کا کوئی چرچا ہوا اور نہ ہی انہوں نے ادبی تعلیم پائی اور نہ ہی شعر و شاعری یا فصاحت و بلاغت کی کوئی مشق ان کو حاصل تھی اور نہ ہی چالیس سال کی طویل زندگانی میں ماہرین زبان کی مجالس میں ان کی کوئی خاص شہرت تھی بلکہ وہ اُمّی اور ناخواندہ تھے۔ اس چیلنج اور اعلان نے مخالفین اسلام و قرآن کی ادبی غیرت اور مخالفانہ جوش کو یقیناً اس زور سے بھڑکایا کہ اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ نہایت آسانی اور بے ضرر طریقے سے قرآن اور صاحب قرآن کو، قرآن جیسی صرف ایک سطر عبارت بنا کر شکست دے سکتے تھے اور یہ شکست بھی نمایاں ہوتی اور ان کا مقصد سو فیصدی حاصل ہو جاتا کیونکہ خود قرآن کا دعویٰ تھا کہ اگر ایسا کر سکے تو پھر قرآن کلام الٰہی نہ ہوگا اور صاحب قرآن خدا کے رسول

بھی نہ ہوں گے۔ لیکن انہوں نے اپنے ادبی ذوق اور فطرتِ سلیمہ کی بنیاد پر قرآن کی نظیر لانے کو ناممکن سمجھا۔ اس لئے فتح اور کامیابی کا یہ آسان راستہ انہوں نے چھوڑ کر دوسرا دشوار گذار راستہ اختیار کیا۔ یعنی قرآن کے مقابلے میں انہوں نے جنگ وجدل کا ایسا طولانی سلسلہ قائم کیا جن کے لئے اُن کو بے انداز مالی وجانی قربانی دینی پڑی اور بعضوں کو ملک اور وطن ترک کرنا پڑا۔ اگرچہ اس راہ میں بھی اُن کو کامیابی نصیب نہ ہوئی لیکن زبان وقلم کی معمولی جنبش کے آسان ترین راستہ کو چھوڑ کر، تلوار اور خونریزی کا راستہ اختیار کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ اُن کے پاس قرآن کے چیلنج کا جواب نہ تھا اور یہ وہ لوگ تھے۔ کہ اس وقت سے لے کر اب تک اور آئندہ ختمِ دنیا تک ان کے زورِ بیاں، فصاحت و بلاغت کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ یہ قرآن کے اعجاز کی بلاغی دلیل ہے۔ یہ دلیل نہایت عام فہم اور صاف ہے تاہم مستشرقین یورپ وغیرہ نے اپنے خاص سازشی پروگرام کے تحت ان بڑی بڑی تنخواہوں کا حق ادا کرنے کے لئے جو اُن کو اسلام دشمنی کے صلہ میں مل رہی ہیں، یہاں بھی حسبِ عادت چند بے سروپا شبہات پیش کئے ہیں، جن کو ہم نمبروار نقل کر کے اس کا جواب دیتے ہیں۔

پہلا شُبہ | پہلا شبہ اہلِ استشراق نے یہ پیش کیا ہے کہ قرآن سازی سے فصحاءِ عرب کا عاجز ہونا کیونکر یقین کیا جا سکتا ہے، ممکن ہے کہ وہ قرآن کے توڑ بنانے پر قادر ہوں لیکن انہوں نے اس کی ضرورت نہ سمجھی ہو جیسے ایک انسان نیویارک جانے پر قادر ہوتا ہے لیکن حاجتِ سفر نہ ہونے کی وجہ سے نہیں جاتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک نیویارک کے سفر کے لئے صرف قدرت کافی نہیں بلکہ باعثِ سفر کا موجود ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ قرآن کی نظیر لانے پر اگر بلغاءِ عرب کو قدرت ہوتی تو اظہارِ قدرت کے لئے اس سے بڑھ کر موقعہ کونسا ہو سکتا تھا، جب کہ ان بلغاء اور قرآن کے ماننے والوں میں مقابلہ جاری تھا۔ قرآن کو شکست دینے سے ــــــ جو اُن کے آبائی دین کا ابطال کرتا تھا ــــــ اُن کا آبائی دین بھی محفوظ ہو جاتا اور اس مذہبی مقابلہ میں وہ اپنے حریف گروہ، صاحبِ قرآن اور مسلمانوں اور خود قرآن کو نظیرِ قرآن پیش کر کے شکست بھی دے سکتے تھے۔ قرآن کے مقابلہ پر اپنی کامیابی اُن کو اس قدر عزیز اور اہم تھی جس کے لئے انہوں نے بے انتہا مالی وجانی قربانیاں پیش کیں، جس پر جنگِ بدر

اُحد، خندق، حنین کے واقعات اور قرآن کے ماننے والوں پر مکہ معظمہ میں ان کے ظالمانہ کارنامے گواہ ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ قرآن کو جو اُن کے آبائی دین کی تردید کرتا تھا شکست دینے سے ہمارے دین کی بھی فتح ہوگی اور ہماری فصاحت و بلاغت کی یکتائی بھی برقرار رہے گی۔ مسلمان جو اس مذہبی جنگ کا ایک فریق تھے وہ بھی ذلیل ہو کر ناکام ہو جائیں گے ——— کیا اس سے بڑھ کر فصحاء عرب کے لئے بڑا باعث اور محرک کوئی ہو سکتا تھا جس کے متعلق یہ شبہ کیا جا سکے کہ وہ نظیرِ قرآن بنا سکتے تھے لیکن چاہا نہیں۔ ایسی شدید ضرورت کے باوجود نہ چاہنا ایسا ہے جیسا یہ کہنا ہے کہ ایک پیاسا کسی بیابان میں پیاس سے مر گیا ہو اور اس کے متعلق یہ احتمال پیش کیا جائے کہ وہ پانی پینے پر قدرت رکھتا تھا لیکن پانی اس لئے نہیں پیا کہ اس کے لئے پانی پینے کا کوئی باعث موجود نہیں تھا اس لئے اس نے پانی پینا نہیں چاہا۔ یہی حقیقت اہلِ استشراق کے اس شبہ کی بھی ہے کہ فصحاء عرب قرآن کا توڑ بنا سکتے تھے لیکن انہوں نے بنانا نہیں چاہا ——— اس کے علاوہ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کو آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند نے مناظرہ کا چیلنج دیا اور پہلے وہ حضرت مولانا سے مناظرہ کر کے اُن کے علمی مقام کا اندازہ کر چکا تھا ——— اس دوسرے چیلنج کے جواب کے لئے جب حضرت مولانا پہونچے تو دیانند نے مناظرہ کرنے سے انکار کر دیا اور عذر یہ پیش کیا کہ میں نے اس وقت مناظرے کا ارادہ نہیں کیا۔ جس پر مولانا نے فرمایا کہ ارادہ تو اپنے اختیار میں ہے اگر پہلے ارادہ نہیں کیا تو اب کر لو، جس پر وہ خاموش ہوا۔ یہی حال مذکورہ شبہ کا ہے کہ نظیرِ قرآن پیش کر سکتے تھے لیکن چاہا نہیں اور ارادہ نہیں کیا ——— ہم کہتے ہیں کہ عراق، مصر شام، لبنان، بیروت میں اس وقت کافی عیسائی موجود ہیں جن کی مادری زبان عربی ہے اور عربی زبان میں انہوں نے بیسیوں کتابیں لکھی ہیں اور کئی جلدوں میں عربی کی ڈکشنریاں شائع کی ہیں اور عربی زبان کے بہترین شاعر ہیں، تم ان سے کہہ دو کہ عیسائی حکومتیں اور عیسائی قومیں کروڑوں روپے قرآن اور اسلام کے خلاف ہر سال خرچ کر رہی ہیں وہ اس وقت کوئی قرآن کی نظیر بنا کر پیش کر دیں ——— لیکن عیسائی قومیں ممکن ہے کہ چاند تک پہنچ سکیں، لیکن اگر ان کے لئے ناممکن ہے تو صرف یہ کہ وہ قرآن کا توڑ بنا سکیں۔

دُوسرا شُبہ اہلِ استشراق نے دُوسرا شبہ یہ پیش کیا ہے کہ ہر چیز کے بنانے کیلئے ضروری ساز و سامان ہونا ضروری ہے۔ ممکن ہے کہ فصحاء عرب کے پاس وہ اسباب موجود نہ ہوں جو قرآن کے لئے ضروری ہیں۔ یہ شُبہ بھی بے بنیاد ہے اس لئے کہ ایک چیز کے بنا دینے کے لئے ضروری اسباب صرف چار ہیں۔

۱۔ **قدرت یا مہارت** ۲۔ **مادہ** :۔ یعنی جس سے وہ چیز بنے۔
۳۔ **باعث و محرک** : یعنی ایسا مقصد جو اس کے بنانے پر آمادہ کرے۔
۴۔ **نمونہ** : اس چیز کے نمونے کا سامنے موجود ہونا جس کے طرز پر کسی چیز کا بنانا مقصود ہو۔

مثلاً میز بنانے کے لئے پہلی چیز قدرت و مہارت ہے کہ آدمی نجاری اور بڑھئی کا کام جانتا ہو۔ عام آدمی میز اس لئے نہیں بنا سکتا کہ اس کو میز سازی کی مشق و مہارت نہیں۔

دوسری چیز میز کا مادہ ہے یعنی لکڑی جس سے میز بنائی جاتی ہے اگر لکڑی وغیرہ نہ ہو تو وہ ہوا سے میز نہیں بنا سکتا کیونکہ وہ میز کا مادہ نہیں۔

تیسری چیز باعث ہے کہ میز بنانے سے اس کا کوئی مقصد پورا ہوتا ہو۔ مثلاً میز کی قیمت حاصل کرنا یا اپنے گھر کی ضرورت کو پورا کرنا تاکہ یہ باعث و محرک اس کو میز سازی کے عمل پر آمادہ کرے۔

چوتھی چیز نمونہ ہے کہ اس کے سامنے میز کا کوئی نمونہ بھی موجود ہو تاکہ اس طرح کا میز بنا سکے۔

اب دیکھنا چاہیئے کہ قرآن حکیم کے نزول کے وقت فصحاء عرب کے پاس یہ چار اسباب موجود تھے یا نہیں ——— تو یہ ظاہر ہے کہ یہ تمام اسباب چاروں کے چار ان کے پاس موجود تھے۔

اوّل قدرت و مہارت ——— تو کلام سازی میں نظم ہو یا نثر وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اور یہی مشق کلام سازی ان کا عام مشغلہ تھا۔ دوم قرآن کی عبارت جن حروف سے بنی ہے وہ حروفِ ہجائیہ اٹھائیس ہیں جو الف، باء سے شروع ہو کر یاء پر ختم ہوتے ہیں۔ وہی قرآن کی عبارت کا مادہ اور مصالحہ تھا جو اُن کے پاس موجود تھا۔ جن سے وہ روز مرہ اپنا کلام بنایا کرتے تھے۔ سوم باعث و محرک قرآن بھی اُن کے پاس موجود تھا۔ وہ یہ کہ قرآن کے مٹانے کے لئے وہ سر دھڑ کی بازی لگا رہے تھے تاکہ اُن کا

پُرانا دین محفوظ ہو جاتے اور اس کے خلاف دین قرآن کو شکست دیدیے۔ چہارم نمونہ بھی موجود تھا پیغمبر اسلام علیہ السّلام نے اُن کو قرآن بار بار سُنایا اور قرآن کے چیلنج کا مطلب یہ تھا کہ اسی نمونہ پر جو تمہارے سامنے ہے، چند جملے تیار کر کے لے آؤ۔ جیسے مِن مِّثلِہ سے معلوم ہوتا ہے۔ پھر ان چار اسباب کے علاوہ اور کونسی چیز کی ضرورت تھی جو فصحاء عرب کے پاس نہ تھی، اس لئے وہ قرآن کی نظیر پیش کرنے سے عاجز آگئے۔ اس لئے اِس شبہ کی کوئی بنیاد نہیں۔

تیسرا شُبہ یہ شبہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ ممکن ہے کہ فصحاء عرب نے قرآن کا کوئی توڑ بنایا ہو، اور ہم تک نہ پہنچا ہو۔ یہ بھی محض طفل تسلّی ہے کیونکہ اس وقت معدود چند افراد کے بغیر پوری دنیا قرآن کے خلاف تھی اور اب بھی قرآن کے مخالفین کی تعداد، قرآن پر ایمان لانے والوں سے زیادہ ہے۔ تو جب مؤمنین کی تھوڑی جماعت نے قرآن کریم کو آنے والے مؤمنین تک پہنچایا —— تو سوال یہ ہے کہ اگر اس وقت مخالفین کی طرف سے یا کسی بھی وقت میں کوئی توڑ بنا دیا گیا ہوتا جو مخالفین کے مقصد کی چیز تھی تو کثیر التعداد مخالفین نے اس توڑ کو کیوں آنے والے مخالفین تک نہیں پہنچایا۔ نہ پہنچایا جانا اس امر کی دلیل ہے کہ توڑ کسی سے بن ہی نہ سکا تھا۔

چوتھا شُبہ اس شبہ کو اِس طرح پیش کیا گیا ہے کہ جس طرح دورِ حاضر میں سائنس کا ایک ماہر نئی چیز ایجاد کرتا ہے اور دوسرے نہیں بنا سکتے تو یہ اس امر کی دلیل نہیں کہ اس چیز کا نہ بنایا جانا معجزہ ہونے کی دلیل ہے اسی طرح قرآن کو سمجھو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مصنوعاتِ جدیدہ کسبی چیزیں ہیں۔ اِس لئے جب ایک موجد بنا لیتا ہے تو دوسرے بھی اس کو بنانا شروع کرتے ہیں لیکن قرآن ایسا نہیں۔ ورنہ اب تک کسی سے کیوں نہ بن سکا۔

پانچواں شُبہ اس شبہ کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کا اظہار سحر کے مماثل ہے۔ سحر بھی ساحر کے سوا دوسرا نہیں کر سکتا لیکن وہ خالقِ کائنات کا فعل یا معجزہ نہیں کہلاتا۔ اس شبہ کا جواب ظاہر ہے کہ سحر اور معجزہ میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ سحر کسبی ہے اور اسباب پر مبنی ہے۔ اگرچہ وہ اسبابِ مادی پوشیدہ ہیں لیکن جب دوسرا شخص ان اسباب کو بروئے کار لاتا ہے تو وہ بھی ساحرانہ اعمال پیش کر سکتا ہے اور

ایک ہی زمانہ میں متعدد ماہرینِ سحر کاروائیاں کرتے ہیں۔ ساحرین عہد موسیٰ علیہ السلام کی کثرت اس کی دلیل ہے۔ اس لئے جب ان ساحروں نے محسوس کیا کہ عصارِ موسیٰ معجزہ ہے کہ مادی اسباب پر مبنی نہیں اور ہماری ساحری کسبی، فنّی اور اسبابی چیز ہے تو انہوں نے معجزہ کی شناخت کر کے فوراً ایمان لایا۔

چھٹا شبہ اہلِ استشراق کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ بلاغت میں یکتا تھے اس لئے دوسرے لوگ ان کی ہمسری نہ کر سکے ورنہ قرآن کلامِ محمدؐ ہے۔ یہ شبہ بوجوہاتِ ذیل غلط اور خلافِ واقعہ ہے۔

پہلے یہ کہ عرب نے جو قرآن کے بدترین دشمن تھے یہ شبہ کیوں پیش نہیں کیا۔ کیا اُن کے سامنے کے واقعات سے اُن کی نسبت اہلِ استشراق زیادہ باخبر ہیں؛ بلکہ گذشتہ کل شبہات جو اہلِ استشراق نے پیش کئے ان کی تردید کے لئے یہ امر کافی ہے کہ اگر ان شبہات کی گنجائش ہوتی تو خود عرب بلغاء جو قرآن کے دشمن تھے ان شبہات کو ضرور پیش کرتے۔ لیکن اُنہوں نے ایسا نہیں کیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہ تمام شبہات من گھڑت ہیں۔

دُوسری وجہ یہ ہے کہ اگر قرآن کلامِ رسول علیہ السلام ہوتا تو رسول کا کلام احادیث کی شکل میں اب بھی موجود ہے۔ اور ان میں اور قرآن میں نمایاں فرق ہے۔ جو اعجازی رنگ قرآن کی عبارت میں ہے وہ کلامِ رسول اور احادیث میں قطعاً موجود نہیں۔ اہلِ استشراق نے یہ عذر پیش کیا ہے کہ پیغمبر اسلام کا کلام دو قسم کا ہوتا تھا۔ ایک بلا تیاری اور فوری، وہ معمولی تھا اور ایک پوری تیاری کے بعد تھا۔ وہ یکتا اور بے مثل ہوتا تھا۔ یہ عذر اس لئے غلط ہے کہ نزولِ قرآن میں بعض اوقات ایسا ہوا کہ مجلس میں ایک سائل نے سوال کیا اور قرآن فوراً اس کے جواب میں نازل ہوا اور حضورؐ نے سائل کو سنایا۔ جس میں تیاری کا سرے سے موقعہ ہی موجود نہ تھا۔ جیسے وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ[1]۔ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ[2]۔ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ[3] وغیرہ بیسیوں واقعات سوالات کے جوابات میں فوراً آیات سنائی گئیں اور تیاری کے لئے وقت نہیں مل سکا۔

---

۱ و ۳۔ سورہ البقرۃ آیۃ ۲۱۸۔ ۲۔ سورہ البقرۃ آیۃ ۲۲۱۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اگر قرآن حضور علیہ السلام کا کلام ہوتا تو پھر یہ کسبی اور ذہنی اور مشقی کاروائی کا نتیجہ ہوتا۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ مشہور مشّاق اور ممتاز بلغاء ایسے کلام کی دو تین آیتیں بھی نہ بنا سکے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن خدائی کلام تھا، جو خدا کے سوا سب انسانوں کی قدرت سے خارج تھا اور اسی کا نام معجزہ ہے۔

ساتواں شبہ | مادہ پرست مستشرقین قرآن کے معجزہ ہونے سے منکر ہو کر یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ معجزہ ماننا نظامِ عالم کی مصلحت کے خلاف ہے۔ اور علّت و معلول کے عام ضابطے کا توڑ ہے۔ کیونکہ معجزہ کا معنی یہ ہے کہ ایک چیز کی علّت موجود ہو جیسے آگ جلا دینے کی علّت ہے اور معلول اُس پر مرتب نہ ہو سکے۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کے اثر کا نہ ہونا معجزہ مانا جاتا ہے یا کسی چیز کی علّت موجود نہ ہو اور وہ چیز وجود میں آجائے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سمندر پر لاٹھی مارنا سمندر میں سے بارہ سڑکیں پیدا ہونا کی علّت نہیں تھا لیکن معلول یعنی بارہ راستوں کا سمندر میں پیدا ہونا متحقق ہوا۔ اسی طرح معجزہ شق القمر یا مٹھی بھر کنکریوں سے کفّار کی فوج کی شکست یا تھوڑے پانی سے بڑی جماعت کا سیراب ہونا یا تھوڑے طعام سے بڑی جماعت کا سیر ہو جانا۔ یہ سب واقعات ایسے ہیں جن میں معلول کو بلا علّت تسلیم کیا گیا ہے اور قانونِ تعلیل کے ضابطے کا توڑ ہے اور اس دعویٰ کی تائید میں قرآن کی آیت وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبْدِيْلًا سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ اس آیت میں سُنّۃ اللہ کی تبدیلی کی نفی کی گئی اور قانونِ تعلیل سُنّۃ اللہ ہے تو وہ معجزہ سے تبدیل نہیں ہو سکے گی۔

اس شبہ کا ایک جواب تو یہ ہے کہ مستشرقین عیسائی ہیں اور انجیلوں میں اور اسیطرح تورات میں بھی معجزات مذکور ہیں لہٰذا معجزات کا وجود ہر آسمانی کتاب بلکہ ہر مذہب میں ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے لہٰذا اسلامی معجزات سے انکار خالص تعصب ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ معجزاتِ انبیاء علیہ السلام ذریعہ ہدایت ہیں اور ہدایتِ انسانی سے بڑھ کر اور کیا مصلحت ہو سکتی ہے۔ لہٰذا معجزات کو خلافِ مصلحت کہہ دینا غلط ہے۔ آیت میں جس سُنّۃ اللہ کے متعلق تبدیل نہ ہونے کا اعلان کیا گیا وہ آیت کے سیاق و سباق کے پیشِ نظر معجزات سے متعلق نہیں

بلکہ اہلِ ایمان کے ثواب اور اہلِ کفر کے عذاب کے متعلق ہے جس میں تبدیلی نہیں ہوگی۔ اور بالفرض اگر معجزات پر بھی اس کو حاوی سمجھا جائے تو آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی سنّت کو غیر اللہ تبدیل نہیں کر سکتا نہ یہ کہ خود اللہ بھی تبدیل نہیں کر سکتا۔ جس ذات کی جو سنّت و عادت ہو اس کو وہ ذات تبدیل بھی کر سکتی ہے۔ بالفرض اگر کسی بادشاہ کی یہ سنّت و عادت ہو کہ وہ وزیر اعظم کے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا تو کیا اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اس عادت و سُنّت کے برخلاف بلا مشورہ وزیر اعظم کوئی کام نہیں کر سکے گا۔ خود فلاسفہ یورپ کے اقوال سے بھی معجزاتِ اسلام کی صحت کی تائید معلوم ہوتی ہے۔ کارنٹر لکھتا ہے "خالقِ فطرت اگر چاہے تو کبھی کبھی قانون فطرت کے خلاف کام کر سکتا ہے"[1] پروفیسر ڈالیر "مادہ ایتھر حرکت" میں لکھتا ہے کہ بغیر علل و اسباب ظاہری کے کام ہو سکتا ہے اور معجزہ غیر اغلب نہیں۔ ڈاکٹر واٹ "سسٹم آف لاجک" میں لکھتے ہیں کہ صحرا کے ہزار کمروں میں اگر ۲۵ کی چابیاں مِل جائیں تو یہ ضروری نہیں کہ ۹۷۵ کی چابیاں بھی ویسی ہی ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ علل و اسباب چابیاں ہیں جو عقلِ انسانی نے دریافت کی ہیں اور جو اسباب دریافت نہیں ہوتے وہ بہت زیادہ ہیں۔ لہٰذا ہر واقعہ کے حل کو ان دریافت شدہ علل کی چابی سے کھولنا درست نہیں۔ پروفیسر ہکسلے لکھتے ہیں کہ ہم فطرت کی حد بندی نہیں کر سکتے[2]۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم فطرت پر یہ پابندی نہیں لگا سکتے کہ جس قانون کے تحت اس نے کام کیا اسکے بغیر نہیں کر سکتی۔ انگلستان کے ولیم جیونس لکھتے ہیں۔ کارخانۂ فطرت میں خداوندی مداخلت کو ہم باطل نہیں ٹھیرا سکتے[3]۔ کائنات کا خالق حذف و اضافہ بھی کر سکتا ہے۔ یہی رائے بہت سے فلاسفہ مغرب کی ہے، اور میرے نزدیک یہی رائے صحیح ہو سکتی ہے کیونکہ قانونِ تعلیل کی بنیاد استقراء ناقص پر ہے جس سے قطعی علم حاصل نہیں ہو سکتا اور سب اربابِ سائنس کا مسلّم قانون ہے کہ تجربہ اور استقراء جب کہ محیط نہ ہو اس سے یقینی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ہمارے تجربہ میں جس قدر آگ آئی ہیں وہ جلاتی ہیں لیکن کیا ہم نے تمام آگوں کا تجربہ کیا اور اُس آگ کا بھی کیا جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام ڈالے گئے تھے؟ اگر نہیں تو یہ استقراء ناتمام ہوا۔ جس سے آتشِ ابراہیمی کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ ہر علت جس معلول

ع۱ سیرۃ النبی از شبلی صفحہ   ع۲ ممکنات و ناممکنات از ہکسلے صفحہ ۱۹۷   ع۳ اصول سائنس صفحہ ۲۲۷

کو پیدا کرتی ہے وہ اس قوت کے ذریعہ سے پیدا کرتی ہے جو علت کے اندر موجود ہو اور وہ قوت خالق کائنات کی بخشش اور عطیہ ہے۔ جو ذات کوئی چیز دے سکتی ہے وہ چھین بھی سکتی ہے۔ جب چھین لے تو علت کی تاثیر ختم ہوئی۔ اس لئے اس برائے نام علت پر معلول مرتب نہیں ہوا۔ کیونکہ قدرت کے سلب تاثیر نے اس کی علیت ختم کردی۔ اسی طرح اگر کوئی معلول بغیر علت کے وجود میں آیا۔ مثلاً عصائے موسیٰ علیہ السلام سے سمندر کا پھٹ جانا۔ تو یہ ہو سکتا ہے کہ لاٹھی انفلاقِ بحر کی علت نہیں لیکن یہ اس وقت کہ اس میں خالقِ فطرت نے تعلیلی قوت نہ ڈالی تھی لیکن اگر ڈال دے تو پھر معلول بلا علت نہیں بنکر علت کے تحت وجود میں آیا کیونکہ انفلاقِ بحر کے وقت میں اس عصار کے اندر انفلاقی قوت ڈال دی گئی تھی۔ یہ سب کچھ ہم نے فلسفہ کے تحت لکھا۔ ورنہ اصل جواب تو یہ ہے کہ ہر چیز چاہے علت ہو یا کوئی اور چیز اس کا وجود اور اس کی قوتِ تاثیر ارادۂ الٰہی کا معلول ہے۔ ارادۂ الٰہی بدل جانے سے اشیاء میں تبدیلی ہوتی ہے اور معجزاتِ الٰہیہ جو خدائی افعال ہیں، اُن کا صدور صرف ارادۂ الٰہی کے تعلق سے ہوتا ہے اور یہی انسان اور خدا میں فرق ہے کہ انسان کا صرف ارادہ عمل نہیں کرتا جب تک اس ارادے کے ساتھ اسباب کی شرکت نہ ہو۔ مثلاً اگر آدمی سیر ہونے یا سیراب ہونے کا ارادہ کرے تو سیر ہونا وسیرابی محض اس آدمی کے ارادے سے پیدا نہ ہوں گے، جب تک روٹی کھانا اور پانی پینا —— جو سیری اور سیرابی کے اسباب ہیں —— ارادہ کے ساتھ شامل نہ ہوں۔ لیکن خالقِ فطرت کے لئے اسباب کی ضرورت کبھی نہیں۔ اس کا صرف ارادہ مراد کو وجود میں لانے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ[1]۔ میں اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ کیا آسمان وزمین کے بنانے میں صرف ارادۂ الٰہی نے کام نہیں کیا اور مزدوروں کی ضرورت پیش آئی؟ ہرگز نہیں۔ یہی معاملہ معجزات کا ہے کہ وہ عادی اسباب کے بغیر ارادۂ الٰہی سے وجود میں آتے ہیں۔

آٹھواں شبہ | اہلِ استشراق کہتے ہیں کہ اگر قرآن معجزہ ہو تو یہ وحی الٰہی ہوگا، اور وحی الٰہی اور اس کے ذریعہ علوم کا القاء غیر معقول ہے۔ اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ خود بائیبل میں

---

[1] سورۃ یٰسٓ رکوع ۵ آیۃ ۸۱

انبیاء علیہم السّلام کی وحی کا ذکر موجود ہے تو وحی اور نبوّت یہود و نصاریٰ کی تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ لہٰذا وحیٔ نبوی سے انکار محض ضد اور عناد ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کسی پیغمبر کے قلب پر الفاظ و معانی کا القاء بالکل معقول ہے۔ اور اس کے ذہن نشین کرانے کے لئے مسمریزم کے اعمال سے تائید ہوتی ہے جو ایک روحانی عمل ہے صاحبِ مناہل العرفان نے علوم القرآن میں لکھا ہے[1] کہ عیسائی مبلغین جن کو مبشرین کہتے ہیں، مصر میں آئے اور ایک نوجوان پر تنویم مقناطیسی کا عمل کیا۔ پہلے پوچھا تمہارا نام کیا ہے، اُس نے اصلی نام بتایا۔ عامل نے اس نوجوان معمول پر توجہ ڈال کر کہا کہ تمہارا یہ نام نہیں بلکہ دوسرا نام ہے۔ اس طرح اُس نے اپنے عمل سے اس کے ذہن سے اصلی نام مٹا کر مصنوعی اور فرضی نام ذہن نشین کرایا اور دیگر باتیں اس عمل کے ذریعہ اس کے ذہن میں ڈال دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہی مخفی طریقے سے ڈالے ہوئے الفاظ اور علوم اسی نوجوان کے ذہن میں راسخ ہوئے اور عمل کا اثر ختم ہونے پر بھی ویسے رہے۔ یہ واقعہ بہت لوگوں کے سامنے مصر میں ہوا۔ جس سے معلوم ہوا کہ انسان مخفی طریقے سے دوسرے انسان کے ذہن میں الفاظ منتقل کر سکتا ہے، تو کیا خدا کسی منتخب رسول کے ذہن میں الفاظِ وحی و قرآن منتقل نہیں کر سکتا؟

تیسرا جواب یہ ہے کہ ٹیپ ریکارڈر نے حقیقتِ وحی کو ذہن سے قریب تر کر دیا کہ ایک انسان کے الفاظ کو بے جان ٹیپ ریکارڈ میں منتقل کیا جا سکتا ہے اور وہی الفاظ محفوظ رہتے ہیں تو کیا خدا انسان سے بھی عاجز ہے کہ وحی کے الفاظ بے جان آلہ میں نہیں، بلکہ ایک منتخب نبی کے لوحِ ذہن میں منتقل کر کے محفوظ کر دے۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰىٓ ۙ — ہم آپ کے ذہن میں الفاظِ وحی ڈالیں گے جس کو تُو نہیں بھولے گا۔

سورۂ اعلیٰ آیۃ ۔ ۵

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۚ — ہمارے ذمہ ہے تیرے ذہن میں وحی کے الفاظ کو جمع کرنا، پھر تم سے پڑھوانا ہے۔

سورۂ قیامۃ آیۃ ۔ ۱۶

---

[1] مناہل العرفان صفحہ ۶۰

نواں شبہ | اہلِ استشراق کہتے ہیں کہ قرآن کے مضامین غیر مرتب ہیں۔ جو اعجاز کے خلاف ہے۔

اس کا جواب اولاً یہ ہے کہ جیسے امام ولی اللہ نے بیان کیا کہ قرآنی طرز مصنفین کے طرز پر نہیں بلکہ دستور عرب قدیم کے طریقہ پر ہے۔ جیسے کہ سبعہ معلقات میں متعدد مضامین ایک ہی قصیدہ میں بیان ہوتے ہیں۔ کبھی اظہارِ محبت، کبھی بارش کی تعریف، کبھی گھوڑے کی تیز رفتاری کا بیان۔ گویا قرآن ایک شاہی مکتوب ہے کہ جس میں بادشاہ متعدد اشیاء کے انتظام کا کسی گورنر کو حکم دیتا ہے۔ اس لئے اس میں ترتیب کو تلاش کرنا معقول نہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ تمام مضامین کو مصنفین کی طرح جدا جدا باب میں مرتب کرنا نقص نہیں، بلکہ یہ ایک جداگانہ اعجاز ہے کہ جب یہ کتاب اصل کے اعتبار سے خدا کی ہے انسان کی بنائی ہوئی نہیں ہے تو طرزِ ترتیب میں بھی مصنفین سے وہ جداگانہ شان رکھتی ہے۔ اگر انسانی کتاب ہوتی۔ تو اس میں ضرور انسانی ترتیب کی نقل اتاری جاتی۔

تیسرا یہ کہ جیسا امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ قرآن خود معجزہ ہے۔ اس کی ترتیب عمیق بھی ایک مستقل معجزہ ہے چنانچہ انہوں نے قرآن کی ترتیبی اعجاز کو کل قرآن میں بالالتزام بیان کیا ہے۔ دیگر مفسرین نے بھی کیا۔ بیان القرآن سبق الغایات فی نسق الآیات میں بھی قرآن کی ترتیب کو بیان کیا گیا ہے۔ جو اہلِ استشراق کو نظر نہیں آئی۔ احقر نے اسی انداز پر قرآن کی آخری منزل کی تفسیر جو سب سے زیادہ مشکل ہے، عربی میں جمع کر دی ہے جو ابھی تک طبع نہیں ہوئی۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ جس کو بےترتیبی نظر آتی ہے وہ ان کا قصورِ نظر ہے۔ قرآن کا مقصد عام مصنفین کی طرح صرف تعلیم نہیں بلکہ تعلیم کے ساتھ تعمیل بھی ہے یعنی جو بتلایا گیا امر ہو یا نہی، اس پر عمل بھی کرایا جائے اور انسانی ضمیر کو عمل کے لئے تیار کیا جائے۔ جس کے لئے قرآن امر و نہی کی تعلیم کے بعد کبھی جنت اور اس کی نعمتوں کا ذکر کرتا ہے اور کبھی دوزخ اور اس کی تکلیفات کا۔ تاکہ انسان کو نتائج سے آگاہ کیا جائے کہ تعمیلِ حکم کا نتیجہ جنت اور اس کی راحتیں، اور عدمِ تعمیل کا نتیجہ دوزخ اور اس کی تکلیفات ہیں۔ کبھی اوصافِ الٰہیہ کو ذکر کیا جاتا ہے تاکہ اللہ کی عظمت قلب میں راسخ ہو کر انسان اس کے حکم کی تعمیل کے لئے تیار ہو

جائے۔ کبھی انسان پر اپنی نعمتوں کا ذکر کرتا ہے تاکہ ان احسانات سے شرمندہ ہو کر عمل کے لئے آمادہ ہو جائے۔ کبھی وہ واقعات وقصص ذکر کرتا ہے جس میں اہلِ اطاعت پر انعام ہوا یا اہلِ عصیان پر عذاب ہوا، تاکہ اطاعت کی طرف انسان کو رغبت ہو اور معصیت سے نفرت۔ یہی چار اصول اگر معلوم ہوں تو قرآنی مضامین میں کسی قسم کی بے ترتیبی کا شبہ پیدا نہ ہوگا۔

دسواں شبہ | اہلِ استشراق کہتے ہیں کہ بعض آیات میں زبان عربی کے عام قاعدوں کے برخلاف عمل ہوا ہے جس کو لحن کہا جاتا ہے۔ جو اعجاز کے خلاف ہے مثلاً عروہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتا ہے کہ میں نے ان سے لحنِ قرآن کے متعلق پوچھا۔ مثلاً:

۱۔ اِنَّ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ ؕ (سورۃ طٰہٰ آیۃ ۶۳)

۲۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ ؕ (سورۃ النساء آیۃ ۱۶۲)

۳۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِئُوْنَ ؕ (سورۃ المائدۃ آیۃ ۵)

تو آپ نے فرمایا:

يَا ابْنَ اُخْتِيْ هٰذَا عَمَلُ الْكُتَّابِ اَخْطَؤُا فِي الْكِتَابِ رَوَاهُ اَبُوْعُبَيْدٍ فِيْ فَضَائِلِ الْقُرْاٰنِ وَاَخْرَجَ ابْنُ الْاَنْبَارِيِّ فِيْ كِتَابِ الرَّدِّ عَلٰى مَنْ خَالَفَ مُصْحَفَ عُثْمَانَ عَنْ عِكْرَمَةَ لَمَّا كُتِبَتِ الْمَصَاحِفُ عُرِضَتْ عَلٰى عُثْمَانَؓ فَوَجَدَ فِيْهَا حُرُوْفًا مِّنَ اللَّحْنِ فَقَالَ لَا تُغَيِّرُوْهَا فَاِنَّ الْعَرَبَ سَتُقِيْمُهَا بِاَلْسِنَتِهِمْ۔

گویا مذکورہ تین آیات جن میں بظاہر لحن نظر آتا ہے یعنی بے قاعدگی۔ صدیقہؓ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ یہ کاتبوں کی غلطی ہے۔ دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے نسخے لکھ کر حضرت عثمانؓ پر پیش کئے گئے۔ آپ نے فرمایا اس میں فروگذاشت ہیں لیکن عرب اس کو اپنی زبانوں سے درست کر دیں گے۔

اس شبہ کا پہلا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں روایتیں ضعیفُ الاسناد، منقطع اور مضطرب ہیں علامہ الوسی فرماتے کہ یہ روایت عثمان سے صحیح نہیں اور ان دونوں کی تردید خود ان روایتوں میں موجود ہے۔ وہ یہ کہ حضرت عثمان نے قرآن کے نسخوں کو دیکھ کر فرمایا بِاَنَّھُمْ اَحْسَنُوْا وَاَجْمَلُوْا یعنی لکھنے والے صحابہ نے حسین اور جمیل طریقے سے مرتب کیا۔ پھر اس کے بعد یہ کیسے فرما سکتے ہیں کہ ان میں غلطیاں ہیں۔ یہ تو مدح اور قدح کا تضاد ہے جو روایت میں ساقط ہونے کے لئے کافی ہے۔ پھر مناہل میں قرآن کے پیش کرنے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان نسخوں میں صرف تین جگہ تصحیح فرمائی۔ ۱۔ لَمْ یَتَسَنَّ اس کے ساتھ ہا لگا لَمْ یَتَسَنَّهْ کر دیا۔

۲۔ اَمْھِلِ الْکٰفِرِیْنَ کو مَھِّلِ الْکٰفِرِیْنَ کر دیا۔ (سورۃ طارق آیۃ ۱۷)

۳۔ لَاتَبْدِیْلَ لِلْخَلْقِ کو لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ سے بدل دیا۔ (سورۃ الروم آیۃ ۳۰)

جب آپ کو تصحیح قرآن کا اسقدر اہتمام تھا کہ جہاں معمولی غلطی پائی اس کو درست کئے بغیر نہ چھوڑا تو مذکورہ روایت پر کیسے اطمینان کیا جا سکتا کہ آپ نے لحن اور غلطی کا اقرار کرنے کے باوجود اس کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جو عقل کے خلاف ہے۔ لہٰذا یہ نقل روایۃً و درایۃً دونوں لحاظ سے درست نہیں۔

دُوسرا جواب یہ ہے کہ لحن سے مراد رسم الخط کا وہ خاص طریقہ ہے جو عام طور پر معمول نہ تھا۔ ابُو عبیدہ نے فضائل القرآن میں لکھا ہے کہ لحن کے معنی خلاف الخط المعروف جیسے لَاْ اَذْبَحَنَّهٗ اور وَلَاْ اَوْضَعُوْا خِلٰلَکُمْ ط

تیسرا جواب یہ ہے کہ لحن سے مراد طرز تلفظ ہے نہ غلطی جیسے وَلَتَعْرِفَنَّھُمْ فِیْ لَحْنِ الْقَوْلِ ط (سورۃ محمد آیۃ ۳۰)

اَیْ نَھْجِ التَّلَفُّظِ مَثَلًا اَلصِّرَاطُ بِالصَّادِ الْمُبْدَلَةِ مِنَ السِّیْنِ [۲]

باقی جو تین غلطیاں یا بے قاعدگیاں پیش کی گئی ہیں اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ اگر قرآن میں

---

[۱] مناہل العرفان جلد ۱ صفحہ ۲۷۹ [۲] مناہل القرآن صفحہ ۲۸۰

قواعدِ عرب کے خلاف کوئی لفظ ہوتا تو زمانۂ قرآن کے مخالفین اس غلطی کو ضرور پیش کرتے اور قرآن کے اعجاز کو توڑ کر فتح حاصل کرتے۔ جب انہوں نے ایسا نہیں کیا تو یہ شبہ نامعقول ہے۔ تاہم میں ہر ایک کا نمبروار جواب دیتا ہوں۔

(۱) ان ھذان لساحران قاعدہ کے مطابق ان ھذین ہونا چاہیئے کہ انّ نصب دیتا ہے۔ اوّلاً تو اس کا جواب یہ ہے کہ قاعدہ زبان کا تابع اور اسی سے ماخوذ ہوتا ہے۔ قرآن نے جو استعمال کیا ہے یہ عرب میں قبیلہ کنانہ بنی الحارث کی لغت ہے کہ تثنیہ کو تینوں حالات میں الف سے پڑھتے ہیں جیسے مناہل العرفان میں مذکور ہے۔

دوسرا یہ کہ انّ ضمیر شان مقدر میں عامل ہے جو انہ ہے اور ھذان لساحران مبتدا خبر ہے۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ ھذان کا الف تناسب لفظ ساحران کی وجہ سے ہے ـــــ جیسے سَلٰسِلَا وَاَغْلٰلًا (سورۃ دہر آیۃ ۴) اور یہ بھی عربی کا قاعدہ ہے۔ قرآن میں عن سبأ بنباء یقین میں سبأ کا کسرہ وتنوین بناءِ کی مناسبت کی وجہ سے ہے۔

(۲) والمقیمین کا منصوب ہونا مدح کی بناء پر ہے۔

(۳) والصابئون کا مرفوع ہونا یا بربنا مستبدأ ہونے کے ہے اور خبر محذوف ہے یعنی والصابئون کذالک یا مرفوع ہے عطف ہے محل ان مع الاسم پر یا معطوف ہے ھادوا کی ضمیر مرفوع پر۔

گیارہواں شبہ | یہ ہے کہ بعض انسانوں نے بے نظیر کلام عربی میں بنایا۔ مثلاً فیضی کی تفسیر بے نقط، جیسے دیانند نے ذکر کیا کہ اس کی عبارت ان حروف سے بنی ہے جو غیر نقطہ دار ہیں۔ مثلاً م، ل، ح، س وغیرہ، اور مسیلمۃ الکذاب، ابن الراوندی الزندیق، ابوالعلاء المعری، ابوالطیب المتنبی۔ یہ شبہ بے بنیاد ہے۔

فیضی کی تفسیر بے نقط | فیضی نے جو کام کیا وہ خود فیضی کی نگاہ میں معجزہ نہیں اور تمام بلغاء کی نگاہ میں بھی معجزہ نہیں۔ یہی کام متنبی سے چھ سو سال پہلے عربوں میں معمول رہا۔ خود مقامات حریری میں ایسی عبارات فیضی سے بہت پہلے موجود ہیں کہ بعض خالص حروف مہملہ میں بعض حروف معجمہ میں اور

بعض عبارات کا ایک نقط مہلہ حروف یعنی غیر نقطہ دار حروف سے مرکب ہے اور دوسرا نقط معجمہ سے یعنی نقطہ دار حروف سے۔ اس کے علاوہ فیضی نے ایسا کرنے کو قرآن کا توڑ نہیں سمجھا اور نہ یہ دعوی کیا بلکہ وہ آخر زندگی تک قرآن کے اعجاز کا قائل رہا۔ بلکہ اسی تفسیر میں وہ قرآن کے اعجاز اور تعریف کو زور دار الفاظ میں پیش کر چکا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

کَلَامُ اللّٰہِ لَاحَدَّ لِمَحَامِدِہٖ وَلَا حَدَّ لِمَکَارِمِہٖ وَاَمَاءٌ لَّاسَاحِلَ لَہٗ۔	قرآن اللہ کا کلام ہے جس کی تعریفوں کی انتہا نہیں اور جس کی فضیلتیں شمار میں نہیں آسکتیں وہ ایک ایسا سمندر ہے جس کا کنارہ نہیں۔

اس اقرار کے باوجود فیضی کی تفسیر سواطع الالہام کو اعجاز سمجھنا، مدعی سست گواہ چست کا مصداق ہے۔

مسیلمہ کی تک بندی فیضی کے علاوہ مسیلمۃ الکذاب کی بے معنی تک بندی جس میں ہدایت انسانی کی بو تک موجود نہیں۔ اس کو نہ مسیلمہ نے قرآن کی طرح معجزہ سمجھا نہ کسی اور نے۔ بلکہ اس کو کسی بلیغ ماہر زبان نے قابل تذکرہ بھی نہ سمجھا۔ ہم ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے اس کو نقل کرتے ہیں۔

وَالْمُبْذِرَاتِ بَذْرًا وَالْحَاصِدَاتِ حَصْدًا وَالذَّارِيَاتِ قَمْحًا وَالطَّاحِنَاتِ طَحْنًا وَالْعَاجِنَاتِ عَجْنًا وَالْخَابِزَاتِ خَبْزًا وَالثَّارِدَاتِ ثَرْدًا وَاللَّاقِمَاتِ لَقْمًا اِهَالَةً وَّسَمْنًا۔	یعنی قسم ہے ان عورتوں کی جو بیج ڈالتی ہیں زمین میں اور فصل کاٹنے والیوں کی اور گندم صاف کرنے والیوں کی، اور دانہ پیسنے والیوں کی اور آٹا گوندنے والیوں کی، اور روٹی بنانے والیوں کی اور اسکو شوربا میں ڈالنے والیوں کی اور نوالہ لینے والیوں کی چربی اور گھی۔

لفظی خامیوں کے علاوہ اس نے ہر جگہ واو استعمال کیا ہے حالانکہ بعض جگہ فا اور بعض جگہ ثُمَّ استعمال کرنے کا تھا۔ پھر جو کام مردوں کے تھے یا مرد اور عورتوں میں مشترک تھے اس کو بھی صرف عورتوں کی طرف منسوب کیا۔ نفس مضمون اس قدر لغو اور بے فائدہ ہے کہ ادنی درجے کے آدمی کے لئے بھی

موجب عار ہے اِسی طرح اس کی یہ تُک بندی:-

اَلْفِیْلُ مَا الْفِیْلُ وَمَا اَدْرَاكَ مَا الْفِیْلُ لَہٗ ذَنَبٌ وَبِیْلٌ وَّخُرْطُوْمٌ طَوِیْلٌ۔

جاحظ نے اس کی یہ تُک بندی بھی نقل کی ہے۔

یَا ضِفْدَعُ بِنْتَ ضِفْدَعِیْنِ نَقِّیْ مَا تَنْقِیْنَ نِصْفُكِ فِی الْمَاءِ وَنِصْفُكِ فِی الطِّیْنِ لَا الْمَاءَ تُکَدِّرِیْنَ وَلَا الشَّارِبَ تَمْنَعِیْنَ۔

یہ دونوں تُک بندیاں بالترتیب ہاتھی اور مینڈک کے متعلق ہیں۔

ابن الراوندی زندیق یہودی ابن الراوندی یہودی الفسل المتوفی ۲۹۳ھ۔ یہ یہود اور نصاریٰ سے بڑی رقمیں لے کر قرآن اور اسلام کی تردید میں کتابیں لکھتا۔ ان کتابوں کے نام یہ ہیں۔ التاج والفرید والزمردة وقضیب الذہب۔ کتاب لکھنے کے بعد یہود و نصاریٰ سے اور رقم طلب کرتا تھا۔ جب نہ دیتے تو ان کتابوں کی تردید کرتا تھا۔ ابو العلاء المعری نے اس کی کتاب تاج کے متعلق لکھا ہے۔

لَا یَصْلُحُ تَاجُہٗ اَنْ یَّکُوْنَ نَعْلًا۔ اس کی کتاب تاج جوتا بننے کے قابل نہیں۔

یہ اُس ابو العلاء المعری کا قول ہے جو ابن الراوندی کی طرح مُلحد تھا۔ ابو علی جبائی معتزلی سے بغداد کے پُل پر ابن الراوندی نے ملاقات کی اور کہا کہ تم میرے قرآن کو سُنو گے۔ جبائی نے کہا میں تمہارے شرمناک علوم سے واقف ہوں۔ پھر اس نے کہا۔ اے ابن الراوندی تم کو منصف ٹھیراتا ہوں کیا تمہارے اس کلام میں قرآن کی طرح بلاغت، فصاحت، شیرینی اور ہیبت ہے؟ اُس نے کہا کہ نہیں۔

متنبی کی تُک بندی متنبی نے دعویٔ نبوت کے وقت یہ لکھا تھا۔

اُقْسِمُ بِخَالِقِ اللَّیْلِ وَالرِّیْحِ الْهَابَّةِ بِاللَّیْلِ اِنَّ الْکَافِرَ لَطَوِیْلُ الْوَیْلِ وَاِنَّ الْکُفْرَ لَمَکْفُوْفُ الذَّیْلِ۔

پھر توبہ کرکے مسلمان ہوا اور مخلص مسلمان ہوا۔ ان سب کا ماخذ اعجاز القرآن مصطفی صادق الرافعی صفحہ ۲۰۸ سے ۲۱۲ تک ہے۔ ان چیزوں کے نقل کرنے کا ایک مقصود تو قرآن کے اعجاز کو نمایاں کرنا ہے۔ دوم یہ کہ متنبی وغیرہ مسیلمہ اور ابن الراوندی سے ادبی حیثیت سے اونچا مقام رکھتے تھے لیکن جب

اُنھوں نے اس میدان میں قدم رکھا تو اُن کا کلام ایسا معلوم ہوا کہ خود اُن کے معتقدین نے بھی ہنسی اُڑائی اور خود اُن کا دل بھی اس بے فائدہ کام پر ان کو ملامت کرتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ قرآن کے جواب میں جس نے جو کچھ کہا خود مسلمانوں نے نہایت بے تعصبی کے ساتھ اس کو نقل کیا۔ تیسری بات یہ کہ جو کچھ قرآن کا مقابلہ کیا گیا، یہ اسلامی حکومت جو عروج پر تھی اُس کے تحت رہ کر اور رعیت بن کر خود دار السلطنت بغداد میں کیا گیا اور آزادیٔ خیال کا یہ عالم تھا کہ حکومت نے باز پُرس تک نہیں کی، غالباً یہ سمجھ کر کہ اعجازِ قرآن آفتاب ہے۔ ان تنگ بندیوں سے اس کو کیا ضرر پہنچ سکتا ہے۔

اعجازُ القرآن کا فہم

مشاہدات اور معنویات (۱) قرآنی اعجاز اگرچہ بلاغی حیثیت سے ذوقی چیز ہے۔ جیسے کھارے اور میٹھے پانی کی پہچان، اور بلاغت و فصاحت کے ذوق رکھنے والوں کے لئے یہ ایک بدیہی چیز ہے لیکن ہم چند چیزوں کی نشاندہی کرتے ہیں جن سے اعجازِ قرآن معمولی فہم رکھنے والے انسان کے لئے بھی واضح ہو جاتا ہے۔ کچھ مضامین مشاہدات سے تعلق رکھتے ہیں جو کھلی چیزیں ہیں۔ جیسے آسمان زمین وغیرہ اور کچھ معنویات جو مشاہدہ سے خارج ہیں۔ مثلاً اخلاق، اعمالِ قلبیہ و عقائد احکام و قوانین غیبیات۔ عرب وعجم کے شعراء کی فصاحت و بلاغت کا میدان مشاہدات تھے نہ معنویات۔ ان کا زورِ کلام مشاہدات میں جولانیاں دکھاتا تھا، معنویات میں اُن کا زور ختم ہو جاتا تھا۔ لیکن قرآن نے مشاہدات کو بھی بیان کیا اور غیبیات اور معنویات کو بھی۔ لیکن اُس کے زورِ بیان میں کوئی فرق نہیں آیا۔

(۲) شعراء عرب وعجم اپنا زورِ بیان دکھانے اور فصاحت و بلاغت نمایاں کرنے میں اس کے پابند نہ تھے کہ جو مضمون وہ بیان کریں وہ صحیح اور سچا بھی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ عربی شاعری کے متعلق یہ مقولہ مشہور تھا کہ اَحْسَنُہٗ اَکْذَبُہٗ۔ بہت عمدہ شعر وہی ہے جس کا مضمون زیادہ جھوٹا ہو۔ لیکن قرآن کے

مضامین صدق اور راستی کے پابند تھے۔ جس میں خلافِ واقعہ کوئی مضمون نہیں آسکتا تھا۔ اس لئے قرآن کا دائرہ بہت تنگ تھا لیکن پھر بھی قرآنی بلاغت میں فرق نہیں آیا۔ لیکن اگر کسی شاعر کو صدق کا پابند کیا جائے کہ وہ جھوٹے مبالغہ سے پرہیز کرے تو اس کا کلام پھیکا پڑ جاتا ہے اور زورِ فصاحت باقی نہیں رہتا لیکن قرآن کی بلاغت اس پابندی کے باوجود بے مثال ہے۔

(۳) انسان اور اس کی قوتیں محدود ہیں۔ اس لئے بلیغ سے بلیغ شاعر ایک خاص دائرہ میں زورِ فصاحت دکھانے پر قادر ہوتا ہے، دوسرے دائرہ میں نہیں۔ جیسے امراء القیس کی شاعری کا زورِ بیان عورتوں اور گھوڑوں کی تعریف سے مختص ہے۔ نابغہ کا جوشِ بیان خوف کے مضامین سے۔ اعشیٰ کا شراب سے۔ اسی طرح فردوسی و نظامی جنگ کے مضامین میں یکتا ہیں، اور سعدی اخلاق میں۔ لیکن قرآن میں ہر قسم کے مضامین آتے ہیں مگر اس کی بیمثال بلاغت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

(۴) قرآنی بلاغت کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں تھوڑے الفاظ میں ایسا مضمون بیان کیا گیا جس سے ایک کتاب بن سکتی ہے لیکن پھر بھی نہ قرآن کی شیرینی میں کوئی فرق آیا نہ مضمون پر دلالت کرنے میں پیچیدگی پیدا ہوئی۔ جیسے وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (سورۃ الذاریات آیۃ ۲۰)

(۵) ہر کتاب جس زبان کی ہوتی ہے، سو سال کے بعد چونکہ زبان بدل جاتی ہے اس لئے سو سال پہلے کے الفاظ متروک ہو جاتے ہیں اور ان سے مطلب برآری مشکل ہو جاتی ہے۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمۂ قرآن بے مثال ہے لیکن زمانہ گذر جانے کی وجہ سے اس کے بعض اردو الفاظ کا استعمال ترک ہوا ہے۔ اس لئے اس کی افادیت کمزور ہوئی اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اس ترجمہ کو جدید الفاظ کے قالب میں ڈھال دیا تاکہ افادیت برقرار رہے لیکن اس عام قاعدے کے برخلاف قرآن کی عربی پر چودہ سو سال تقریباً گذر گئے لیکن قرآنی الفاظ کی افادیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں خالقِ کائنات نے ان الفاظ کا انتخاب کیا ہے، جو اس طویل زمانہ گذر جانے کے باوجود ان کا استعمال برقرار رہنے والا تھا۔

ان چار امور کو ملاحظہ کر دینے کے بعد کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ اس انداز کا کلام بلاغت کے

اس مقام پر پہنچا ہوا تھا جو انسانی قوت کی رسائی سے بالاتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت کعبہ میں سات مشہور قصیدے جو عرب میں بیمثال تھے، لٹکے ہوئے تھے۔ لیکن جب قرآن نازل ہوا تو کسی کے کہنے کے بغیر اربابِ قصائد کے خویش و آقارب نے ان کو کعبہ سے اُتارا۔ صرف امراء القیس کا قصیدہ باقی رہا، جس کے اتارنے سے اس کی بہن نے انکار کیا۔ لیکن جب اُس نے قرآن کی یہ آیت طوفان نوح کے متعلق سُنی :-

وَقِيلَ يَاأَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَاسَمَاءُ — اے زمین نگل جا اپنا پانی اور اے آسمان تھم جا
أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ (سورہ ہود آیۃ ۴۴) — برسنے سے اور کم ہوگیا پانی۔

تو امراء القیس کی بہن نے فوراً اپنے بھائی کا قصیدہ بھی اُتارا۔ (اعجاز القرآن الرافعی)

جارج سیل لکھتا ہے کسی انسان کا قلم ایسی معجزانہ کتاب نہیں لکھ سکتا اور یہ مردوں کو زندہ کرنے سے بڑا معجزہ ہے۔ ارمیکسویل کنگ لکھتا ہے اگر وحی کوئی چیز ہے، تو بے شک قرآن ایک الہامی کتاب ہے۔ (تاریخ اسلام عبدالقیوم ندوی ج ۱ صفحہ ۳۲۷)

اعجازِ قانونی

قرآن کا بلاغی اعجاز بیان ہو چکا ہے۔ اب دوسری دلیل قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کا قانونی اعجاز ہے۔ قانونِ انسانی خواہ ایک فرد کا مرتب کردہ ہو یا جماعت کا (پارلیمنٹ) اور چاہے اس قانون کے بنانے والے انتہائی مہارت رکھتے ہوں تاہم وہ قانون مختلف اقوام اور ممالک میں بالخصوص لمبے عرصے تک نہیں چل سکتا اور ضرور اس میں ایسی خامی ظاہر ہوتی ہے کہ اس میں ترمیم، تبدیلی اور تغیر کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے اور اس کو بدل دینا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی ملک اور سلطنت کے قوانین میں مجالس قانون ساز اور اسمبلیوں اور پارلیمنٹوں کے ذریعہ تبدیلیاں کی جاتی ہیں، جو اس قانون کی خامی اور نقص اور کمزوری کی دلیل ہے۔ لیکن قرآن کا قانون جو زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق ہے اور اس کے ظاہر کرنے والے صرف ایک ذات یعنی پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ جو لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتے تھے

اور امّی اور ناخواندہ تھے اور جس ملک میں ظاہر ہوئے وہ بھی اُمّیین اور ناخواندوں کا ملک تھا۔ نہ اس ملک کے کسی حصہ میں تعلیم کا چرچا تھا اور نہ ان کو کسی قانون سے واقفیت تھی۔ اس کے باوجود قرآن کا قانون صرف عرب میں نہیں بلکہ ایشیا، یورپ اور افریقہ کے تین براعظموں میں ہزار سال سے زیادہ وقت تک اس پر عمل درآمد رہا اور وہ ان میں نافذ العمل رہا۔ لیکن اس طویل عرصہ میں نہ اس میں کوئی نقص پایا گیا اور نہ ترمیم اور تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی بلکہ دورِ حاضر جس میں تعلیم عام پھیل گئی اور اقوام عالم ایک خاندان کی طرح ایک دوسرے سے مربوط ہو گئے ہیں۔ اس میں بھی صرف اہلِ اسلام نہیں، یورپ کے مخالفینِ اسلام بھی قرآن کے قانون کو ایک بے مثال قانون تسلیم کرتے ہیں اور قانون قرآن پر چودہ سو سال گذر جانے کے بعد بھی اس کی معقولیت اور جامعیت کا اقرار کرتے ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر سموئیل لکھتے ہیں کہ قرآن کے مطالب ایسے ہمہ گیر اور ہر زمانے کے لئے موزوں ہیں کہ تمام صدائیں خواہ مخواہ اس کو قبول کرتی ہیں اور محلوں، ریگستانوں، شہروں اور سلطنتوں میں گونجتا ہے۔

۲۔ مسٹر ولف لکھتا ہے۔ وسیع جمہوریت، رشد و ہدایت، انصاف و عدالت، فوجی تنظیم، مالیات اور غرباء کی حمایت اور ترقی کے اعلیٰ آئین قرآن میں موجود ہیں۔

۳۔ ڈاکٹر موریس فرانسیسی لکھتا ہے۔ قدرت کی عنایتوں نے جو کتابیں انسان کو دیں، قرآن اُن سب سے افضل ہے۔

صرف ان تین حوالوں پر اکتفا کرتے ہیں جو تاریخ اسلام عبدالقیوم ندوی ج۱ صفحہ ۲۲۷ تا ۲۳۰ میں نقل ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ کیا ایسی کتاب کسی انسانی فکر کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔ بلکہ یہ کتاب خالقِ کائنات کے لامحدود علمی سرچشمہ سے نکلی ہوئی ہے جن کو سب اقوام اور سب زمانوں کی ضروریات کا علم تھا جن کو اُس نے اِس کتاب میں سمو دیا۔

آں کتاب زندہ قرآنِ حکیم — حکمتِ اُو لایزال است و قدیم
حرفِ اُو را ریب نے تبدیل نے — معنی اش شرمندۂ تاویل نے
نسخۂ تکوین اسرارِ حیات — بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

صد جہاں تازہ در آیاتِ او   عصرہا پیچیدہ در آناتِ او
نوعِ انسان را پیامِ آخریں   حاملِ اُو رحمۃ للعالمینؐ   (اقبال)

۴۔ اس کے علاوہ سر ڈامنڈ برگ لکھتا ہے۔ "قرآن کے قوانین تاجدار سے ادنیٰ فرد تک پر حاوی ہیں اور اِس قدر معقول ہیں جس کی نظیر نہیں ملتی"۔ (حوالہ بالا تاریخ عبدالقیوم ندوی)

۵۔ ارنلڈ لکھتا ہے۔ "قرآن نے وہ اصول پیش کئے کہ سائنس کی بڑھتی ہوئی ترقی اس کو شکست نہیں دے سکتی"۔ (حوالہ بالا تاریخ عبدالقیوم ندوی)

اعجازِ تاثیری

قرآنِ حکیم اپنی تاثیرات کے لحاظ سے بھی ایک معجزہ ہے کہ کسی انسانی کتاب میں وہ تاثیر نہیں جو قرآن میں موجود ہے اور جو اس کے ذریعہ دنیا میں پھیل کر پوری دنیا کو اس نے روشن کیا۔ تاثیر یا اثراندازی کا اوّلین تعلق انسانی رُوح سے ہے۔ روح جب متاثر ہو کر بدل جاتی ہے تو انسانی تصورات، گفتار و کردار میں خود تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے کہ ان تینوں چیزوں کا مرکز دل یا رُوح ہے۔ حدیث نے یہی حقیقت ظاہر کی ہے کہ بدن میں ایک چیز ہے، جب وہ درست ہو جائے تو پُورا بدن درست ہو جاتا ہے۔ (بخاری)۔ مرکزِ اصلاح رُوح ہے لیکن رُوح امرِ ربّی اور آسمانی چیز ہے، زمینی نہیں۔ لہٰذا جو کتاب آسمانی ہوگی، کلامِ ربّی ہوگی۔ اس سے رُوح کی جو کہ امرِ ربّی ہے، اصلاح ہوگی۔ قرآن حکیم جس قوم اور ملک میں ظاہر ہوا، وہ تمام عالمی برائیوں کا مرکز تھا یعنی ملکِ عرب اور قومِ عرب۔ اعتقادی برائیوں کا یہ حال تھا کہ خدا پرستی کا نام و نشان نہ تھا اور بُت پرستی عام تھی۔ انصاف اور عدل مٹ چکا تھا اور پورا جزیرۃ العرب ظلم کدہ بن چکا تھا اور ہر قوی کمزور کو کھائے جا رہا تھا اور دیگر ذرائع معاش نہ ہونے کی وجہ سے لُوٹ کھسوٹ ہی اُن کے لئے واحد ذریعہ معاش بن چکا تھا۔ اس سنگدلانہ مظالم سے ان کی اولاد بھی محفوظ نہ تھی۔ یہاں تک کہ وہ اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کرتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ منشیات اور مسکرات کا استعمال اس قدر عام تھا کہ کوئی مجلس شراب نوشی سے خالی نہ تھی۔ اتفاق و اتحاد کے

نام سے بھی واقف نہ تھے اور ہر قوم اور قبیلے کے افراد دائما ایک دوسرے سے برسرِپیکار رہتے تھے۔ اور یہ خانہ جنگی اور قوم کُشی اُن کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ اصلاح کے تمام اسباب، تعلیم، تربیت قانون مفقود تھے۔ جہالت، لاقانونیت اور خود سری عام تھی۔ یہ حالات ایسے تھے کہ انسانی وسائل و ذرائع سے ان کی اصلاح ہزار سال میں بھی ممکن نہ تھی اور ان صدیوں سے پھیلے ہوئے فسادات کو دُور کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عرب کی اصلاح کیونکر تصور میں آسکتی تھی کہ ان میں تو اسبابِ اصلاح کا نام و نشان تک نہ تھا۔ جب کہ دورِ حاضر میں سب اسبابِ اصلاح موجود ہیں۔ تعلیم عام ہے نشر و اشاعت کے ذرائع عام ہیں۔ قانون موجود ہے۔ اصلاحِ معاشرہ کی انجمنیں قائم ہیں، فلموں کے ذریعہ اصلاح کی کوشش جاری ہے۔ پھر بھی ہر قسم کے فساد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اور جرائم کی نئی نئی شکلیں ایجاد ہو رہی ہیں اس منظر کو دیکھ کر یہ تصور کرو کہ قرآن کے لئے اصلاحِ عرب کا ایسا کٹھن کام بالخصوص ایسے وقت میں کہ قرآن کے تئیس سالہ زمانِ نزول میں سے تیرہ سال جو مکی زندگی کا زمانہ ہے، قرآنی اصلاح کی بندش کا زمانہ ہے کہ کفارِ مکہ کی جابرانہ قوت نے قرآنی آواز کو پورا تیرہ سال دبائے رکھا اور قرآنی تبلیغ کی تمام راہیں مسدود کر دی گئی تھیں۔ ہجرت کے بعد قرآن کو کسی حد تک آزادی حاصل ہوئی لیکن باقیماندہ گیارہ سال کی مدنی زندگی میں سے آٹھ سال یعنی فتحِ مکہ تک قرآن کے لئے ایسے تھے کہ خود دشمنانِ قرآن مدینے پر حملے کر کے قرآنی تبلیغ اور کلامِ الٰہی کی آوازِ حق کو جنگ کے ذریعہ دبانے کی کوشش کرتے رہے۔ جس کی وجہ سے اس آٹھ سال کی جنگی فضا میں بھی قرآن کو آوازِ حق پہونچانے کی آزادی نہ مل سکی۔ زمانۂ نبوت و قرآن کے تئیس سال میں سے اکیس[۲۱] سال منہا کرنے کے بعد آزاد اثر اندازی کے لئے صرف دو اڑھائی سال ملے ہیں۔ اس بہت ہی کم وقت میں قرآن نے اپنی تعلیم اور آوازِ حق سے جو اصلاحی انقلاب عرب میں لایا وہ دنیا کو معلوم ہے اور صفحاتِ تاریخ میں نمایاں ہے۔ اور دوست دشمن اس کا اقرار کرتے ہیں۔ خدائی حقوق کی اقامت کا یہ حال رہا کہ بُت پرستی یک قلم ناپید ہو گئی اور گھر گھر خدا پرستی اور توحید کا ایسا چرچا پھیلا کہ وہی بُت پرست خود بُت شکن بن گئے۔ اُن کی زبانوں پر ہر وقت اللہ کی توحید جاری ہوتی۔ سر واحدِ لاشریک کی عبادت میں جھک گئے۔ دلوں میں اللہ کی عظمت

بھر گئی۔ غیر اللہ کا خوف قلوب سے نکل گیا۔ انسانی حقوق کا یہ حال تھا کہ جو قوم اپنے حقیقی بھائیوں کی دشمن بنی ہوئی تھی، وہ اسلامی اور قرآنی رشتے کی وجہ سے بلال حبشی، صہیب رومی، سلمان فارسی کو اپنے حقیقی بھائیوں سے زیادہ محبوب سمجھنے لگی۔ خانہ جنگی کا خاتمہ ہوا۔ اور پوری عرب قوم محبت و اخوت کے رشتہ میں منسلک ہو کر ایک فولادی دیوار بن گئی۔ جوا بازی، سود خوری، شراب نوشی، چوری ڈاکہ، قتل، ظلم نہ صرف عرب سے مٹ گئے بلکہ قرآن سے متاثر ان عربوں کا قدم جہاں پہنچا، وہاں بھی ان برائیوں کا نام نشان نہیں رہا۔ ایک یورپی اہلِ قلم نے لکھا ہے کہ گویا قرآن کے بعد عرب انسانی صورت میں ملائک بن کر پھر رہے تھے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ایسا اصلاحی کارنامہ جو سراپا معجزہ ہے صرف قرآن سے وجود میں آیا۔ جو انسانی کتابوں کی مجموعی طاقت اور دنیا کی تمام حکومتوں کی مجموعی قوت سے ممکن نہ تھا۔ تو کیا یہ اس امر کی دلیل نہیں کہ قرآن کلام الٰہی ہے۔ جس نے خداداد تاثیر سے یہ اصلاحی کارنامہ انجام دیا، جو قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کی تاثیری دلیل ہے۔ جو کچھ ہم نے لکھا اس کا اقرار دورِ حاضر کے عیسائی دشمنانِ اسلام نے بھی کیا ہے۔

تاثیرِ قرآن یورپ کی نظر میں

ڈاکٹر ماریس لکھتا ہے۔ قرآن نے دنیا پر وہ اثر ڈالا، جس سے بہتر ممکن نہیں۔

یسیان فرانسیسی لکھتا ہے۔ قرآن ایسا زندہ اور پرزور ایمانی جوش پیدا کرتا ہے کہ پھر کسی شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

سر ولیم میور لکھتا ہے۔ کہ قرآن نے فطرت کائنات کی دلیلوں سے خدا کو سب سے اعلیٰ ہستی ثابت کر کے انسان کو اسی کی اطاعت پر جھکایا۔

مسٹر جی۔ ٹی لکھتا ہے۔ قرآن نے بے شمار انسانوں پر اثر ڈالا اور سائنس کی دنیا نے قرآن کی ضرورت کو اور واضح کر دیا۔

مسٹر عمانوئیل ڈی انش لکھتا ہے۔ قرآن کی روشنی اس وقت یورپ میں نمودار ہوئی، جب تاریکی محیط ہو رہی تھی اور اس سے یونان کے مردہ علم و عقل کو زندگی مل گئی۔

مسٹر ایچ ایس لیڈ لکھتا ہے۔ تعلیم قرآن سے حکمت و فلسفے کا ظہور ہوا اور ایسی ترقی کی کہ اپنے وقت کے بڑے سے بڑے یورپین حکومت سے بڑھ گیا۔

انجذابی تاثیر

قرآن کی جس اصلاحی تاثیر کو ہم نے بیان کیا کہ وہ ایک ایسا معجزہ ہے جس کا کسی انسانی کتاب سے ظہور میں آنا ممکن نہیں۔ لیکن اصلاحی اعجاز کے علاوہ قرآن کی انجذابی تاثیر بھی ایک معجزہ ہے جو اس کے کلامِ الٰہی ہونے کی دلیل ہے، وہ یہ کہ قرآن ایک اچھی خاصی بڑی کتاب ہے جس کا حفظ کرنا ضخامت کے اعتبار سے بھی مشکل ہے۔ دوم یہ کہ غیر عرب مسلمانوں کیلئے اسکی زبان ایک اجنبی زبان ہے یہ حفظِ قرآن کی راہ میں دوسری رکاوٹ ہے کہ اپنی زبان کی کتاب کا حفظ آسان ہے لیکن اجنبی زبان کی کتاب کا حفظ دشوار ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ اس میں مشابہہ آیات کی کثرت ہے یعنی ایک جیسی آیت کے ساتھ ایک جگہ ایک مضمون کی آیت آئی اور دوسری جگہ اس آیت کے ساتھ اور مضمون کی آیات ہیں۔ یہ بھی حفظ کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ قرآن کے حافظ کے لئے قوم یا حکومت کی طرف سے نہ کوئی تنخواہ مقرر ہے، نہ کوئی خاص اعزاز۔ یہ بھی حفظِ قرآن کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے۔ پانچویں بات یہ ہے کہ قرآن کے حفظ کے لئے بھی کافی وقت اور محنت صرف کرنے کی ضرورت ہے اور حفظِ قرآن کو باقی رکھنے کے لئے تاحین حیات زندگی بھر دور و تکرار کی ضرورت ہے اتنی محنت اگر دورِ حاضر میں وہ کسی دنیوی علوم کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے کرے تو بہت کچھ مالی مفاد و دنیوی اعزاز حاصل کر سکتا ہے۔ اس لئے وقت اور محنت اور دنیوی مفاد کی قربانی بھی حفظِ قرآن کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے۔ لیکن ان سب موانع اور رکاوٹوں کے باوجود مسلمان قوم کے لاکھوں افراد قرآن کے حافظ موجود ہیں اور حفظ قرآن کا سلسلہ اس کس مپرسی کی حالت میں بھی روز بروز بڑھتا جا رہا ہے، جو اِس امر کی دلیل ہے کہ خود قرآن کی ذات میں معجزانہ انجذاب اور ایسی کشش کا سامان موجود ہے جو ان رکاوٹوں کے باوجود مسلمانوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور کوئی رکاوٹ اُن

پر اثرانداز نہیں ہوتی۔ یہ کشش اور انجذابی تاثیر قرآن کا ایک مستقل معجزہ ہے اور اس کے کلام الٰہی ہونے کی دلیل ہے کیونکہ اور کسی کتاب کے اس قدر حافظ کرۂ ارض میں موجود نہیں اور نہ اس قسم کی کشش کسی کتاب میں پائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ تورات و انجیل کا ایک بھی حافظ موجود نہیں۔

قرآن کی اعجازی تاثیر شخصیت رسول علیہ السلام پر

تاثیر اصلاحی اور انجذابی کے علاوہ یہ شخصیتی تاثیر بھی قرآن کا ایک مستقل معجزہ ہے قرآن کے متعلق ایک صحیح رائے ہے کہ یہ کلام الٰہی ہے۔ دوم غلط رائے کہ یہ کلام الٰہی نہیں۔ صحیح رائے کے اثبات، اور غلط رائے کی تردید کے لئے ہم قرآن کی شخصیتی تاثیر کا اعجاز پیش کرتے ہیں۔

شخصیتی تاثیر اعجازی کی تین صورتیں ہیں۔

۱: نزدلی اثر ۲: قلبی اثر ۳: قالبی تاثیر

۱: شخصیتی نزدلی اثر

یہ ظاہر ہے کہ مخالفین قرآن کی اس غلط رائے کے پیش نظر کہ قرآن کلام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے کلام الٰہی نہیں۔ اگر ایسا ہے تو یہ حقیقت ہے کہ انسان پر اپنے کلام کا بالخصوص جب کہ وہ جھوٹ بول کر اس کو خدا کی طرف منسوب کرتا ہو، گہرا اور عمیق اثر نہیں پڑ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ عرب کے مشہور سات قصائد جو سات شعراء نے بنائے تھے اور فصاحت میں دیگر اشعار کے قصائد سے ممتاز تھے اُن کا کوئی خاص اثر ان شعراء پر ظاہر نہیں ہوتا تھا ورنہ تاریخ میں ان کا ذکر ضرور آتا۔ لیکن قرآن کی وحی

سردی میں پسینہ | جب حضور علیہ السلام پر نازل ہوتی تھی اور مجمع عام میں نازل ہوتی تھی تو سرد موسم کے باوجود حضور علیہ السلام کے رخسار مبارک سے پسینے کے بڑے بڑے قطرے بہت زور کے ساتھ ٹپک پڑنے شروع ہو جاتے تھے۔ صدیقہ رضؓ سے اوّل بخاری میں منقول ہے:۔

لَقَدْ رَأَيْتُهُ يَنْزِلُ عَلَيْهِ الْوَحْيُ فِي الْيَوْمِ الشَّدِيْدِ الْبَرْدِ فَيَفْصِمُ

میں نے حضورؐ کو دیکھا کہ سخت سردی میں آپ پر قرآنی وحی نازل ہوتی تھی اور جب ختم ہوتی تو آپ

عَنْهُ وَاِنَّ جَبِيْنَهٗ لَيَتَفَصَّدُ عَرَقًا۔ — کی پیشانی سے ایسا پسینہ ٹپک پڑتا کہ جیسے کسی کی رگ نشتر سے کھول جائے اور خون زور سے ٹپکے۔

سردی میں اس مبالغہ کے ساتھ پسینے کی آمد غیر اختیاری ہے۔ تصنّع اور بناوٹ کو اس میں دخل نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ یہ تاثیر کسی انسانی کلام میں ممکن نہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ قرآن حضور علیہ السلام کا اپنا کلام نہ تھا، الٰہی کلام تھا۔

ثقل اور بوجھ | کلام الفاظ کا نام ہے جس میں بوجھ یا ثقل نہیں کیونکہ ثقل اجسام کا خاصہ ہے اور الفاظِ قرآن جسم نہیں، لیکن حضور علیہ السلام پر جب قرآن کا نزول ہوتا تھا تو اس کے نزول سے حضور علیہ السلام کی شخصیت اور ذات میں معجزانہ طور پر بوجھ اور ثقل پیدا ہوتا تھا۔ معمولی نہیں بلکہ بالکل زیادہ۔

۱۔ بخاری میں زید بن ثابتؓ نقل کرتے ہیں کہ:

کادت فخذی ان ترض۔ — قریب تھی کہ میری ران کی ہڈی بوجھ کے دباؤ سے ٹوٹ جاتی۔

۲۔ مستدرک حاکم تفسیر سورۃ مزمل میں صدیقہؓ نقل کرتی ہیں کہ حضورؐ اونٹنی پر سفر میں سوار جا رہے تھے کہ وحی قرآنی نازل ہوئی۔ اونٹنی وحی قرآنی کے بوجھ سے دب کر بیٹھ گئی۔ ظاہر ہے کہ زید بن ثابتؓ پر نزولِ قرآن سے قبل یہ اثر اور اسی طرح اونٹنی پر اثر نہ نزول کے بعد ہوا۔ جو صرف قرآنی نزول کا اثر تھا۔ یہ تاثیر قرآن میں بھی ذکر ہے۔

اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا (مزمل آیۃ ۵) — ہم ڈالیں گے اے پیغمبر تجھ پر بھارا اور بوجھل قول۔

جب یہ چیز قرآن اور حدیث میں بیان ہوئی اور عام مشاہدے میں آئی تو اگر یہ تاثیر واقعہ کے خلاف ہوتی تو کفار مخالفینِ قرآن ضرور اعتراض و انکار کرتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ تاثیر واقعی تواتر سے ثابت تھی۔ لیکن یہ تاثیر صرف قرآن سے وابستہ نہیں، بلکہ نزول بواسطۂ جبرئیل سے متعلق ہے۔ گویا وقتِ نزول اور جبرئیل کے فعل و عمل کو بھی اس میں دخل ہے۔ یہ تاثیر قرآن کا معجزہ ہے جو کسی کلامِ انسانی کو حاصل نہیں۔

۲۔ قرآن کی تاثیر شخصیتِ قلبی

قرآن کا اثر قلب صاحب قرآن نبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ تھا کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے حضورؐ کی فرمائش پر آپ کے سامنے قرآن کی تلاوت کی تو جب لوگوں نے دیکھا تو آپ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری تھے ۔ وَعَیْنَاهُ تَذْرِفَانِ ۔

۲۔ مطرف بن عبداللہ بن شخیر سے نقل ہے کہ رات کے وقت تہجد میں تنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پڑھتے تھے جب کہ کوئی موجود نہ تھا۔ مطرف فرماتے ہیں ۔ میں گذرا تو رونے سے آپ کا سینہ اس قدر جوش مارتا تھا جیسے دیگچی میں اُبلا ہوا پانی جوش مارتا ہو ۔ وَلِجَوْفِهِ اَزِيْزٌ كَاَزِيْزِ الْمِرْجَلِ ۔ کیا کسی بناوٹی کلام کا کسی بناوٹ کرنے والے پر رات کی تاریکی اور تنہائی میں ایسا اثر وارد ہو سکتا ہے ؟ یہ تاثیر کلام الہٰی ہونے کی دلیل ہے ۔

۳۔ تاثیرِ قالبی

قول میں تو چنداں تکلیف نہیں لیکن عمل میں بڑی مشقت ہے ۔ بناوٹی کلام دکھانے کے لئے ہوتا ہے ۔ صاحبِ بناوٹ خود اس پر مسلسل اور تکلیف دہ عمل نہیں کر سکتا تا وقتیکہ کوئی اس کو کلامِ الٰہی نہ سمجھے اور اس کے مضامین کو حق نہ سمجھے ۔ لیکن حضور علیہ السلام کے قالب اور بدن پر قرآنی احکام کا کیا اثر ہوتا تھا ۔ جب یہ آیت نازل ہوئی ۔

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۙ وَاِلٰى رَبِّكَ		اے پیغمبر! جب تو ضروری کام سے فارغ ہو جائے تو
فَارْغَبْ ؏	(الم نشرح آیۃ)	اپنے آپ کو خدا کی عبادت میں تھکاؤ اور اللہ کیطرف لَو لگاؤ۔

اس کے بعد صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ آپ رات بھر عبادت کرتے تھے یہاں تک کہ تَوَرَّمَتْ قَدَمَاهُ یعنی آپ کے قدم مبارک سُوجھ گئے ۔ (بخاری)

۲۔ بخاری میں ہے کہ صدیقہؓ سے حضور علیہ السلام کے اخلاق کے بارے میں سوال ہوا تو آپ نے فرمایا کہ پورا قرآن آپ کا خلق تھا ۔ جیسے ایک آدمی کے لئے اپنے خلق و عادت کو چھوڑنا ممکن نہیں اسی طرح حضور علیہ السلام کے لیے قرآنی احکام اخلاق و عادات بن گئے تھے ۔ جو کچھ قرآن میں تھا وہی آپ

کے عمل میں موجود تھا۔ کیا اس درجے کی قالبی وجسمانی وعملی تاثیر کسی انسان پر اس کی اپنی بناوٹی کتاب کی ممکن ہوسکتی ہے؟ اگر نہیں ہوسکتی تو یہ دلیل ہے کہ قرآن کلامِ الٰہی تھا اور حضور علیہ السلام خود اُس پر کلامِ الٰہی کی حیثیت سے سب سے زیادہ عمل کرنے والے تھے۔

قرآن کا سیاسی اعجاز

قرآن عرب میں نازل ہوا اور عرب تمام اقوام سے کمزور، بے علم اور بے ہنر تھے۔ سیاسی غلبہ حاصل کرنے کے اسباب ان میں موجود نہ تھے۔ سیاسی اقتدار اور غلبہ کے لئے پہلی چیز عددی کثرت ہے۔ دیگر اقوامِ عالم کی نسبت عرب کی تعداد بہت کم تھی۔ اس وقت کے عرب اور اُس وقت کے عرب میں بڑا فرق ہے۔ قرآن کے نزول کے وقت عرب صرف اس وقت کے سعودی عرب اور یمن کا نام تھا۔ عراق، شام، فلسطین، اردن، لبنان، بیروت، مصر وشمالی افریقہ یہ غیر عرب ممالک تھے، جو اسلامی فتوحات کے بعد عرب ممالک بن گئے۔ دوسری چیز جو سیاسی اقتدار کے لئے ضروری ہے وہ تعلیم ہے۔ لیکن عرب اُمیّین یعنی ناخواندوں کا ملک تھا۔ تیسری چیز اتفاق اور وحدت لیکن عرب کا ہر قبیلہ دُوسرے کا دشمن تھا خود انصار مدینہ کے دو مشہور قبیلے اوس وخزرج ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اتفاق واتحاد کا تصوّر بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ چوتھی چیز صنعت۔ عرب میں نہ کوئی صنعت تھی اور نہ کارخانہ۔ تلوار تک کے لئے اور معمولی پوشاک کے لئے وہ ہندوستان اور شام کے عیسائیوں کے محتاج تھے۔ پانچویں چیز زراعت اور غذائی کفالت ہے۔ کھجور کے سوا خوراک کے لئے وہ غیر اقوام کے محتاج تھے کیونکہ ان کا اپنا ملک زراعتی ملک نہ تھا۔ قرآن نے خود اس کو وَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ فرمایا۔ چھٹی چیز معدنی دولت۔ اس وقت عرب میں کسی معدنی دولت کا وجود نہ تھا۔ جو کچھ ہمیں اب نظر آرہا ہے وہ دورِ حاضر کی پیداوار ہے۔ ساتویں چیز جسمانی قوت۔ عرب گرم ملک تھا۔ ضروری غذا بھی میسر نہ تھی۔ پانی کی بھی کمی تھی۔ سردی گرمی سے بچنے کے لئے مکانات نہ تھے۔ اکثر آبادی خانہ بدوشوں اور جُواریوں میں گذارہ کرتی تھی۔ علاج کا بھی کوئی انتظام نہ تھا۔ آٹھویں چیز روحانی واخلاقی قوّت ہے جو توحید کے اعلیٰ اور پاکیزہ تصور سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن عرب آبادی پتھروں یا پتھروں

سے تراشے ہوئے بتوں کی پرستش کرتی تھی۔

یہ وہ حالات تھے جس میں قرآن کا عرب میں ظہور ہوا اور عرب نے بالاتفاق اس روشنی کو مٹانے میں اپنی قوتیں صرف کیں۔ دو اڑھائی سال سے زیادہ وقت قرآن کو آزاد اشاعت کے لئے نہ مل سکا۔ لیکن اس قلیل مدت میں قرآن نے عرب کو کہاں سے کہاں تک پہونچا دیا۔ اس کا اندازہ عرب قبل القرآن اور عرب بعد القرآن کے درمیان موازنہ کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ عرب قبل القرآن وہی تھا جو ہم نے ذکر کیا لیکن عرب بعد القرآن ایسی قوم بن گئی جو تنظیم، اتحاد، اخلاق، بلند خیالی، اولوالعزمی، ایثار و قربانی، خدا پرستی، شجاعت، سخاوت، عفت، پاک دامنی، رحم و شفقت، عقل و تدبیر، جہاں بانی، جہانگیری، دیانت و امانت، صدق و راستی، پابندیٔ عہد، عدل و انصاف میں کوئی قوم اُن کی ہمسر نہیں تھی، بلکہ پوری تاریخ بشریت اس کی نظیر پیش کرنے سے خالی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ان آٹھ کمزوریوں کے باوجود — جو ہم نے ابھی ذکر کیں — وہ دنیائے شرق و غرب کے دو عظیم متمدن اور بے انتہا ساز و سامان رکھنے والی سلطنتوں سے بہ یک وقت ٹکرائی، یعنی کسریٰ و قیصر کی سلطنتوں سے جو پوری دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں لیکن انہوں نے بہت کم وقت میں ان دونوں حکومتوں کو غبار بنا کر رکھ دیا اور ان کے باعظمت تاج و تخت کے پرخچے اُڑا دیئے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ سیاسی غلبہ جو عرب کو حاصل ہوا اور رفتہ رفتہ جس کی طوفانی موجیں مشرق میں کاشغر اور دیوارِ چین سے ٹکرائیں اور مغرب میں مراکش اور فرانس تک — یہ کس چیز کا نتیجہ تھا۔ سیاسی اقتدار و غلبہ کے لئے دو قسم کے اسباب ہو سکتے ہیں:۔

ایک مادی اور دوم رُوحانی اور غیبی۔

مادی اسباب تو عرب کو حاصل نہ تھے بلکہ عرب کے دشمنوں اور حریف قوتوں کو حاصل تھے۔ اگر مادی اسباب پر سیاسی تغلب کا فیصلہ ہوتا تھا تو یہ ضروری تھا کہ عرب صفحۂ ہستی سے مٹ جاتے، اور نتیجہ بالعکس ظاہر ہونا چاہیئے تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ اس غیبی و رُوحانی قوت سے ہوا جو عرب کو قرآن اور صاحبِ قرآن علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بدولت نصیب ہوتی اور ظاہر ہے کہ اس قسم کی معجزانہ قوت بغیر الٰہی کتاب کی قوت کے ممکن نہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ قرآن کلامِ الٰہی ہے اور جس ذاتِ اقدس

پر اس کتاب کا نزول ہوا وہ خدا کے اکمل ترین رسول اور خاتم النبیین تھے۔ مسلمانوں کے موجودہ زوال کا سبب ترکِ عمل ہے کہ انہوں نے اسلام اور قرآن پر عمل ترک کر دیا ہے۔ ورنہ اسلام اور قرآن اس دور میں بھی مسلمانوں کی تمام کمزوریوں کا علاج ہے۔ قرآن کا نسخہ ہزار سال سے زائد عرصے کا آزمودہ اور تجربہ شدہ ہے۔ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ[1] قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ[2]۔ لیکن کوئی مجرب سے مجرب نسخہ کاغذی اور قولی شکل میں اپنا صحت مندانہ اثر نہیں دکھلا سکتا، تاوقتیکہ اس پر عمل نہ ہو۔ یورپ کے مستشرقین اس راز کو خوب جانتے ہیں کہ اگر مسلمانوں نے اسلام اور قرآن کی طرف رجوع کیا تو نوّے کروڑ مسلمان متحد ہو جائیں گے، ایک مرکز کے نیچے آجائیں گے، اُن کی منتشر قوتیں اور ذرائع ترقی یک جا ہو کر وہ دنیا کی اوّل نمبر طاقت بن جائیں گے اور ہمارے ہاتھ سے یہ شکار نکل جائے گا۔ اس لئے انہوں نے مسلمانوں کو اسلام و قرآن سے ہٹانے کی کوششیں ایک مدت سے شروع کیں اور یہ کہا کہ مسلمانوں کا زوال اسلام اور قرآن کی وجہ سے ہے۔ اگر وہ مغرب کی گندہ اور خدا بیزار تہذیب اختیار کریں گے، تو اُن کو ترقی نصیب ہوگی، جس کی وجہ سے اسلامی ممالک میں قدیم و جدید جنگ جاری ہے اور روز بروز مسلمانوں میں انتشار اور مرکز گریز جذبات پرورش پا رہے ہیں۔ ہم نے اپنی دو کتابوں "ترقی اور اسلام" اور "اشتراکیت اور اسلام" میں اس مسئلہ کو پورا حل کیا ہے۔ جس کی رُوح دو چیزیں ہیں، وہ یہ کہ یورپ کی صنعت اور ہنر اور علم، اور چیز ہے اور یورپ کی طرزِ زندگی، معاشرت اور تہذیب دوسری چیز ہے۔ پہلی چیز اسلام کی ہے جس پر یورپ نے قبضہ کیا ہے یعنی ان کی صنعت کاری لے لو اور دوسری چیز یورپ کی گنہگاری ہے اُس کو چھوڑ دو۔ اِس پر تعلیمِ قدیم والوں کو کوئی اعتراض نہیں کیونکہ وہ اسلام کے ساتھ فِٹ ہے۔ فِٹ کرنے کی ضرورت نہیں۔ دلائل میری دیگر کتابوں میں ہیں۔ اور یورپی تہذیب کی گنہگاریاں چھوڑ دو، کہ وہ اسلام اور ترقی دونوں کے خلاف اور خود یورپ ان کی وجہ سے مبتلائے انحطاط ہے اور حالتِ نزع میں ہے۔ اس طرح ہماری خانہ جنگی ختم ہو سکتی ہے اور تعلیم قدیم و جدید کے دونوں بازو پروازِ ترقی کے لئے ضروری ہیں، دونوں طبقوں کو ملاؤ نہ کہ لڑاؤ۔

---

[1] سورۃ بنی اسرائیل آیۃ ۸۱ [2] سورۃ حم السجدۃ آیۃ ۴۴

۵- دلیلِ غذائی

انسان دو جزء سے مرکب ہے۔ جسم اور روح۔ دونوں چونکہ اس عالم تغیر اور جہانِ کون و فساد میں آباد ہیں اس لئے تغیر پذیر ہیں۔ اس لئے تاوقتیکہ دونوں کے لئے غذا کا انتظام نہ ہو تو ان کا باقی رہنا ناممکن ہے۔ اس لئے قدرت نے بقاء جسم و بدن کے لئے بھی غذاء کا انتظام کیا ہے تاکہ بدن فناء سے محفوظ ہو اور بدن کی تخلیق سے جن فوائد کا تعلق ہے، ان میں خلل واقع نہ ہو، اور رُوح کی غذا کے لئے بھی تاکہ روح کو حیات حاصل ہو اور وہ اپنے تخلیقی مقاصد کو پورا کر سکے۔ قدرت نے بدنِ انسانی کی غذاء کا ایسا وسیع پیمانہ پر انتظام کیا ہے کہ زمین سے لے کر آفتاب و مہتاب تک اس کی تیاریِ غذا میں مصروف کار ہیں مثلاً روٹی بدن کی غذاء ہے۔ زمین اپنی قوتِ نامیہ سے گندم اُگاتی ہے۔ پانی اور ہواء اس کو سرسبز رکھتے ہیں۔ ستاروں کی کشش سے اس کو نشوونما حاصل ہوتی ہے۔ سورج اپنی شعاعوں سے بخاراتِ سمندر اُڑا کر بادل تیار کر کے بارش کی تیاری کرتا ہے اور اپنی گرمی سے وہ گندم کے دانوں کو پُختہ کرتا ہے۔ ہوائیں بھوسے اور دانے کو جُدا کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ دن رات کا تعاقب ان میں اعتدال پیدا کرتا ہے گویا پورا کارخانۂ عالم گندم بنانے میں مصروف ہے تاکہ بدنِ انسانی کی خوراک مہیا ہو۔ حالانکہ روح کی نسبت بدن کی قیمت بہت کم اور نسبتاً اس کا درجہ روح سے بہت پست ہے۔ جب اس پست جزء کی غذاء کی فراہمی کے لئے اس قدر عظیم اور وسیع انتظام قدرت کی طرف سے موجود ہے، تو یہ ناممکن ہے کہ رُوح کی غذاء کے لئے کوئی انتظام نہ ہو۔ ایسا ہونا حکمت اور عقل دونوں کے خلاف ہے۔ بدن چونکہ زمینی ہے لہٰذا اس کی غذاء کا سامان بھی زمین سے کر دیا گیا اور رُوح آسمانی اور امرِ ربّی ہے اسی وجہ سے اس کی غذاء کا سامان عالمِ بالا سے ہونا ضروری ہے کیونکہ رُوح خود عالمِ بالا کی چیز ہے۔

رُوح کی غذاء آسمانی اب وہ غذاء روحانی کونسی ہے جو قدرت کی طرف سے رُوح کی نشوونما اور حیات کے لئے تجویز کی گئی ہے اور قدرت کی طرف سے اس کی روحانی حیات کو اس سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔ روح نہ بچونی اور بے چگونی اللہ سے مناسبت اور مشابہت رکھتی ہے۔ لہٰذا اللہ کی

طرف سے ایسی چیز جو اللہ کی ذات سے مربوط ہو اور اسی کی صفت سے ہو۔ وہی روحانی حیات کی غذا ہو سکتی ہے۔ اللہ کی ذات اور صفات میں صرف اللہ کی صفتِ کلام ایک ایسی چیز ہے جو روحِ انسانی کی طرف منتقل ہو کر حیاتِ روحِ انسانی کا ذریعہ بن سکتی ہے اور کلامِ الٰہی اور وحیِ ربانی کے بغیر انسانی روح کی حقیقی حیات ناممکن ہے۔ جیسے غذاء جسمانی کے بغیر جسم کی حیات ممکن نہیں۔

حیاتِ رُوحانی کا معیار | روح کی حقیقی حیات کا معیار کیا ہے؟ وہی جو کسی جسمانی عضو کی حیات کا معیار ہے اور موت روح کا معیار بھی وہی ہے جو کسی انسانی عضو کی حیات و موت کا معیار ہے۔ اب یہ فیصلہ کہ واقعی کلامِ الٰہی یا قرآن غذاء روحانی ہے۔ اس کا فیصلہ بھی غذاء کے مقررہ معیار سے ہوگا۔

معیارِ غذائیت | غذائیت کا معیار دو امر ہیں۔ ۱۔ میلانِ طبعی۔ ۲۔ ترقی اور نشو و نما

مثلاً روٹی گوشت جسمانی غذا ہے اور لوہا اور لکڑی جسمانی غذاء نہیں۔ دونوں میں معیار ممیزیہ ہے کہ روٹی اور گوشت کی طرف طبعی میلان انسان میں موجود ہے اور لوہے اور لکڑی کی طرف طبعی میلان نہیں۔ کوئی نہیں چاہتا کہ لکڑی اور لوہے کو گندم کی طرح پیس کر یا بُرادہ بنا کر کھالے۔

دوم معیار یہ ہے کہ اگر روٹی یا گوشت کھائے تو بدن کی ترقی اور نشو و نما ہوگی لیکن لوہے اور لکڑی سے نشو و نما بدن کی نہ ہوگی بلکہ الٹا نقصان ہوگا۔ اسی طرح قرآن کی طرف طبعی میلان بھی موجود ہے۔ جس کی وجہ لاکھوں حافظ طویل عُمر صرف کرکے اس کو حفظ کرتے ہیں اور عمر بھر اس کا بغیر کسی دنیوی فائدے اور کشش کے اس کا دور و تکرار کرتے ہیں اور اس قرآن کے علم و عمل سے روح میں ایسی حقیقی زندگی پیدا ہو جاتی ہے کہ مُٹھی بھر انسان ہزاروں پر غالب آجاتے ہیں۔ جیسے ہم نے سیاسی اعجاز میں بیان کیا۔ اگر قرآنی غذاء سے روح محروم ہوگی تو حیاتِ روحانی ختم ہوگی اور حقیقی زندگی سے محروم ہوگی۔ جس طرح بدنی غذاء کے نہ ہونے سے بدن کو موت آجاتی ہے اور حیات ختم ہو جاتی ہے۔

موت و حیاتِ رُوح | ہر چیز کی حیات اس کے مقصدِ تخلیق سے معلوم کی جا سکتی ہے۔

۱۔ آنکھ کی تخلیق دیکھنے کے لئے اور کان کی تخلیق سُننے کے لئے ہے۔ آنکھ جب دیکھ نہ سکے اور کان جب سُن نہ سکے تو یہ دونوں کی موت ہے۔ روح کی تخلیق معرفتِ الٰہی کے لئے ہوئی۔ جس وقت یہ مقصد

حاصل ہو تو روح زندہ ہے ورنہ مُردہ ہے۔

۲۔ معرفتِ الٰہی اور تعلق مع اللہ سے روح میں ایک عظیم قوت منتقل ہوتی ہے۔ جس کا مقابلہ وہ روحیں نہیں کرسکتیں جو اس قوت سے خالی ہیں۔ اِسی قوت کا نام حیاتِ رُوحانی اور اس کے فقدان کا نام موتِ رُوحانی ہے۔ اسی حیات کو قرآنِ حکیم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا	اے ایمان والو! اللہ اور رسول کا کہا مانو جب
لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا	وہ تم کو ایسی چیز کی طرف بُلاتے ہیں جو تم کو
يُحْيِيْكُمْ ط (الانفال آیۃ ۲۴)	زندگی عطا کرتی ہے۔

جس سے معلوم ہوا کہ یہ رُوحانی زندگی جسمانی زندگی سے بلند تر زندگی ہے۔ اسی رُوحانی حیات کی برکت و قوت سے صحابہ کرامؓ نے اپنے سے چند گناہ زیادہ تعداد کے لشکروں کو شکست دی اور باوجود بے سر و سامانی وہ حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے جو صرف جسمانی زندگی رکھنے والوں کے لئے ناممکن تھے۔ یہ زندگی اُن کو قرآن اور اسلام سے حاصل ہوئی۔ ابنِ جریر طبری نے اپنی تفسیر میں وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ ط (آل عمران آیۃ ۱۰۳) کے تحت حضرت قتادہ نے اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کیا ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ عرب تمام لوگوں سے زیادہ ذلیل اور تنگدست تھے اور سب سے زیادہ گمراہ تھے۔ ان کے پاس نہ پوشاک تھی نہ خوراک۔ وہ دو زبردست شیروں کے درمیان بندھے ہوئے تھے۔ یعنی فارس و روم۔ ان کے پاس کوئی قابلِ رشک چیز نہ تھی۔ وہ خوراک کھانے سے محروم تھے۔ اور پڑوسی قومیں ان کو کھاتی رہیں، یہاں تک کہ اسلام آیا اور اسلام نے ان کو ایک کتاب دی (قرآن) جس نے ان کو قوموں کا حاکم بنا دیا۔

قرآن غذائے رُوحانی ہے | غذا کے لئے ہم نے دو معیار بیان کئے ہیں۔ طبعی میلان اور ترقی۔ قرآن کی طرف میلان کا تو یہ حال ہے کہ روحیں اسی کی طرف کھچی جارہی ہیں اور دنیا کی کسی کتاب کو اس قدر نہیں پڑھا جاتا جس قدر اس کتاب کو۔ دنیا کی کسی کتاب کے اتنے حافظ موجود نہیں جس قدر قرآن کے حافظ دنیا میں موجود ہیں۔ حالانکہ قرآن کو حفظ کرنے پر حفاظ کو نہ مسلمانوں کی طرف سے کوئی معاوضہ ملتا ہے،

اور نہ قوم کی طرف سے۔ اور پھر قرآن کی زبان غیر عربوں کے لئے اجنبی زبان ہے جس کی طرف بلا مجبوری کسی کو طبعاً کشش بھی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کو پڑھنے والے اور اس کو یاد کرنے والوں کی تعداد تمام دنیا کی کتابوں سے بڑھ کر ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ قرآن روحانی غذا ہے۔ اسی لئے اس کی طرف یہ کشش پائی جاتی ہے۔ دُوسری چیز کہ غذا سے مغتذی کو ترقی اور بالیدگی حاصل ہوتی ہے، تو قرآن کی تاریخ بتاتی ہے کہ قرآن کی برکت سے کمزور انسان طاقتور ہوئے بے اخلاق با اخلاق بن گئے۔ پست بلند اور ناپاک پاک ہو گئے۔ جس کے بعد کسی کو اس امر میں شک نہیں رہتا کہ قرآن آسمانی غذا ہے جو روح کے لئے آسمان سے اُتاری گئی اور اُس نے قرآن پر یقین رکھنے والوں کو وہ عظمت اور شان بخشی، جس کی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ یہی شان کلامِ الٰہی کی ہو سکتی ہے

۶- دلیلِ نظامی

قرآن حکیم نے انسانی زندگی کے لئے وہ نظام قائم کیا ہے جس سے خود یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ یہی کتاب خالقِ انسان کی طرف سے ہے، انسان کا بنایا ہوا نہیں کیونکہ حیاتِ انسانی کے اسرار و رموز صرف خالقِ حیات ہی جانتا ہے نہ کوئی اور۔ انسان نے جب بھی اس راہ سے ہٹ کر کسی انسانی لائحہ حیات پر چلنے کی کوشش کی تو اس کو امن اور چین نصیب نہیں ہوا۔ قرآن کا نظامِ حیات تو اس قدر کامل اور زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے کہ اگر اس کو تفصیل سے بیان کیا جائے تو ایک اچھی خاصی بڑی کتاب بن جائے گی۔ اس لئے ہم صداقتِ قرآن کے زاویہ نگاہ سے صرف چند بنیادی اصول پیش کرتے ہیں۔ انسانی زندگی کے بنیادی اصول حسبِ ذیل ہیں۔

۱- انسان کا خالقِ کائنات سے تعلق۔
۲- انسان کا خود اپنے ہم جنس انسانوں سے تعلق۔
۳- انسان کا کائناتِ عالم سے تعلق۔
۴- انسان کا مقصدِ حیات

۵۔ انسانی زندگی کی آخری منزل۔

پہلا اصول ـــــ انسان کا خالق کائنات سے تعلق

خالقِ کائنات انسانی زندگی کا مرکز ہے۔ انسان کی زندگی اور لوازمِ زندگی، ظاہری و باطنی فوائدِ حیات کا آخری فیصلہ اس کی مشیّت سے وابستہ ہے۔ انسان کا اپنے مرکزِ حیات سے کٹ جانا موت ہے اور اسی سے جُڑ جانا حقیقی زندگی ہے۔ اس لئے انسان کا اوّلین فرض یہ ہے کہ خالقِ کائنات کے آگے اپنی اس حیثیت پر یقین رکھے۔ قرآن نے پہلے انسان کی اس حیثیت کو نمایاں کرنے کے لئے ارشاد فرمایا:۔

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ ط (سورہ ملک آیۃ ۲) یعنی خالقِ کائنات انسان کی موت و حیات کا خالق ہے

پھر اعلان کیا:۔

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللهِ ط (سورہ النحل آیۃ ۵۲) انسان کو جس قدر نعمتیں حاصل ہیں وہ خالقِ کائنات ہی کی بخشش ہے۔

پھر ارشاد فرمایا کہ وہ اپنی سعی و عمل اور جد و جہد سے جو کچھ حاصل کرتا ہے اس کا آخری فیصلہ بھی قدرت کے ہاتھ میں ہے اس کو اپنی کوشش پر نازاں نہیں ہونا چاہیئے۔ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللهُ ط (التکویر آیۃ ۲۹)

خود سیّد الکائنات کی زبان سے قرآن نے یہ اعلان کرا دیا:۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِىْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللهُ ط (سورۃ اعراف آیۃ ۱۸۷) اعلان کر دو کہ میں اپنی ذات کے لئے بھی سود و زیاں کا اختیار نہیں رکھتا تاوقتیکہ قدرت کی مشیت اسکا فیصلہ نہ کر دے۔

ان تصورات کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ (۱) انسان کو رب العالمین سے ایک مضبوط رشتۂ محبت پیدا ہو جاتا ہے جو کبھی نہیں کٹتا

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ط (البقرہ آیۃ ۱۶۴) ایمان اور یقین والوں کو سب سے زیادہ محبت اللہ سے ہوتی ہے

اسی محبت کا اثر ہوتا ہے کہ اس کی فکری و عملی زندگی اللہ کی مرضی سے مربوط ہوتی ہے اور اس کا ظاہر و باطن اپنے خدا کے آگے سرنگوں ہوتا ہے اور ظاہر و باطن یادِ الٰہی سے معمور ہو جاتا ہے وہ اگر کائنات پر نظر ڈالتا ہے تو اس کو آئینہ جمالِ محبوب سمجھ کر ڈالتا ہے۔

يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّ — وہ اُٹھتے بیٹھتے لیٹتے یادِ الٰہی میں مشغول ہوتے
عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ — ہیں اور دل و دماغ سے مخلوقاتِ زمین و آسمان
خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا — پر اس تصور کے تحت نگاہ ڈالتے ہیں کہ اے خالقِ عالم
مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ط — تو نے یہ عالم بلا مقصد نہیں بنایا۔ (آل عمران آیۃ ۱۹۰)

اور وہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے تصور کے تحت صرف رب العالمین کو دین و دنیا کی کامیابیوں کا سرچشمہ سمجھتے ہیں اور اعتقادی، قولی اور عملی عبادت بھی اُسی کی کرتا ہے اور مشکلاتِ دین و دُنیا کے حل کے لئے بھی جدوجہد کی تکمیل کے بعد اسی سے امداد طلب کرتا ہے۔ وہ اپنی رضا کو رضاءِ الٰہی میں مدغم کر دیتا ہے اور مامورات اور منہیاتِ الٰہیہ یعنی خدا کے احکام کی تعمیل کو اپنی زندگی کا لازمی جزو بنا دیتا ہے خود قرآن حکیم اپنے فیض یافتگان کی اس حالت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ — اللہ نے محبت ڈال دی تمہارے دل میں ایمان
وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ — کی اور کھپا دیا تمہارے دلوں میں اور نفرت ڈال
الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ط — دی تمہارے دل میں کفر، گناہ اور نافرمانی کی یہی
اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ط — لوگ ٹھیک راہ پر ہیں۔ (حجرات آیۃ ۷)

یہی وہ چیز ہے جس سے انسان کو اپنے خالقِ کائنات اور مرکزِ حیات سے ربط پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ربط وہ چیز ہے جس سے انسان کے قلب اور دل و دماغ کو اطمینان اور چین نصیب ہوتا ہے اور تمام دنیاوی پریشانیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ط (الرعد آیۃ ۱۲)

دُوسرا اصول — انسان کا دیگر انسانوں سے تعلق

انسان کی زندگی چونکہ تمدن اور اجتماعیت پر مبنی ہے اس لئے انسان تمام دیگر حیوانات کے برخلاف منفرد زندگی نہیں گذار سکتا۔ اس کو اپنی زندگی کی ضروریات کے لئے دوسرے انسانوں سے امداد لینا پڑتی ہے حجامت کے لئے حجام کا، پوشاک کے لئے کپڑے بُننے والے کا، برتن کے لئے برتن بنانے والے کا، مکان کے لئے معمار کا اور علاج کے لئے طبیب ڈاکٹر کا محتاج ہے۔ علیٰ ہذا القیاس وہ اپنی بے شمار ضرورتوں کے لئے

بے شمار دیگر انسانوں کی امداد کا محتاج ہے۔ اس لئے جب تک اس کو دیگر انسانوں سے ربط اور تعلق نہ ہو، وہ اپنی زندگی قائم نہیں رکھ سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ انسانوں کے درمیان تعلق باہمی کے عمدہ اصول ہوں جن پر چل کر انسان اپنی اجتماعی زندگی کے فوائد سے نفع اندوز ہو سکیں۔ قرآن حکیم نے حقوق انسانی کے متعلق ایسے واضح احکام اور جامع ہدایات دیئے ہیں کہ جن پر چل کر انسان کی اجتماعی زندگی نہایت خوشحال اور پُرامن بن سکتی ہے۔ تفصیلات کی گنجائش نہیں۔ اصولی رنگ میں قرآن نے انسان کی اجتماعی زندگی کے چند اصول قائم کئے ہیں۔

ا۔ وحدتِ بشری کا اعتقاد کہ تمام انسانی اقوام باوجود اختلافِ رنگ و نسل و وطن کے ایک ہی کنبہ اور ایک ہی خاندان ہے۔ لہٰذا ایک انسان کو تمام افراد انسان کے ساتھ وہی سلوک برتنا چاہیئے جو وہ اپنے خاندان کے ایک فرد سے برتتا ہے کیونکہ کل افرادِ انسانیہ ایک ماں باپ آدم وحوّا کی اولاد ہے۔

ب۔ نسل اور رنگ اور ملک کا اختلاف تعارف کے لئے ہے، تقاتل اور لڑنے کے لئے نہیں۔ کسی شخص کا ایک قوم یا ملک سے منسوب ہونا اس کی شناخت اور معرفت کا ذریعہ ہے، نہ یہ کہ اُس سے نفرت کی جائے اور جنگ کی جائے۔

تیسرا اصول ــــ انسان کا کائناتِ عالم سے تعلق

انسان کا کائناتِ عالم سے تعلق مخدوم اور خادم کا ہے۔ پوری کائنات انسان کی خدمت میں مصروف ہے۔ سفلیات میں سب عناصر زمین، باد، آب، آگ۔ جوّیات میں بادل، بارش۔ علویات میں آفتاب و ماہتاب و سیارگان سب اپنے اپنے درجہ میں انسان کی ضروریاتِ حیات کی فراہمی میں مصروف ہیں، انسان کو معلوم ہو یا نہ ہو۔ یہی حال حیوانات، نباتات اور معدنیات کا ہے، جس میں ہر ایک کے فوائد کی تحقیق ایک مستقل علم ہے۔ اسی حقیقت کا قرآن حکیم نے ان الفاظ میں اعلان کیا ہے

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ط — زمین اور زمین کی کل چیزیں اے انسان تمہارے فائدے کے لئے بنائی گئی ہیں۔ (بقرہ آیۃ ۲۸)

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ — اے انسان! تمہاری خدمت اور نفع رسانی میں

وَ مَا فِی الْاَرْضِ ط (الجاثیہ آیۃ ۱۲) لگا رکھی ہے ہم نے آسمان اور زمین کی کائنات۔

کائنات کے اس تعلق کے معلوم کرنے سے انسان پر چند حقیقتیں روشن ہو جاتی ہیں۔

ا۔ کہ عالم کی ہر چیز علوی ہو یا سفلی، اس میں انسانی فوائد مضمر ہیں اور انسان کو چاہیئے کہ وہ ان فوائد کی جستجو کر کے حاصل کر لے۔ جس سے انسان کی انا میں حاکمیت علی الکائنات اور تسخیرِ کائنات کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے دنیوی علوم کے دروازے اس پر کھل جاتے ہیں اور انسان اور کائنات کے درمیان افادہ اور استفادہ کا ربط پیدا ہو جاتا ہے اور انسان میں ان فوائد کی تحصیل کی جدوجہد پیدا ہو جاتی ہے اور علومِ کونیہ کے ذریعے ان فوائد پر قبضہ کر کے انسان ان فوائد کی حکمتِ تخلیق کو پورا کر دیتا ہے۔

ب۔ دوم نتیجہ اس تعلقِ عالمی کا یہ ہوتا ہے کہ انسان خود کو حاکم اور مخدوم اور کائنات کو محکوم اور خادم سمجھ لیتا ہے لہٰذا وہ دنیاوی فوائد کو شرفِ انسانیت کا خادم، محکوم اور تابع بنا دیتا ہے اور شرفِ انسانی کو ان فوائد کا خادم یا محکوم نہیں بناتا اور وہ اس نظریہ پر عامل ہوتا ہے کہ ؎

"جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے"

اسی بنا پر وہ دنیا کو شرف انسان کی تکمیل کا ذریعہ بناتا ہے۔ شرفِ انسانی کو دنیا پر قربان نہیں کرتا۔ وہ زر و مال کا حاکم ہوتا ہے، زر و مال کا بندہ و غلام نہیں ہوتا۔ اس اصول سے اس کی خودی بلند ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی روحانی شخصیت (انا) کی عظمت کا معترف ہو جاتا ہے اور دنیوی خسیس اغراض کے لئے شرفِ انسانی کو داغ نہیں لگاتا۔

ج۔ کائناتِ عالم کی تسخیر اور خادمیت کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان شرک سے محفوظ ہو جاتا ہے وہ اپنے اشرف المخلوقاتی اصول پر یقین رکھنے کے بعد مخلوقات کو اپنا خادم سمجھ کر اس کو معبود یا لائقِ پرستش و عبادت نہیں سمجھ سکتا کیونکہ مخدوم کبھی خادم کی عبادت نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس سے مرادیں وابستہ کر سکتا ہے۔ اس لئے قرآن نے ان لوگوں کے حق میں جنہوں نے آسمانی یا زمینی معبود بنا رکھے تھے ارشاد فرمایا:۔

وَمَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ جن لوگوں نے مخلوق کی عبادت اختیار کی انہوں

مِنَ السَّمَآءِ ط (سورۃ حج آیۃ ۳۱) نے اپنے آپ کو شرف انسانی کے آسمان سے نیچے گرادیا
اسی تعلق کا اثر ہوتا ہے کہ انسان مخلوقات کی پرستش سے ہٹ کر صرف خالق کائنات ہی کا پرستار بن جاتا ہے اور یہی قرآنی تعلیم کا نتیجہ ہے۔

چوتھا اصول ــــ انسان کا مقصدِ حیات

انسانی زندگی کے بنیادی اصول میں سے چوتھا اصول یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے مقصد متعین کرنے کا عقدہ حل کر دے۔ سارے علوم سے اہم ترین علم یہ ہے کہ انسان کو اپنی حیات کا مقصد معلوم ہو۔ اور مقصد بھی اعلیٰ ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ انسان تمام مخلوقات میں سے اعلیٰ، برتر اور اشرف ہے اس لئے اُس کا مقصدِ حیات بھی ایسا ہو کہ انسان کے ساتھ اس کی کوئی مخلوق مقصدِ حیات میں ہمسر نہ ہو سکے۔ گائے بھینس، بکری کیوں اعلیٰ اور قیمتی ہیں کیونکہ ان تینوں کا جو مقصد ہے دودھ، اس میں بکری سے گائے، بھینس بڑھ کر ہے۔ گدھے سے گھوڑا قیمتی ہے کیونکہ گدھا، گھوڑے کے مقاصد کو پورا نہیں کر سکتا۔ اس معیار کے تحت جب انسان غور کرتا ہے تو سب سے پہلے جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ تمام وہ مخلوقات جو انسان کے ماسوا ہے یعنی غیر انسان، وہ انسان کے لئے ہے یعنی ان سب کے وجود کا مقصد انسان کی خدمت اور فائدہ رسانی ہے اور بس۔ اب رہ گیا انسان کے مقصدِ حیات کا سوال جو غور طلب ہے اور اس کا حل کرنا انسان کا سب سے اولین فریضہ ہے۔ یہ تو ناممکن ہے کہ کائنات میں معمولی چیزیں بھی مقصدیت سے خالی نہیں اور انسان جیسی عظیم ہستی کی تخلیق بلا مقصد ہو۔ ایسی صورت میں خالقِ کائنات کی حکیمی پر حرف آئے گا۔ لہٰذا تخلیقِ انسان ایک مقصد کے تحت ہے اور وہ مقصد ایک عظیم مقصد ہے۔ جیسے کہ خود انسان ایک عظیم ہستی ہے۔ وہ مقصد مادہ پرستوں کے نزدیک لذت ہے خواہ وہ لذتِ خوراک ہو یا لذتِ جاہ وعزت یا لذتِ حکومت۔ پہلی چیز مقصدِ حیات بننے کے قابل نہیں بلکہ ان میں سے کوئی چیز بھی اس قابل نہیں کہ اس کو انسان کا مقصدِ حیات قرار دیا جا سکے۔ لذتِ خوراک میں بہت سے حیوانات انسان سے بڑھ کر ہیں۔ مثلاً ہاتھی بھینس کہ انسان ان میں سے کسی کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتا نہ کمًا اور نہ کیفاً۔ یعنی نہ مقدار خوراک میں اور نہ لذت میں۔ مقدار میں ہاتھی وغیرہ کی خوراک

انسان سے زیادہ ہے اور جب مقدار زیادہ ہے تو لذت بھی زیادہ ہوگی۔ مثلاً اگر ایک آدمی صرف دو آم کھائے اور دوسرا آدمی بیس آم کھائے تو دوسرے آدمی کی لذت پہلے کی نسبت زیادہ ہوگی کیونکہ اُس نے زیادہ مقدار آم کی کھائی ہے۔ باقی رہا یہ معاملہ کہ ہاتھی اور انسان کی نوعیت طعام میں فرق ہے، ہاتھی گھاس گنا کھاتا ہے اور انسان پلاؤ۔ تو یہ بھی غلط ہے کہ جو ہمارے لئے پلاؤ میں لذت ہے یا کباب میں۔ ہاتھی کو اسی طرح کی لذت گھاس میں حاصل ہوتی ہے۔ خوراک اور اس کی لذت اضافی چیزیں ہیں۔ ہر ایک کا پلاؤ الگ الگ ہے۔ باقی رہی دوسری چیز جاہ وعزت۔ وہ بقول امام غزالیؒ وہمی چیز ہے۔ عزت مال کے لئے مطلوب ہے اور مال خوراک کے لئے۔ تو جاہ وعزت کا مقصد بھی خوراک ہے۔ وہ کوئی مستقل چیز نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس حکومت بھی بذاتِ خود مقصود نہیں، مال وجاہ کے لئے مقصود ہے اور مال وجاہ خوراک کی وجہ سے مقصود ہے اور خوراک کی مقصدیت کی تردید ہو چکی ہے۔ مزید برآں انسانی حکومت پُر از خطرات ہے، زوال پذیر ہے لیکن بعض حیوانات کو مثلاً شیر و دیگر حیوانات کو قدرتی حکومت دیگر جانوروں پر بغیر سعی وکوشش کے حاصل ہے جس میں ان کو نہ ووٹ طلب کرنے کی ضرورت ہے اور نہ عدمِ اعتماد کے ووٹوں کا خطرہ۔ تو اس وصف میں بھی شیر انسان سے فائق ہے۔ لذّتِ انسانی، مقصدِ حیات اس لئے بھی نہیں ہو سکتی کہ انسان کی مادی لذت ہموم وغموم اور مصائب وآلام سے پُر ہے۔ لیکن حیوانی لذت ان سب سے خالی ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو فطرتاً فکرِ ماضی اور اندیشۂ مستقبل عطا ہوئی ہے۔ اگر اس کے اقارب میں سے کوئی پہلے مر گیا ہو، اور کافی وقت گذرا تو شعور ماضی کے تحت اس کو یاد کر کے مغموم ہوتا ہے اور آنے والا خطرہ اگرچہ فی الحال موجود نہ ہو تو بھی انسان اُس کے تصوّر میں پریشان رہتا ہے کیونکہ حیوان کی نسبت انسانی شعور میں پائیداری ہے یہی وجہ ہے کہ انسان کی ہر مادی لذت حزن وغم کے ساتھ مخلوط ہے، خالص نہیں۔ لیکن حیوان کی ہر مادی لذت فکر ماضی اور اندیشۂ مستقبل سے پاک ہونے کی وجہ سے خالص ہے۔ اس لئے ایک مادی نظریہ کا انسان چاہے کسی بڑے مُلک کا پریزیڈنٹ ہو، اپنے مزعومہ مقصدِ حیات میں حیوانات سے بہت کم ہے اس لئے مقصدِ حیات کے متعلق مادی نظریہ قابلِ توجہ نہیں، بلکہ انسان کا صحیح مقصدِ حیات متعیّن کرنا خود انسان

کا حق نہیں، خالقِ انسان کا حق ہے۔ ہوائی جہاز کا مقصد اُس کا بنانے والا متعین کر سکتا ہے، نہ خود ہوائی جہاز۔ اسی مقصد کو قرآنِ حکیم نے صاف اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا — جن وانس کی تخلیق کا مقصد عبادت الہٰی ہے
لِيَعْبُدُونِ ۝ مَا أُرِيدُ مِنْهُم مِّن رِّزْقٍ — ہم نہ اُن سے روزی کمانا چاہتے ہیں، نہ
وَّمَا أُرِيدُ أَن يُطْعِمُونِ ؕ — کھلانا۔ (الذاریات آیۃ ۵۶-۵۷)

جیسے انسان اپنے غلاموں سے یہ دو مقصد پورے کرتا ہے۔ کیونکہ ہمیں نہ روزی کی ضرورت ہے نہ کھانے کی۔ ہم دونوں سے بے نیاز ہیں۔ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ ؕ بلکہ خدا نے پہلے سے انسانی مشین کو قائم رکھنے کے لئے روزی کا انتظام فرمایا، کہ وہ بڑا قوی اور زور والا ہے۔

اگر کسی مشین کو درست رکھنے کے لئے رنگ و روغن کی ضرورت ہے تاکہ وہ خراب نہ ہو اور درست حالت میں رہے تو وہ رنگ و روغن اس مشین کے وجود کا مقصد نہیں بلکہ مشین کے وجود کا مقصد وہ کام ہے جس کے لئے مشین ساز نے اس کو بنایا۔ یہی حال انسان اور اس کے رزق کا ہے۔ انسان کے لئے روزی بقار کا سامان ہے، مقصدِ تخلیق نہیں۔ مقصدِ تخلیق وہ ہے جس کے لئے خالقِ کائنات نے انسانی مشین کو پیدا کیا ہے یعنی عبادتِ الٰہی۔ روزی تیل و روغن کی طرح اس مشین کو درست رکھنے کا سامان ہے، مقصد نہیں۔ جس طرح دنیا کی ہر مشین کی قیمت اس کے مقصد سے متعین ہوتی ہے۔ مثلاً شوگر مل کی مشین وہی قیمتی سمجھی جاتی ہے جو کم وقت میں زیادہ چینی پیدا کرے۔ اسی طرح انسانی مشین کی قیمت بھی اپنے تخلیقی مقصد سے متعین کی جاتی ہے یعنی إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ؕ جو عبادتِ الٰہی اور تقویٰ میں ——— جو انسانی مشین کا مقصد ہے ——— زیادہ کامیاب ہو وہی انسان سب سے زیادہ قیمتی اور صاحبِ شرافت و کرامت ہے اور خالق کی نظر میں زیادہ مقبول ہے۔

پانچواں اصول ——— انسانی زندگی کی آخری منزل

انسانی زندگی کی آخری منزل معیتِ الٰہی ہے۔ انسانی زندگی متحرک ہے یا ساکن؟ قرآنِ حکیم نے

اس بات کا اعلان کیا کہ انسانی حیات متحرک ہے ساکن نہیں۔

یَا اَیُّھَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْہِ ؕ (الانشقاق آیۃ ۶)

اے انسان! تو تکلیف اٹھا اٹھا کر خالقِ کائنات کی طرف جا رہا ہے پس تو اس سے جا ملے گا۔

۱۔ اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ انسانی زندگی متحرک ہے۔

۲۔ اور اس زندگی کو اپنی حرکت میں تکالیف کا سامنا ہے۔

۳۔ اور یہ کہ اس حرکت کی آخری منزل، منبع اور سرچشمۂ زندگی یعنی خالقِ کائنات کی معیت ہے۔

پہلی چیز کہ انسانی زندگی متحرک ہے، وہ بالکل واضح ہے۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو ایک بچہ ہے پھر جوانی اور بلوغ تک برابر بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ اس کی زندگی کی ارتقائی حرکت ہے۔ پھر موت تک اس کی انحطاطی حرکت کا سلسلہ جاری رہتا ہے تاآنکہ موت کے بعد اس کی برزخی حرکت شروع ہو جاتی ہے۔ اس پورے عرصہ میں انسانی زندگی کو کئی قسم کے آلام و مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ حرکت اس طرح لازمی اور ضروری ہوتی ہے کہ کوئی انسانی طاقت اس کو روک نہیں سکتی اور ہر حالت میں حرکت جاری رہتی ہے۔ ارتقائی حرکت میں ارتقاء کو کوئی قوت روک نہیں سکتی اور بلوغ کے بعد انحطاطی حرکت کے لئے بھی کوئی روک نہیں علیٰ ہذا القیاس۔

اس جلی حرکت کے بعد قبر و برزخ کی خفی اور مستور حرکت کو بھی کوئی نہیں روک سکتا۔ ہر حرکت کے لئے ایک منزل ہوتی ہے، جس پر جا کر حرکت ختم ہوتی اور متحرک چیز وہیں پہنچ کر ساکن ہو جاتی ہے۔ وہی منزل انسانی زندگی کی منتہائے حرکت ہے۔ وہ منزل کیا ہے —— انسانی زندگی کے نتائج اور ثمرات کو پانا۔ دنیا میں ہر حرکت ایک عمل کا نام ہے۔ جس وقت عمل کا نتیجہ حاصل ہو جاتا ہے تو عمل کی حرکت ختم ہو جاتی ہے۔ ایک مزارع زمین تیار کرتا ہے۔ بیج ڈالتا ہے، اس کی آبپاشی کرتا ہے، کھاد دیتا ہے، حفاظت و نگرانی کرتا ہے۔ پک جانے پر اس کو کاٹتا ہے، مشین یا بیلوں سے اُس کو روندتا ہے، بھوسہ اور غلّہ الگ کرتا ہے۔ جب غلے کا خرمن اٹھا لیتا ہے تو اس کی حرکت ختم ہو جاتی ہے کیونکہ وہ نتیجۂ عمل اور منزل حرکت کو پا لیتا ہے اور منزل کے بعد حرکت کا ختم ہو جانا ضروری ہے ورنہ پھر وہ منزل کیسی ہوئی۔ یہی حال انسان

کا ہے۔ وہ اپنی متحرک زندگی میں تکلیف اُٹھا اُٹھا کر کرتا ہے۔ کوئی طاعت خیر اور نیکی کے لئے تکلیف اُٹھاتا ہے اور کوئی معصیت شر اور بدی میں جان کھپاتا ہے اور یہ تسلسل موت تک جاری رہتا ہے اور جب آگے چل کر جہانِ آخرت میں ہر دو طبقوں کو نتائج اعمال اور ثمراتِ حرکت حاصل ہو جاتے ہیں، ابرار و اخیار کے لئے جنت کی شکل میں اور اشرار و فجار کے لئے دوزخ کی شکل میں تو زندگی اپنا مقام و منزل پاکر ساکن ہو جاتی ہے، اور یہی منتہائے حرکتِ حیات ہے۔ مذکورہ آیت میں آگے ارشاد ہے جس میں نتائج اعمال کا بیان ہے۔

فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَٰبَهُۥ بِيَمِينِهِۦ ۙ	جس کو نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں ملا۔ سو
فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا ۙ	اس سے حساب لیں گے آسان۔ اور پھر
وَيَنقَلِبُ إِلَىٰٓ أَهْلِهِۦ مَسْرُورًا ۝ وَأَمَّا	آئے گا اپنے لوگوں کے پاس خوش ہو کر اور جس
مَنْ أُوتِيَ كِتَٰبَهُۥ وَرَآءَ ظَهْرِهِۦ ۙ فَسَوْفَ	کو نامۂ اعمال ملا پیٹھ کے پیچھے، وہ پکارے گا
يَدْعُوا۟ ثُبُورًا ۙ وَيَصْلَىٰ سَعِيرًا ۝ إِنَّهُۥ	آگ میں۔ وہ رہا تھا گھر میں بے غم۔
كَانَ فِىٓ أَهْلِهِۦ مَسْرُورًا ؕ	(الانشقاق آیۃ ۸ تا ۱۳)

انسان کی ان حالتوں کو قرآن نے اس آیت میں بیان کیا ہے۔

وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِى ٱلْأَرْضِ إِلَّا عَلَى	کوئی نہیں چلنے والا زمین پر مگر اللہ پر اس کی روزی
ٱللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا	اور جانتا ہے جہاں وہ ٹھہرتا ہے اور جہاں وہ
وَمُسْتَوْدَعَهَا ؕ (ہود آیۃ ٦)	سونپا جاتا ہے۔

اس آیت میں انسان کی تینوں حالتوں کا بیان ہے۔ دنیوی زندگی جہاں وہ زمین پر چلتا ہے اور حرکت کرتا ہے۔ آخرت کی منزل جہاں وہ ٹھہرتا ہے یعنی جنت یا دوزخ یہ مستقر ہے۔ قبر اور برزخ کی حالت جہاں اس کو سونپا جاتا ہے یہ مستودع ہے۔ آپ نے دیکھا کہ انسانی زندگی کے پانچ بنیادی اصولوں کو قرآن حکیم نے کس خوبی سے حل کیا ہے اور نظامِ حیاتِ انسانی کو کیسی عمدگی کے ساتھ پیش کیا کہ زندگی کے ان مسائل کو بڑے سے بڑا فیلسوف اور انسانی حکیم کے دماغ نے آج تک حل نہیں کیا

جو دلیل ہے کہ قرآن کلامِ الٰہی ہے۔

۷۔ دلیلِ شمولی

دلیلِ شمولی سے مراد چند ایسی چیزیں ہیں جو قرآن میں موجود ہیں اور انسانی کلام میں وہ جمع نہیں ہوسکتیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کلام انسانی نہیں، کلامِ الٰہی ہے۔ وہ چیزیں حسبِ ذیل ہیں

۱۔ جدتِ اسلوب :۔ یعنی قرآنِ حکیم کا طرزِ بیان تمام انسانی کلاموں سے مختلف ہے اور پورے ماحول میں اس کی نظیر نہیں۔ اگر یہ انسان کا کلام ہوتا تو انسان جو کچھ لیتا ہے اپنے ماحول سے لیتا ہے تو قرآن کا طرزِ بیان بھی عرب کے ماحول سے ماخوذ ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں۔ عرب میں اُس وقت سے لے کر اب تک بلکہ تمام زبانوں میں کلام کے تین طرز پائے جاتے ہیں۔

ا۔ کلام منظوم یعنی شاعری ب۔ کلامِ منثور مسجّع ج۔ کلامِ منثور غیر مسجّع

قرآن حکیم کا طرز تینوں طرزوں میں داخل نہیں اور دوست دشمن کو اس بات کا اقرار ہے۔ قرآن سبع معلقات یا دیوان حماسہ کی طرح شعر بھی نہیں کیونکہ ردیف، قافیہ وبحر وغیرہ کی اس میں پابندی نہیں، اور مقامات حریری کی طرح منثور و مسجّع بھی نہیں کیونکہ مسجّع کی پابندی اس میں موجود نہیں اور عام مصنفین کے کلام کی طرح منثور غیر مسجّع بھی نہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ زمین پر اس کلام کے طرز کا کوئی کلام موجود نہیں، تو معلوم ہوا کہ اس کا سرچشمہ انسانی اور زمینی نہیں بلکہ الٰہی اور آسمانی ہے

۲۔ انسانی کلام میں متکلم کے جذبات کو دخل ہوتا ہے۔ اسلئے انسان جب جذبۂ قہر کے تحت کلام کرتا ہے تو اس میں رحم کا پہلو نہیں ہوتا اور جب جذبۂ رحم کے تحت کلام کرتا ہے تو قہر کا پہلو نہیں ہوتا، کیونکہ انسانی جذبات میں اعتدال نہیں ہوتا۔ بخلاف قرآن حکیم کے اس میں مضامین التبشار و انذار، جنت و دوزخ اور قہر و رحم ایک ساتھ مذکور ہوتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا متکلم انسان کی طرح جذبات سے مغلوب ہستی نہیں۔ نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۙ وَاَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ (الحجر آیۃ ۴۹-۵۰) میں اعلانِ مغفرت و رحمت کے ساتھ ساتھ دردناک عذاب کا بھی ذکر کیا گیا۔ لیکن انسان غصہ کیوقت شفقت

اور شفقت کے وقت قہر و غصہ کی بات زبان پر نہیں لاتا۔

۳۔ ہر انسان کے کلام کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اس میں ضرور ایسے الفاظ ملیں گے جو کسی بیرونی دباؤ کے اثر کا نتیجہ ہوں گے اور ان سے یہ ظاہر ہوتا ہوگا کہ اس کلام کا متکلم خوف کے تحت ان الفاظ کو ادا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ انسانی کلام میں معمولی قوّۃ کا اظہار تو ہوتا ہے لیکن ایسی قوّۃ کا اظہار اُس میں نہیں ہو سکتا کہ جس سے آسمان و زمین پر حکومت کا ظہور ہوتا ہو۔ لیکن اگر کسی نے قرآن کا معمولی مطالعہ اگر کیا ہو تو وہ قرآن کے ہر صفحہ میں یہ محسوس کرے گا کہ یہ ایسے متکلّم کا کلام ہے جو کائناتِ عالم کی کسی چیز سے نہ دبتا ہے نہ ڈرتا ہے بلکہ عظیم ترین کائنات پر حکمرانی کرتا ہے اور حکم چلاتا ہے۔ طُوفانِ نوحؑ کی بندش کے سلسلے میں قرآنی الفاظ کو دیکھو کہ ان میں کس قدر زور ہے۔

يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ	اے زمین! نگل جا پانی کو اور اے آسمان!
اَقْلِعِيْ ۔ (ہود آیۃ ۴۴)	تھم جا برسنے سے۔

کیا انسانی قوّت یہ آرڈر دے سکتی ہے؟

۴۔ انسانی کلام اس کی دماغی قوّت کی محدودیّت کا مظہر ہوتا ہے۔ اُس کا اشہبِ بلاغت ہر میدان میں یکساں طور پر نہیں دوڑ سکتا۔ اس لئے اس کی قابلیّت مضامین کی ایک خاص قسم میں زورِ بلاغت دکھا سکتی ہے، لیکن دوسری قسم کے مضامین کے بیان میں اس کی بلاغت کا وہ زور نہیں ہوتا۔ عربی شعراء میں ابونواسؔ، خمریات یعنی شراب کی تعریف میں بہترین شعر کہہ سکتا ہے جو دوسرے مضامین میں نہیں کہہ سکتا۔ ابوالعتاہیہ، زہد، فناءِ دُنیا اور شوقِ آخرت کے مضامین کو پُر زور بلاغت کے ساتھ لکھ سکتا ہے، دوسرے مضامین کو اس انداز میں نہیں لکھ سکتا۔ فارسی شعراء فردوسیؔ نظامی جنگی مضامین پوری بلاغت کے ساتھ لکھ سکتا ہے لیکن میدانِ رزم کے سوا دوسرے میدان میں اُن کا وہ زور نہیں جو رزم میں ہوتا ہے۔ سعدی اخلاق کا شاعر ہے رزم کا نہیں۔ اگر خوش قسمتی سے کسی شاعر کو یہ مقام حاصل ہو کہ وہ ہر نوع کے مضامین بلیغ انداز میں لکھ سکتا ہو، تو پھر بھی یہ فرق باقی رہتا ہے کہ اپنے مخصوص دائرہ کے علاوہ دوسرے دائرہ مضامین میں اس کی بلاغت یکساں نہیں رہتی۔ اس کے علاوہ شعراء اور

بلغاء کا تمام انواع مضامین اور جملہ دوائر فکر مادیات کے احاطہ سے باہر نہیں۔ان سب میں غیبات اور ماوراء المادیات مضامین بہت کم ہوتے ہیں۔محسوسات میں شاعرانہ تخیلات کام دے سکتے ہیں لیکن غیبات میں تخیّل کی پرواز ختم ہو جاتی ہے۔ان سب امور کے علاوہ شعراء صدق اور واقعیت کے پابند نہیں تاکہ تخیل پر پابندی ہو بلکہ تخیّل جو نقشہ تیّار کرے اور جن الفاظ کا انتخاب کرے۔اسی کو شعر کے قالب میں رنگینی کے ساتھ ڈھال دیتا ہے۔اس لئے شعر کے متعلق بلغاء کا مقولہ ہے احسنہ اکذبہ۔بہترین شاعر وہ ہے جس کا مضمون سب سے زیادہ جھوٹا اور مبالغہ آمیز ہو لیکن قرآن حکیم کے مضامین کا ایک طرف تو دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں عبادات، معاملات قوانین منزلیہ، احکامِ معاشرت، قوانینِ مملکت، بین الاقوامی قوانین۔پھر عقائد، اخلاق، تاریخ، محسوسات، غیبات، واقعاتِ دُنیا، حقائقِ آخرت سب طرح کے مضامین ہیں اور دوسری طرف اس وسیع دائرہ مضامین کے لئے بیان کا دائرہ اسقدر تنگ ہے کہ کوئی مضمون اور عبارت واقعیت اور صداقت سے ذرا برابر تجاوز نہ کرنے پائے۔اس کے باوجود قرآن کے مختلف الانواع مضامین کا زورِ بلاغت، صدق اور واقعیّت کی شدید پابندی کے ساتھ یکساں ہے۔ان تمام میدانوں میں نہ قرآن کے زورِ بلاغت میں فرق آیا اور نہ کہیں صداقت کا رشتہ چھوٹا۔اس کی طرف قرآن نے اِن الفاظ میں توجہ دلائی۔

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللهِ	اگر قرآن خدا کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا، تو
لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ۝	اس کی شانِ بلاغت اور مضامین کی صداقت
(النساء آیۃ ۸۲)	میں ضرور فرق آجاتا۔

لیکن ایسا نہیں ہوا جو اس امر کی دلیل ہے کہ اس کلام کا سرچشمہ لامحدود قوّت ہے جو صرف خالقِ کائنات کی ہو سکتی ہے۔اور یہ قرآنِ حکیم کی صداقت اور من جانب اللہ ہونے کی دلیل ہے۔

دلیلِ غیبی

قرآن حکیم میں ایک بہت بڑا ذخیرہ غیبی علوم کا موجود ہے جس تک کسی بڑے فیلسوف اور اور عالم کی رسائی نہیں ہو سکتی، چہ جائیکہ ایک ناخواندہ قوم کی ناخواندہ ذات اس تک رسائی پاسکے۔ ایسے غیبی علوم کی کئی قسمیں ہیں:-

۱۔ گذشتہ اقوام اور انبیاء کی تاریخ اور اس کے نتائج اور ثمرات۔

۲۔ آنے والے واقعات یعنی امورِ مستقبلہ کی حقیقت سے قبل از وقت اطلاع دینا اور حقیقت بھی ایسی کہ جو نظر بر اسباب قابلِ یقین نہ ہو۔

۳۔ مابعد الموت اور مابعد الطبیعات امور کے متعلق ایسے حقائق بیان کرنا، جو ایک عظیم تر فلسفی اور فلاسفہ کی مجموعی قوت سے بھی بالا تر ہو۔

۴۔ گذشتہ انبیاء علیہم السلام میں سے آدم علیہ السلام، حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل و اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف، حضرت موسیٰ و ہارون، حضرت داؤد و سلیمان و عیسیٰ و یحییٰ و ذکریا علیہم و علیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام کے تاریخی واقعات اور ان سب حضرات کے مقاصدِ دعوت و تبلیغ اور ان سب حضرات کا مبعوث الیہم قوموں کے واقعات اور ان انبیاء علیہم السلام کی دعوت و ارشادات کے ان اقوام پر مخالف و موافق اثرات اور ان کے عواقب و نتائج اور ان نتائج کے علل و اسباب و عبر و نصائح، جس تحقیق اور حیرت انگیز صداقت اور بلاغت سے قرآن نے بیان کئے۔ اس کی مثال انسانی تحریر میں دستیاب نہیں ہو سکتی۔

ان واقعات کا ایک حصّہ تورات میں موجود تھا، اور کچھ حصّہ علماء تورات و تاریخ کے سینوں میں محفوظ تھا۔ لیکن صاحبِ قرآن علیہ السلام کی پوری زندگی میں ایک واقعہ بھی ایسا موجود نہیں کہ آپ کو کسی انسانی استاد سے استفادے کا موقعہ ملا ہو، یا استفادہ کیا ہو یا کم از کم کسی اُستاد سے

کہا ہو کہ مجھ سے حضور علیہ السّلام نے استفادہ کیا ہو۔ ایسے علوم کی باقاعدہ تحصیل کے لئے بالخصوص اُمّی اور ناخواندہ شخص کے لئے ایک کافی عرصہ اور ایک مسلسل تعلیم و تعلّم کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے کسی سے چند گھنٹوں یا منٹوں کی ملاقات کافی نہیں ہو سکتی۔ لیکن زمانۂ نبوّت میں دشمنانِ قرآن و نبوّت نے نہ تو کسی وقت آپ کے اُمّی ہونے سے انکار کیا اور نہ انبیاء اور اقوامِ گذشتہ کے واقعات میں کوئی شبہ پیش کیا۔ جو اس امر کی واضح دلیل ہے کہ دوست دشمن سب اس حقیقت اور صداقت کو تسلیم کرتے تھے کہ آپ امّی ہیں اور کسی سے آپ نے تعلیم نہیں پائی اور یہ کہ انبیاء و امم کے تاریخی واقعات جو قرآن نے بیان کئے وہ سب درست ہیں ورنہ ضرور وہ اعتراض کرتے۔ اِس بناء پر مستشرقین دورِ حاضر کے اعتراضات، ہر دو امور کے متعلق جو محض استعمار کے استحکام اور سیاسی مصالح کے تحت پھیلاتے جا رہے ہیں قطعاً بے اصل اور نامعقول ہیں۔ استشراق کا فتنہ علمی ادارہ نہیں، بلکہ علمی تحقیق کے نام وہ مسلمانوں کے مرکزی سرچشمہ قوت یعنی قرآن اور نبوّۃ پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں۔ تاکہ مسلمانوں کے قلب و دماغ پر تعلیماتِ قرآن و نبوّت کی گرفت کمزور ہو جائے اور اُنکی فطری وحدت کا خاتمہ ہو کر ان میں تفرّق پیدا کرنے کے لئے نئی راہیں کھول جائیں۔

يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ	چاہتے ہیں کہ بجھا دیں اللہ کی روشنی اپنے منہ
بِأَفْوَاهِهِمْ ط وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ	سے اور اللہ کو پوری کرنی ہے اپنی روشنی۔
وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ط (الصف آیۃ ۸)	پڑیں بُرا مانیں شرک کرنے والے۔

عام انگریزی دان طبقہ میں دین کے صحیح علم کا بھی فقدان ہے اور دینی زبان عربی کی بھی مہارت نہیں۔ اس کے علاوہ ان کو یورپ کے ہر مصنف سے عقیدت ہے جو مغربی تہذیب کا اثر ہے۔ اور علماء دین سے نفرت۔ یہی چار چیزیں مستشرقین کے فتنے کو فروغ دینے میں ان کے لئے نہایت کارآمد ثابت ہو رہی ہیں۔ ہم نے گولڈزیہر کی کتاب "مذاہبِ تفسیریہ" کا اور ولیم میور کی "لائف آف محمدؐ" کا بخوبی آزادانہ فکر سے مطالعہ کیا ہے لیکن ہم پر اس کا وہ اثر ہوا جو ہم نے اب ذکر کیا۔ اس نے ہماری پختگی یقین میں اور اضافہ کیا۔ ہم امورِ مستقبلہ میں قرآن کا برخلاف اسباب چند غیبی اعلانات

قبل از وقوع بیان کرتے ہیں۔

۱۔ قرآن نے بین الاقوامی پیشگوئی قبل از وقت کا اعلان ان الفاظ میں کیا ہے۔ جو سورۃ روم میں ذکر ہے۔ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِیْۤ اَدْنَى الْاَرْضِ وَ هُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۝ (الروم آیۃ ۲-۳) ایران کے مقابلہ میں اگر رومی مغلوب ہوئے اور مغلوب بھی ایسے ہوئے کہ کسریٰ کی فوجوں نے پوری رومی مملکت اور اس کے مرکز کو تباہ کردیا اور رومی سلطنت کو ایک باجگزار ریاست بنا کر چھوڑا۔ تاریخ گواہ ہے کہ کسریٰ کی عظیم قوت کو شکست دینے اور دوبارہ اپنا کھویا ہوا عروج حاصل کرنے کی قوت رومیوں میں فنا ہو چکی تھی۔ اور اس اعلان کے لئے بِضْعِ سِنِیْنَ کہہ کر دس سال سے کم وقت بھی متعین کیا گیا۔ قرآن کے اعلان کے مطابق ویسا ہی ہوا کہ رومی غالب آگئے اور اعلانِ غیبی کی صداقت کو دوست دشمن سب نے تسلیم کیا۔ حالانکہ یہ اعلان وقت کے اسباب کے مقتضی کے خلاف تھا۔

۲۔ قرآنِ حکیم نے عین ایسے وقت میں کہ مسلمان کمزور تھے اور قریش اور ان کے ہم مذہب عرب بہت قوی تھے بالخصوص ۶ھ میں حدیبیہ کے موقع پر کہ صحابہ کرام مدینہ سے لمبی مسافت طے کر کے مکّہ کے قریب بارادہ عمرہ پہنچے۔ لیکن قریش نے قوت کے گھمنڈ میں اُن کو داخلہ مکّہ سے اور عمرہ کرنے سے روکا حالانکہ ایسا کرنا عرب کے مسلّمہ قانون کے بھی خلاف تھا۔ یہاں تک کہ صلح حدیبیہ کی کمزور دفعات کو بھی مسلمانوں نے تسلیم کیا، جس میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ اس وقت مسلمان واپس جا کر آئندہ سال آکر عمرہ کرلیں۔ اسی حالت میں سورۃ فتح نازل ہوئی۔ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ۝ (الفتح آیۃ ۱) جس میں درحقیقت دو عظیم فتحوں کی پیشگوئی کی گئی۔ ایک یہود خیبر کی عظیم طاقت کو شکست دے کر خیبر کے سرسبز علاقے کو فتح کرنا۔ دوم قریش اور عرب کی مجموعی طاقت کو شکست دے کر مکّہ معظمہ اور مرکزِ عرب کو فتح کرنا۔ دو سال کے اندر مسلمانوں نے قرآن پیشگوئی کے مطابق دونوں فتحیں حاصل کیں۔ خیبر بھی اور مکّہ معظمہ بھی۔ جس سے معلوم ہوا کہ قرآن عالم الغیب کی کتاب ہے۔

۳۔ قرآنِ حکیم نے خلفاء راشدین کی خلافت کی پیش گوئی ایسے وقت میں فرمائی کہ خود صحابہ کرام کو

کو اپنی زندگی کا خطرہ تھا اور کوئی مسلمان اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن خلافِ اسباب اور برخلاف حالات پیشگوئی درست ثابت ہوئی اور قرآنِ حکیم کی پیش گوئی کے مطابق خلفاء راشدین کو زمین کی حکومت[۱] بھی حاصل ہوئی، اُن کا دین یعنی اسلام بھی سیاسی قوت حاصل کر کے مضبوط[۲] ہوا، اور اسلام اطرافِ عالم میں خلفاء راشدین کے ذریعے پھیلا اور مسلمانوں کو کسی حکومت کا خوف[۳] باقی نہ رہا۔ ان تینوں باتوں کا اعلان مسلمانوں کی کمزوری کے وقت میں قرآن نے ان الفاظ میں کیا:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ط (نور آیہ ۵۵)

اس قسم کے واقعاتِ غیبیہ جس کا اعلان قرآنِ حکیم نے قبل از وقت نامساعد حالات میں کیا ہے، بہت زیادہ ہیں۔ لیکن اختصار کی غرض سے ہم ان کو ترک کرتے ہیں۔

۹ - دلیلِ انجذابی

قرآن میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ اس میں خاص شانِ جاذبیت ہے۔ جو کسی انسانی کلام میں نہیں۔

۱۔ جاذبیت کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ غیر عرب مسلمان باوجود اس کے کہ قرآن اُن کی زبان میں نہیں، بلکہ اجنبی زبان میں ہے، اس کو بڑی محنت کر کے حفظ کرتے ہیں اور مدت تک دہراتے رہتے ہیں کہ فراموش نہ ہو جائے حالانکہ ان کو کوئی مادی فائدہ حفظِ قرآن سے حاصل نہیں ہوتا۔ یہ صرف قرآن کی شانِ جاذبیت ہے جو ان کو حفظ پر آمادہ کر رہی ہے۔

۲۔ دوسری یہ کہ جو کوئی اس کو ناظرہ پڑھتا ہے اور تلاوت کرتا ہے تو ساری عمر تلاوت کرنے کی طبیعت، معنے نہ جاننے کے باوجود اکتاتی نہیں اور نہ اس کے ذوق و شوق میں فرق پڑھتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں روحِ انسانی کے لئے ایک خاص جاذبیت پائی جاتی ہے۔

۳۔ سوم یہ کہ کوئی کلام جو اجنبی زبان میں ہو اور سُننے والا اس کا مطلب نہ سمجھتا ہو وہ اس سے متاثر نہیں ہوتا۔ لیکن قرآنِ پاک کی یہ شان کہ جب اس کو پڑھا جاتا ہے تو خواہ سُننے والا اس کو سمجھے یا نہ سمجھے، دونوں حالتوں میں اس پر اثر پڑتا ہے، اور اس کا بارہا تجربہ کیا گیا ہے۔ تو کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ قرآن کی یہ کشش، جو عالمی تاریخ کی کسی دوسری کتاب کو نصیب نہیں۔ یہ اس کے کلامِ الٰہی ہونے کی دلیل ہے۔

۱۰۔ دلیلِ تالیفی

قرآنِ حکیم کی تالیف میں اعجازی شان موجود ہے۔ انسانی تالیفات کا ایک خاص طرز ہے کہ وہ پہلے چند مرتب مضامین کا ایک مجموعہ مفصّل کے عنوان کے تحت لاتا ہے، پھر چند فصول کے مختلف مضامین کو ایک عام مشترک عنوان کے تحت باب میں ذکر کرتا ہے۔ پھر مختلف ابواب کے مضامین کو عام تر عنوان کے پیشِ نظر کتاب کے عنوان میں درج کرتا ہے۔ یہی انسانی تصنیفات کا عام رنگ ہے لیکن قرآن کا رنگِ تالیف بالکل جدید اور انسانی تالیفات کے خلاف ہے اور مخالف ہونے کے باوجود اسقدر معقول ہے کہ بقول امام رازیؒ ربطِ آیاتِ قرآن بھی ایک مستقل معجزہ ہے۔ قرآن میں مختلف اقسام کے مضامین ایک جگہ ذکر کئے جاتے ہیں۔ جن میں احکامؔ بھی ہوتے ہیں اور واقعاتِ انبیاءؑ سابقین بھی اور امورِ آخرتؔ بھی اور صفاتِؔ باری تعالیٰ بھی جس کو سطحی نظر رکھنے والا شخص دیکھ کر بے جوڑ اور غیر مربوط سمجھتا ہے۔ لیکن وہ قرآن کے اساسی اور بنیادی مقصد سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ایسا سمجھتا ہے۔ قرآن اپنے مضامین کو دو مقاصد کے پیشِ نظر بیان کرتا ہے۔ ایک تعلیم مالم یعلم۔ کہ جو مضمون قرآن پڑھنے والے کو معلوم نہ ہو، اس کے علم میں لایا جائے، یعنی ایک مقصدِ تعلیم ہے لیکن اس مقصد پر اکتفاء نہیں کرتا کیونکہ کسی بہتر سے بہتر مضمون کا علم کوئی کمال نہیں جب تک اس پر عمل نہ ہو۔ اگر ایک مریض کو اپنے مرض کے علاج کے لئے بہتر دوا اور نسخہ بنایا جائے اور اس کے علم میں لایا جائے تو اس سے کوئی فائدہ نہیں تاوقتیکہ اس پر عمل نہ کیا جائے۔ اس لئے قرآن تعلیم کے بعد تعمیل اور تلوین کے مقصد کو پیشِ نظر رکھتا ہے کہ جو کچھ سمجھایا گیا اس پر عمل بھی کرایا جائے۔ تاکہ اس

پر علم کا پورا رنگ چڑھ جائے۔ اس دوسرے مقصد کے پیش نظر احکام کے ساتھ قرآن دوسری قسم کے مضامین کو بھی تحریکِ عمل کے لئے لاتا ہے۔ عمل کے محرکات یا تاریخی مسلّم واقعات ہوتے ہیں۔ خصوصاً انبیاء علیہم السلام اور ان کی اُمتوں کے واقعات۔ یا محرک نتائج آخرت ہوتے ہیں۔ انسان اچھے عمل کو اس وقت اختیار کرتا ہے کہ اس کا اچھا نتیجہ اس کے دماغ میں نقش ہو جاتے اور بُرے عمل کے ترک پر اُس وقت آمادہ ہوتا ہے کہ اس کا بُرا نتیجہ اس کے سامنے ہو، اور جہانِ آخرت۔ جہانِ نتائج ہے۔ اس لئے آخرت کا بیان اس مقصد کے لئے کیا جاتا ہے۔ یا صفاتِ باری تعالیٰ، انسان جب اپنے آپ کو حاکمِ اعلیٰ کے سامنے جوابدہ سمجھے کہ حاکمِ اعلیٰ کے صفات کا یہ تصوّر اس کے سامنے ہو کہ عالم الکل ہے قادرِ مطلق ہے، عادل ہے۔ تو ان تصوّرات کے بعد اس کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ یہ حیرت انگیز نظامِ تالیف دلیل ہے کہ قرآن کلامِ الٰہی ہے۔

۱۱۔ دلیلِ اعتدالی

انسان چونکہ جذباتی ہے، اس لئے اس کا کلام جذبات کا مظہر ہوتا ہے۔ جب اس کی ذات جذبۂ قہر سے متاثر ہوتی ہے تو رحم و شفقت سے اس وقت خالی ہوتی ہے اور عین قہر و غضب کے وقت ــــ اس کے کلام میں رحم و عفو کا پہلو نہیں ہوتا، اور جب رحم و شفقت کے جذبہ سے متاثر ہوتی ہے تو قہر سے بیگانہ ہوتی ہے اور اس کے کلام شفقت میں قہر و غضب کا کوئی پہلو نہیں ہوتا۔ اسی طرح جب خوشی کا اظہار کرتا ہے تو سراپا خوشی بن جاتا ہے اور رنجش اور ناراضگی کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ لیکن قرآن چونکہ ایسی ذات کا کلام ہے جو جذبات سے پاک ہے، اس لئے اس کے کلام میں شانِ تنزیہِ جذبات نمایاں ہے۔ وہ غضب کے ساتھ مہربانی اور ناخوشی کے ساتھ خوشی کا اظہار بھی فرماتا ہے۔ لیکن ہر ایک کا محل الگ الگ ہوتا ہے۔ غضب کا محل اہلِ معصیت اور مہربانی کا محل اہلِ طاعت ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن میں انذار کے ساتھ اِبشار اور دوزخ کے ساتھ جنت کا تذکرہ ایک جگہ موجود ہے اور بے شمار مواقع میں بلکہ بعض جگہ ایک آیت میں دونوں ہی یعنی مہر و قہر موجود ہیں مثلاً۔

نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۔ وَاَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ ؕ (سورۃ الحجر آیۃ ۴۹، ۵۰)

میرے بندوں کو آگاہ کر دو کہ میں معاف کرنے والا اور مہربان ہوں اور یہ کہ میری سزا بھی دردناک سزا ہے۔

اس اجتماع میں ایک راز تو یہ ہے کہ قرآن کا سرچشمہ انسان نہیں، جس کا کلام جذبات کے رنگ میں ہوتا ہے۔ بلکہ ایسی ذات اس کلام کا سرچشمہ ہے جو جذبات سے پاک ہے اور خزانہ حکمت ہے اس لئے یہ کلام حکمت کے سرچشمہ سے نکلا ہوا ہے۔ جس کی حقیقت یہ ہے کہ الوہیت اور خدائی کے لئے از روئے حکمت دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ خوف اور محبت۔ اگر خدا سے بندوں کو خوف نہ ہو تو بھی اطاعت وعبادت خداوندی کا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ معمولی انسانی حکومت کے لئے بھی حاکم سے خوف ضروری ہے ورنہ اس کا حکم کون مانے گا اور نظام کس طرح چل سکے گا۔ دوم محبت۔ خوف کے ساتھ محبت بھی ضروری ہے تاکہ اطاعت وعبادت میں اخلاص ہو۔ کیونکہ محبوب کی تعمیلِ حکم پورے اخلاص کے ساتھ کی جاتی ہے اور عاشق و محب جان کی قربانی تک کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اللہ جلّ جلالہ میں بھی یہ دونوں چیزیں جمع ہیں اور اس کے کلام میں بھی ان دونوں چیزوں کا جمع ہونا ضروری ہے۔ باقی اشیاء میں دونوں کا اجتماع بہت نادر بلکہ نایاب ہے۔ انسان کو شیر یا ظالم انسان سے خوف ہے لیکن محبت نہیں۔ ماں سے اس کو محبت ہے لیکن خوف نہیں۔ یہ خالقِ کائنات کی خصوصیت ہے کہ وہ خوف اور محبت دونوں کا مرکز ہے یہ قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کی دلیل ہے۔ ترغیب کے سلسلہ میں دیکھو :۔

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ؕ (الزمر آیۃ ۵۳)

اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ بے شک اللہ سب گناہوں کو معاف کر سکتا ہے تحقیق وہ معاف کرنے والا اور مہربان ہے۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا

کوئی نفس نہیں جانتا، جو جو نعمتیں میں نے آنکھ ٹھنڈی کرنے والی اُن کے لئے اعمال کے

يَعْمَلُوْنَ۔ (السجدۃ: ۱۷)	بدلے میں چھپا رکھی ہیں۔

ترہیب میں ارشاد ہے:۔

وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۙ مِّنْ	ناکام ہوا ہر وہ شخص جس کو زور پر گھمنڈ تھا اور
وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ۙ	اور اسلام سے ضد کرتا تھا اس کے پیچھے جہنم ہے
يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَأْتِيْهِ	جس کا پانی جو پیپ ہے پلایا جائے گا گھونٹ
الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ	بھرے گا اور حلق سے نہیں اترے گا اور ہر طرف
بِمَيِّتٍ ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ۔	سے موت کی تکلیف اسکو گھیرے گی لیکن مرے گا نہیں
(سورہ ابراہیم آیت ۱۵-۱۷)	اس کے بعد سخت عذاب میں مبتلا ہوگا۔

۱۲- دلیلِ ملکی

ہر انسان کا کلام چاہے وہ کتنا بڑا ہو اور شہنشاہ ہو۔ لیکن اس کے کلام میں خوف کا اثر بھی موجود ہوتا ہے اور محدود قوت کی وجہ سے بڑی مخلوق کو مثلاً آسمان یا زمین کو نہ آرڈر (حکم) دے سکتا ہے اور نہ اس پر حکم جاری کر سکتا ہے لیکن قرآن نے طوفانِ نوحؑ کے موقعہ پر زمین و آسمان کو یوں حکم دیا:۔

يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ	اے زمین! نگل جاؤ اپنا پانی اور اے آسمان!
اَقْلِعِيْ ؕ (سورۃ ہود آیت ۴۴)	تھم جا۔

اور اس حکم کو جاری بھی کر دیا۔ بڑے بڑے بادشاہ بھی اپنی تقریر سب عوام کو خوش کرنے کے لئے کلام کرتے ہیں کہ وہ بگڑ کر مخالف نہ ہو جائے۔ بقول ایک یورپی مصنف کے کہ قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مصنف کسی مخلوق سے نہیں ڈرتا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خالق کا کلام ہے۔

فصل سوم — تفسیر و تاویل اور ہر دو کے متعلّقات کا بیان

۱ - لفظ تفسیر و تاویل کی معنوی تحقیق

ا۔ تفسیر عربی لغت کے اعتبار سے لفظ فسر سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی چیز کو کھول کر بیان کرنا ہے اور اسی سے قارورہ کو تفسرہ کہا جاتا ہے کہ اس کے دیکھنے سے مریض کا حال طبیب پر کھل جاتا ہے۔ تاویل عربی لغت میں اوّل سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی رجوع کے ہیں اور اصطلاحی تاویل میں بھی الفاظ قرآن کو اس کے معانی محتملہ میں سے کسی ایک کی طرف لوٹانا پڑتا ہے۔

ب۔ تفسیر و تاویل کے شرعی اور اصطلاحی معنی میں چند اقوال ہیں۔

(۱) ابو عبیدہ کا قول ہے کہ دونوں ہم معنی ہیں۔ (۲) امام راغب فرماتے ہیں کہ تفسیر عام لفظ ہے۔ کلام الٰہی کی تشریح کو بھی شامل ہے اور کلام انسانی کی تشریح کو بھی۔ مگر تاویل صرف کتب الٰہیہ کی تشریح کا نام ہے (۳) امام ابو منصور ماتریدی کی رائے یہ ہے کہ تفسیر قرآن کی مراد کو قطعی طور پر متعیّن کرنے کا نام ہے اور تاویل الفاظِ قرآن کے زیرِ احتمال معانی میں سے کسی ایک کو غیر یقینی طور پر متعیّن کرنے کا نام ہے (روح المعانی جلد ۱ ص۵۔ الاتقان جلد ۲ ص۱۷۳)۔ ہمارے نزدیک ان اقوال میں اختلاف نہیں کیونکہ یہاں مختلف اصطلاحیں ہیں۔ ایک متقدمین کی اصطلاح ہے کہ وہ تفسیر و تاویل کو ایک ہی معنی میں استعمال کرتے ہیں اور تفسیر کے موقعہ پر لفظ تاویل استعمال کرتے ہیں۔ تفسیر ابن جریر میں یہی طرز اختیار کیا گیا ہے۔ ابو عبیدہ نے دونوں کو ہم معنی قرار دیا۔ اس کے پیش نظر متقدمین کی اصطلاح ہے۔ اور متاخرین کی اصطلاح وہی ہے جو امام ابو منصور ماتیدی نے بیان کیا ہے کہ تفسیر کسی قطعی دلیل سے مرادِ الٰہی کو متعیّن کرنے کا نام ہے اور تاویل معانی محتملہ میں سے ایک معنی کو ظن و اجتہاد سے متعیّن کرنے کا نام ہے۔ امام راغب نے جو فرق بیان کیا ہے۔ وہ حقیقی فرق نہیں بلکہ متعلق کے اعتبار سے ایک اصطلاحی فرق ہے کہ تاویل کا تعلق کتبِ الٰہیہ کی تشریح کے ساتھ ہے، اور تفسیر عام ہے۔

(۴) اسی طرح یہ قول کہ قرآن کے معنی کا تعیّن روایۃ سے تفسیر ہے اور درایۃ کے ذریعے تاویل ہے۔

(۵) یا جو معنی عبارتِ قرآن سے معلوم ہوں وہ تفسیر ہے اور جو اشارہ الفاظ سے معلوم ہو وہ تاویل ہے۔

یہ سب متاخرین کی اصطلاحیں ہیں۔ ورنہ قدماء کی اصطلاح میں دونوں ہم معنی ہیں۔ صاحبِ قاموس نے اس کی تصریح کی ہے۔ متاخرین کی اصطلاح الوسی نے روح المعانی میں بیان کی ہے۔

۲۔ تعریف اور موضوع و غایتہ تفسیر

علامہ الوسی نے روح المعانی میں علمِ تفسیر کی تعریف یہ کی ہے کہ علمِ تفسیر وہ علم ہے جس میں الفاظ قرآن کے طرزِ تلفظ، مفرداتِ قرآن کے مدلولات اور معانی مرادہ اور ان کے افرادی و ترکیبی احوال و دیگر متعلقات سے بحث ہو، اور بقول صاحب مناہل العرفان (جلد ا ص۴۷۱) مختصر تعریف یہ ہے کہ علمِ تفسیر قرآن سے متعلق اس تحقیق کا نام ہے جس سے مرادِ الٰہی متعین ہو سکے۔ قرآن نے قدماء کی اصطلاح کے مطابق تفسیر اور تاویل کو ایک ہی معنی میں استعمال کیا ہے۔ سورۃ فرقان میں ہے "وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا" (آیۃ ۳۳) دوسری جگہ ارشاد ہے۔ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ؕ[1]۔ موضوع علم، تفسیر کلام اللہ، رُوح المعانی، غایۃ علمِ تفسیر مرادِ الٰہی کا علم حاصل کرنا تاکہ اعتقاداً اور عملاً اس کی پیروی ہو سکے۔

۳۔ آداب و شرائط تفسیر و فہم مطالب قرآن

رُوح المعانی، الاتقان، برہان، مناہل العرفان و دیگر کتب میں اہلیت و استعدادِ تفسیر اور قابلیت فہم قرآن کے لیے چند شرائط مذکور ہیں۔ ہم ان کا ذکر کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ ان شرائط کے دلائل بھی ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ علم اللغۃ یا علم اللسان مفسرِ قرآن کے لئے قرآن کی زبان جو عربی ہے، اس کی پوری مہارت ضروری ہے، یہ مہارت مندرجہ ذیل علوم کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ مفرداتِ قرآن کے مدلولات اور موقعہ استعمال کی تحقیق جو علم اللغۃ[1] کے ذریعے حاصل ہوگی۔ مفرداتِ قرآن کے لسانی تغیرات و تصرفات جو علم الصرف[2] والاشتقاق کے ذریعے حاصل ہوگی۔ مرکبات اور قرآن کے جملوں کے تغیرات و تصرفات حرکات اور اعرابات کا تبدل جو علم النحو[3] سے معلوم ہوں گے۔ قرآنی الفاظ کے انتخاب اور محلِ استعمال کے نکات و اسرار جو علم البلاغۃ[4] سے معلوم ہوں گے۔

[1] آل عمران آیۃ ۷

قرآن کے اوّلین مخاطب یعنی صحابۂ کرام اور عرب وقت نزول قرآن کو ان علوم کی ضرورت نہ تھی کیونکہ وہ صاحب اللسان ہونے کی وجہ سے ؛ ذوقِ فطری اور مہارتِ طبعی کی وجہ سے ان علوم کے مقاصد کے ماہر تھے ۔ لیکن غیر عربوں اور نیز مابعد زمانے کے عربوں کے لئے فہم قرآن کے پیش نظر ان علوم کی مہارت ضروری ٹھہری ، کہ خود عربوں کو بھی مابعد زمانے میں اختلاطِ دیگر اقوام کی وجہ سے وہ فطری ذوق نہ رہا ۔ اس شرط کی ضرورت خود قرآن سے ثابت ہے ۔ قولہ تعالےٰ عَلٰی قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝ و قولہ تعالےٰ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ ان آیات میں تصریح ہے کہ یہ کتاب عربی زبان اور اس کے قواعد کے تحت اُتاری گئی ہے ۔ اس لئے فہمِ قرآن کے لئے علم اللسان یعنی عربی کے تمام شعبوں کا جان لینا ضروری ہے اور عام قاعدہ بھی یہ ہے کہ اگر دیوانِ غالب ہو یا دیوانِ مومن ، جو اردو زبان میں ہے ۔ تو اردو زبان کی مہارت کے بغیر ان کا فہم ممکن نہیں ۔

۲ ۔ علم السنّۃ ۔ فہمِ قرآن کے لئے علم السنۃ بھی ضروری ہے ۔ اور صاحبِ قرآن علیہ السلام کے بغیر فہمِ قرآن ممکن نہیں ۔ جس کے لئے علم السنۃ و علم الحدیث کی ضرورت ہے تاکہ اسبابِ نزول ، تشریحِ مجملاتِ قرآن ، تعیینِ مبہمات وغیرہ کا علم ہوسکے ۔ ورنہ قرآن میں صلوٰۃ و زکوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے ۔ لیکن یہ وضاحت موجود نہیں کہ نماز کی کل تعداد کتنی [1] ہے ، ہر نماز کا وقت کب سے شروع ہوتا ہے ، اور کب ختم [2] ہوتا ہے ، خود ہر نماز کی رکعات کی تعداد کتنی [3] ہے ، نماز کے اجزاء ترکیبی [4] کتنے ہیں ، اور ان اجزاء کی ترکیب کیسی [5] ہے ، نماز کے شرائط کتنے ہیں اور کون کون [6] سے ہیں ۔ اسی طرح زکوٰۃ کا حال ہے ۔ زکوٰۃ کن اموال میں ہے اور کن میں نہیں ، ماہوار ہے یا سالانہ ، مال کی ہر جنس میں اس کی مقدار کس قدر ہے ، زکوٰۃ کے شرائط کیا ہیں اور مصارف جہاں وہ خرچ ہو وہ کونسے ہیں ۔ ان سب کی تشریح جو درحقیقت تشریحِ قرآنی ہے سُنّت کے بغیر ناممکن ہے ۔ اسی طرح حج و روزہ و دیگر احکام کا حال ہے ۔ جس طرح ہم الفاظِ قرآن کے مطالب سمجھنے میں لُغت عرب کے محتاج ہیں ، اسی طرح احکامِ قرآن کی عملی شکل متعین کرنے میں حدیث و سُنّت کے محتاج ہیں اور یہ ہماری محتاجی ہے قرآن کی محتاجی

نہیں کہ ہم کو استفادہ از قرآن کے لئے قدرتی طور پر ان امور کی ضرورت ہے۔ ہم اگر پانی سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں تو ہم کو کنواں کھودنے یا نہر لانے کی ضرورت ہے جس کا قطعاً یہ معنی نہیں کہ پانی محتاج ثابت ہوا یا کنواں یا نہر۔ بلکہ ہم استفادہ میں ان دونوں کے محتاج ہیں، پانی بے نیاز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود قرآنِ حکیم نے حدیث وسنّت کی ضرورت کو جو حضور علیہ السلام کے قول وعمل کا نام ہے فہم قرآن کے لئے ضروری قرار دیا۔ ارشاد ہے:۔

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ط (سورۃ جمعۃ آیۃ ۲) — حضور کا منصب یہ ہے کہ وہ لوگوں کو قرآن وحکمت کی تعلیم دیں۔

یہ تعلیم مطالبِ قرآن کی ہے کیونکہ الفاظِ قرآن کی تعلیم پہلے مذکور ہے۔ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ - نیز عام قاعدے کے مطابق اگر کوئی استاد صرف عبارت پڑھ کر سنائے تو ایسی صورت میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے کتاب کی تعلیم دی، جب تک اس کتاب کے مطالب کی وہ تعلیم نہ دے۔ دوسری آیت میں ہے:۔

لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ط (النحل آیۃ ۴۴) — تاکہ تو وضاحت اور تشریح کر دے ان کو نازل کردہ کتاب کی۔

علی ہذا القیاس بہت سی آیتیں اس بارہ میں موجود ہیں جس سے فہم قرآن کا علم الحدیث پر موقوف ہونا ثابت ہے۔

۲۔ **علم الآثار** | فہم معانی قرآن کے لئے آثار صحابہ وتابعین کا علم ہونا ضروری ہے۔ صحابہ تو بالذات حضور علیہ السلام کے شاگرد ہیں اور تابعین ایک واسطے سے شاگرد ہیں۔ لہٰذا ان کا فہم قرآن مابعد والوں سے صحیح تر ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ "الرسالۃ" میں لکھتے ہیں کہ اجتہادہم فوق اجتہادنا، کہ صحابہ کا اجتہاد ہمارے اجتہاد سے بڑھ کر ہے۔ پھر صحابہ کرام کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے:۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ط (بینۃ آیۃ ۸) — اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہیں اور وہ ان سے راضی ہیں

رضائے الٰہی کی آسمانی سند اتنی بڑی سند ہے کہ اس کے ساتھ یہ احتمال باقی نہیں رہتا کہ بحیثیت مجموعی ان کی تفسیر غلط ہو سکے اور اُمّت کے لئے گمراہی کا سبب بن جائے۔ رضاء الٰہی کے بعد اس قسم کے احتمالات کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس کے علاوہ علم الآثار سے اقوالِ صحابہ وتابعین کا علم ہوجاتا ہے،

اور مفسرِ قرآن ایسی تفسیر کرنے سے محفوظ ہو جاتا ہے جو ان سب کے خلاف ہو اور تحریفِ قرآن کے جُرم کا سبب بنے۔ جس پر قرآن میں دوزخ کی وعید وارد ہوئی ہے۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا	جو پیغمبر کی مخالفت کرتے ہیں اور مومنین کے
تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ	خلاف راہ پر چلتے ہیں تو ہم ان کو، ان کی
سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ	پسندیدہ راہ چلنے دینگے اور جہنم میں داخل کرینگے
نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ؕ	جو بُرا ٹھکانہ ہے۔ (النساء آیۃ ۱۱۵)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح مخالفتِ رسول جُرم ہے، مخالفت صحابہ بھی جرم ہے، کیونکہ نزولِ قرآن کے مومنین وہی ہیں اس لئے ایسی تفسیر جو صحابہ کرام کی مجموعی رائے کے خلاف ہو، تحریف اور جُرم ہے جس کی سزا دوزخ ہے۔

۴- **علم القواعد و اصول الاستنباط** عربی زبان کے ان قوانین کا علم بھی مفسر کے لئے ضروری ہے جس سے وہ مجمل، مفصل، عام، خاص، مطلق، مقید، امر، نہی وغیرہ کے حقائق اور مقتضیات کو معلوم کرسکے تاکہ تفسیر کے وقت احکام اور نتائج کے استخراج میں غلطی نہ کرے۔ ایسے قواعد علم اصول الفقہ سے معلوم ہوسکتے ہیں۔ یہ زبانِ عربی کا ایک عمیق علم ہے جس کو خاص اہلِ علم جان سکتے ہیں۔ جن کو اہلِ استنباط کہا جاتا ہے۔ جو ان قواعد کی مہارت کی وجہ سے استخراجِ احکام کی قابلیت رکھتے ہیں۔ قرآن میں اس خاص طبقے کا ذکر ہے۔

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ	یعنی امن اور خوف کے متعلق کوئی امر پیش آ
اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ	جائے تو وہ اگر اس کو اللہ و رسول کے حوالے
اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ	کرتے تو اجتہاد والے اس کی حقیقت جان لیتے
لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ	(النساء آیۃ ۸۳)

شرعی احکام اگر اوامر ہوں تو امر ہے اور امن کی چیز ہے اور اگر منہیات ہوں تو نہی ہے اور خوف کی چیز ہے۔ تو کسی معاملہ کے متعلق یہ تحقیق کرنا کہ مامور ہے یا منہی، بالفاظ دیگر امن میں داخل ہے

یا خوف میں، اس کو اللہ و رسول یعنی کتاب و سنّت کی طرف لوٹانا ضروری ہے تاکہ اربابِ اجتہاد منصوصات کتاب و سنّت سے پیش آمدہ معاملہ کا موازنہ کرکے اس کا حکم مستنبط کرسکیں۔ اسی استنباط کیلئے عام زبان عربی جاننے کے علاوہ مخصوص قواعدِ زبان عربی کی معرفت بھی ضروری ہے جس پر قرآن کی صحیح قانونی انداز فکر کا مدار ہے اور علم اصول الفقہ سے ان قانونی قواعد کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

۵۔ علمِ قواعد الالٰہیّات | مفسّر کا فرض ہے کہ اس کو ذاتِ الٰہی کے متعلق جائزات اور غیر جائزات کا علم حاصل ہو۔ وہ یہ جانتا ہو کہ اللہ ایک ایسی ہستی ہے کہ وہ جسمیّت، جہتہ و مکان و زمان سے منزّہ اور پاک ہے اور ان قیود سے بالاتر ہے۔ اسی طرح وہ ایسے کمالاتِ ذاتیہ سے موصوف ہے جو لامحدود ہیں۔ تاکہ قرآن کی اُن آیات کی تفسیر میں ٹھوکر نہ کھائے جو الہیّات ذات و صفات باری سے متعلق ہیں اور ان امور کے لئے علم العقائد یا علم الکلام کی ضرورت ہے تاکہ مسائلِ الٰہیات میں گمراہی سے محفوظ رہ سکے۔

ازالہ شبہہ | ممکن ہے بعض حضرات کے دل میں یہ شبہہ گزرے کہ مہارتِ تفسیرِ قرآن کے لئے جن علوم کے جان لینے اور ان میں ماہر ہونے کی شرط رکھی گئی ہے، وہ علوم نزولِ قرآن کے زمانے میں نہ تھے۔ بلکہ ان کی تدوین مابعد زمانے میں ہوئی۔ مثلاً علمِ صرف، نحو، لغت، بلاغۃ، علم الحدیث والآثار، علم العقائد والکلام واصول الفقہ۔ یہ سب نزولِ قرآن کے بعد مدون ہوئے۔ تو ان علوم کی مہارت، قرآن کے فہم کے لئے کیونکر ضروری ہوسکتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وجودِ علوم اور تدوینِ علوم میں فرق ہے۔ یہ سب علوم جو زبانِ عربی سے متعلق ہیں، نزولِ قرآن کے وقت سے بلکہ اس سے پہلے موجود تھے اور عربی زبان سے وابستہ تھے اور بول چال میں ان کو استعمال کیا جاتا تھا۔ اگرچہ ان علوم نے تصنیف و تدوین کی شکل اختیار نہیں کی تھی۔ مثلاً فاعل کو مرفوع اور مفعول وغیرہ کو منصوب پڑھنا، اور عام و خاص، مطلق و مقیّد کا فرق، اسی طرح صرف و نحو کے تغیرات بلاغتی، مواقع استعمال، یہ سب امور عربی زبان کے وقت سے موجود تھے اور عرب ان کو استعمال کرتے تھے، اگرچہ تصنیف کے قالب میں مابعد زمانے میں ڈھالے گئے۔ لہٰذا اگرچہ ان قواعد کی تدوین پیچھے ہوئی لیکن ان قواعد کا وجود زمانہ نزولِ قرآن سے قبل عرب میں

موجود تھا اور عربی بول چال میں ان قواعد کو برتتے تھے اور استعمال میں لاتے تھے۔ علم الحدیث اور علم الآثار بحیثیت تشریح قرآن، قرآن کے ساتھ ساتھ وجود میں آئے۔ اگرچہ تدوین و تصنیف کی نوبت بعد میں آئی۔ اس لئے ان قواعد کی تصنیفی صورت کے مابعد زمانے میں ہونے سے ان کی شرطِ قرآن دانی ہونے پر شبہہ نہیں کیا جا سکتا۔

۶۔ علم الموہبۃ | مہارتِ تفسیر اور فہم قرآن کے لئے علم وہبی یا بقول شاہ ولی اللہؒ علم لدنی کا ہونا بھی ضروری ہے۔ جو نورِ ایمانی اور تقویٰ سے پیدا ہوتا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے

لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ط (الواقعہ آیۃ ۸) قرآن کے ظاہری الفاظ اور نقوش کو صرف پاک ہی چھو سکتے ہیں۔

یعنی جس شخص کو طہارت اور وضوء نہ ہو وہ قرآن ظاہری پر ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ اسی طرح جس کو طہارتِ باطنی و قلبی نہ ہو، وہ باطنِ قرآن اور معانیٔ قرآن کو نہیں پا سکتا۔ یہ طہارتِ باطنی اور قلبی نور، طاعتِ الٰہی اور تقوٰی سے پیدا ہوتا ہے۔ ظاہری قرآن کے مساس اور رسائی کے لئے ظاہری طہارت اور معانی و مطالب قرآن، جو باطنِ قرآن ہیں اس کے مساس اور رسائی کے لئے قلبی اور باطنی طہارت ضروری ہے امام سیوطی نے اتقان جلد ۲ صـ۱۸۱ میں امام زرکشی کے البرہان فی علوم القرآن سے نقل کیا ہے۔

اَعْلَمْ اَنَّهٗ لَا يَحْصُلُ لِلنَّاظِرِ فَهْمُ	قرآن کے معانی و اسرار اس شخص کو حاصل نہیں ہو
مَعَانِي الْقُرْاٰنِ وَلَا يَظْهَرُ اَسْرَارُهٗ	سکتے۔ جس کے دل میں بدعت، تکبر اور
وَفِي قَلْبِهٖ بِدْعَةٌ اَوْ كِبْرٌ اَوْ هَوًى اَوْ حُبُّ	خود داری اور محبت دنیا ہو۔ یا گناہ پر مصر
الدُّنْيَا اَوْ مُصِرٌّ عَلٰى ذَنْبٍ اَوْ غَيْرُ مُتَحَقِّقٍ	ہو، یا اس کا ایمان پختہ نہ ہو، یا اس کی
الْاِيْمَانِ اَوْ ضَعِيْفُ التَّحْقِيْقِ اَوْ يَعْتَمِدُ	تحقیق کمزور ہو، یا غیر عالم مفسر پر اعتماد
عَلٰى مُفَسِّرٍ لَيْسَ عِنْدَهٗ عِلْمٌ اَوْ رَاجِعٌ اِلٰى	کرتا ہو، یا اپنی عقل کی پیروی کرتا ہو،
مَعْقُوْلِهٖ وَهٰذِهٖ كُلُّهَا حُجُبٌ وَمَوَانِعُ	یہ سب امور فہم قرآن کی رکاوٹیں ہیں،
بَعْضُهَا اَكْبَرُ مِنْ بَعْضٍ وَهٰذَا مَعْنٰى	بعض دوسرے سے بڑھ کر ہیں۔ یہ معنی ہے
قَوْلِهٖ تَعَالٰى سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيَاتِيَ الَّذِيْنَ	قرآن کے اس ارشاد کا کہ میں قرآنی آیات سے

يَتَكَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ قَالَ	مقاصد سے ہٹاوں گا اُن کو جو زمین میں ناحق بڑائی
سُفْيَانُ بْنُ عُيَيْنَةَ يَقُوْلُ اَنْزِعُ عَنْهُمْ	کرتے ہیں۔ ابن ابی حاتم نے سفیان بن عیینہ
فَهْمَ الْقُرْاٰنِ اَخْرَجَهُ ابْنُ اَبِیْ حَاتِمٍ	سے نقل کیا ہے کہ ان سے فہم قرآن کی روشنی
قَالَ سُفْيَانُ الثَّوْرِیُّ لَا يَجْمَعُ فَهْمَ	نکالوں گا۔ سفیان الثوری فرماتے ہیں کہ احکام پرستی
الْقُرْاٰنِ وَالْاِشْتِغَالِ بِالْاَحْكَامِ فِیْ	اور فہم قرآن، دونوں مومن کے دل میں جمع
قَلْبِ مُؤْمِنٍ ط	نہیں ہو سکتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ فہم قرآن کے لئے قلبی روشنی کی ضرورت ہے۔ جو اس سے محروم ہو وہ فہم قرآن سے بھی محروم ہوگا۔ وہ روشنی ان امور سے پیدا ہوتی ہے جو مذکورہ بالا عبارت میں مذکور ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیض حاصل کرنے کے لئے شرط ہے۔ اسی کا نام علم الموہبۃ ہے جس سے قرآن کا دروازہ کھلتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ جو کوئی اپنی رائے کے تحت قرآن کی تفسیر کرے اور وہ ٹھیک بھی ہو تو بھی اُس نے غلطی کی (ابوداؤد، ترمذی، نسائی) ابوداؤد کی دوسری روایۃ میں ہے فلیتبوأ مقعدہ من النار۔ یعنی تفسیر بالرائے کرنے والا دوزخ کا مستحق ہے۔ اسلئے تفسیر بالرائے کے مذموم ہونے پر علماء متفق ہیں۔

تفسیر بالرائے کی تحقیق تفسیر بالرائے سے کیا مراد ہے؟ یہ معنی تو قطعًا مراد نہیں کہ تفسیر قرآن میں رائے و فکر کو استعمال ہی نہ کیا جائے کیونکہ اس کے بغیر تفسیر کرنا ممکن نہیں اور خود قرآن نے "لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ کہ لوگ قرآن میں فکر کریں۔ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ یہ لوگ قرآن میں کیوں غور نہیں کرتے" کے الفاظ میں فکر و تدبر فی القرآن کی طرف ترغیب دی ہے۔ اس لئے نفس رائے اور فکر مذموم نہیں بلکہ مراد تفسیر بالرائے سے یہ ہے کہ :-

۱۔ اپنی پہلی ٹھیرائی ہوئی رائے کو اصل قرار دے اور قرآن کو اپنی اس رائے پر منطبق کرنے کی کوشش کرے۔ ایسی صورت میں رائے اصل ہوئی اور قرآن کو تابع کے درجہ میں رکھا گیا، جو قلب موضوع ہے اور مذموم اور سبب دوزخ ہے۔ تو تفسیر بالرائے میں، اس صورت میں لفظ با سببیت

کے لئے ہے اور رائے کو استعمال کرکے سیاق وسباق اور قواعدِ عربیت کے تحت ایسی تفسیر کرنا کہ قرآن اور اسلام کے بنیادی مقاصد کے خلاف نہ ہو تو یہ تفسیر محمود ہے اور مذموم نہیں اور نہ تفسیر بالرائ میں داخل ہے۔ اس کو اگر تفسیر بالرائ کہا جائے تو لفظ با۔ کتبتُ بالعلم کی طرح رائے صرف ایک آلہ تفسیر ہے۔ تفسیری عمل کا ایک محور و مرجع نہیں۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ قرآنی تفسیر میں عقل و نقل کے دو الگ دائرے ہیں۔ قرآن کے مفردات کے معانی کا تعیّن، اسباب نزول، ناسخ منسوخ اور بیان مجملات اور قراءت مختلفہ ایسی چیزیں ہیں، جو محض نقل سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ رائے کو ان میں دخل نہیں۔ لہٰذا ان امور میں رائے کی مداخلت وہ تفسیر بالرائ ہے جو مذموم ہے۔ باقی رائے کے ذریعے آیت کے معانی متعددہ میں سے کسی ایک معنی کا تعیین یا اس سے استنباط حکم، قواعد استنباط کے تحت یا قرآنی حکم کی حکمت و سرّ وغیرہ کا استخراج، یہ تفسیر بالرائے میں داخل نہیں کیونکہ یہ سب امور دائرہ رائے و عقل سے متعلق ہیں، نہ کہ نقل و درایت سے۔ (الاتقان جلد ۲ ص۱۷۹ و ص۱۸۳) تو تفسیر بالرائ سے اس صورت میں یہ مراد ہے کہ رائے دائرہ نقل میں مداخلت کرے اور موضع نقل میں بجائے تفسیر بالنقل والروایۃ کے تفسیر بالرائ کر ڈالے جو تجاوز عن الحد ہے۔

ازالۂ شبہہ — تفسیر صوفیہ اور تفسیر باطنیہ میں فرق | قرآن کی تفسیر کے سلسلے میں صوفیہ اسلام نے بھی تفسیریں کی ہیں اور ملاحدہ باطنیہ نے بھی۔ لیکن اوّل کو تحریف اور تفسیر بالرائ نہیں کہا جاتا اور باطنیہ اور دیگر ملحدین کی تفسیر کو تحریف میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ اس فرق کی کیا وجہ ہے۔ اس فرق کو بُرہان، الاتقان، روح المعانی بلکہ تفتازانی نے بھی بیان کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ صوفیہ کرام ظاہری معانی کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی مماثل اور مناسب اشیاء کا تذکرہ کرتے ہیں تاکہ پرواز ذہن کا دائرہ وسیع ہو اور وہ مناسب اشیاء اسلامی مسلّمات کے خلاف نہیں ہوتیں۔ ان کی تفسیر سے اسلامیات کا انکار لازم نہیں آتا۔ بخلاف تفاسیر باطنیہ کے کہ وہ باطنی معانی کو اصل مرادِ الٰہی قرار دیتے ہیں اور قرآن کے ظاہری معنی سے انکار کرتے ہیں۔ علامہ الوسی فرماتے ہیں:۔

وَأَمَّا كَلَامُ الصُّوفِيَّةِ فِي الْقُرْآنِ
فَهُوَ مِنْ بَابِ الْإِشَارَاتِ تَنْكَشِفُ
عَلَى أَرْبَابِ السُّلُوكِ وَيُمْكِنُ التَّطْبِيقُ
بَيْنَهَا وَبَيْنَ الظَّوَاهِرِ الْمُرَادَةِ وَذٰلِكَ
مِنْ كَمَالِ الْإِيمَانِ وَمَحْضِ الْعِرْفَانِ
لَا أَنَّهُمْ اعْتَقَدُوا أَنَّ الظَّاهِرَ غَيْرُ
مُرَادٍ أَصْلًا وَأَنَّمَا الْمُرَادُ الْبَاطِنُ فَقَطْ
إِذْ ذٰلِكَ اعْتِقَادُ الْبَاطِنِيَّةِ الْمُلَاحِدَةِ
تَوَصَّلُوا بِهِ إِلَى نَفْيِ الشَّرِيعَةِ بِالْكُلِّيَّةِ وَ
حَاشَا سَادَاتِنَا مِنْ ذٰلِكَ وَقَدْ حَضُّوا
عَلَى التَّفْسِيرِ الظَّاهِرِ وَقَالُوا لَا بُدَّ مِنْهُ
أَوَّلًا إِذْ لَا يُطْمَعُ فِي الْوُصُولِ إِلَى الْبَاطِنِ
قَبْلَ إِحْكَامِ الظَّاهِرِ وَمَنِ ادَّعَى فَهْمَ
أَسْرَارِ الْقُرْآنِ قَبْلَ إِحْكَامِ الظَّاهِرِ
فَهُوَ كَمَنِ ادَّعَى الْبُلُوغَ إِلَى صَدْرِ
الْبَيْتِ قَبْلَ أَنْ يُجَاوِزَ الْبَابَ۔

تفسیر قرآن کے سلسلے میں صوفیہ کا کلام اشارات
کے باب سے ہے جو سالکین پر منکشف ہوتے
ہیں، اور وہ اشارات قرآن کے ظاہری معانی
پر منطبق کئے جا سکتے ہیں۔ یہ کمال ایمان و
معرفت کے آثار ہیں۔ ان حضرات کا یہ مقصد
نہیں کہ ظاہری معانی مراد نہیں، بلکہ صرف
باطنی معنی مراد ہیں۔ ایسا عقیدہ، ملحدین
باطنیہ کا ہے۔ جس سے وہ شریعت
کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اور ہمارے
بزرگ اس سے بری ہیں۔ انہوں نے
خود ظاہری تفسیر کے یاد کرنے پر زور دیا ہے
اور کہا ہے جس کو ظاہری تفسیر پختہ نہ ہو
وہ باطن کی طرف نہیں پہنچ سکتا اور جو شخص
ظاہری تفسیر کی پختگی سے قبل قرآن کے اسرار کو حاصل
کرنا چاہے تو وہ اس شخص کی مانند ہے جو گھر کے اندر
داخل ہونیکا دعوی کرے دروازہ سے گذر جانیکے بغیر۔

علامہ الوسی کے اس بیان سے معلوم ہوا کہ صوفی کی تفسیر میں چند اُمور ملحوظ ہوتے ہیں جو اس کو باطنی تفسیر سے علیحدہ کرتے ہیں۔ (۱) مراد الٰہی صرف ظاہری تفسیر ہے نہ باطنی اشارات (۲) باطنی اشارات تک رسائی ظاہری تفسیر کی مہارت پر موقوف ہے (۳) باطنی اشارات کا ظاہری تفسیر کے ساتھ مطابق ہونا ضروری ہے۔ (۴) باطنی اشارات مناسب اشیاء کا انکشاف ہے جو معرفۃ الٰہی کا ثمرہ ہے نہ الحاد اور اتباع ہوا کا۔ اور حدیث میں جو لِكُلِّ آيَةٍ ظَهْرٌ وَبَطْنٌ وَلِكُلِّ حَرْفٍ حَدٌّ وَلِكُلِّ

خذٌ مَطْلَعٌ" آیا ہے۔ اس میں ظاہر سے مراد ظاہری معنی ہے اور باطن سے اسرار مراد ہیں (رُوح المعانی جلد ا ص۷) صوفیہ اور باطنیہ کے معانی میں فرق کے لئے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں تاکہ فرق خُوب واضح ہو جائے۔ حدیث میں آیا ہے اِنَّ الْمَلَائِكَةَ لَا تَدْخُلُ بَيْتًا فِيْهِ كَلْبٌ وَّلَا صُوْرَةٌ یعنی جس گھر میں کُتا اور تصویر ہو اس میں ملائکہ رحمت داخل نہ ہوں گے۔ یہی ظاہری معنی ہیں۔ اب اگر ایک شخص اس اصلی معنی کو برقرار رکھتے ہوئے بوجہ مناسبت یہ بیان کرے کہ بیت ظاہری سے مراد دل ہے اور کُتے سے مراد اخلاق سبعیہ ہیں اور صورت سے محبّتِ دنیا ہے، یعنی جس دل میں کتے والے اخلاق اور محبتِ دنیا موجود ہو، اس میں مَلکی نُور داخل نہیں ہوتا۔ تو اس شخص نے اصل معنی قائم رکھ کر اس کی نظیر کی طرف متوجہ کرنے کی غرض سے معنوی اور باطنی چیزوں کو بیان کیا لیکن بغیر ضرورت کُتے کو اور جاندار کی تصویر رکھنے کو حرام جانتا ہے تو یہ مثال صوفیہ کرام کی باطنی تفسیر کی ہے، کہ ظاہری تفسیر کو مراد سمجھ کر مناسب امور کو ذکر کرتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی دوسرا شخص مذکور حدیث کا یہ مطلب بیان کرے کہ اس سے ظاہری کُتا اور ظاہری تصویر مراد ہی نہیں اور نہ وہ شرع میں منع ہے بلکہ مراد حدیث کُتے والے صفات ہیں اور صورت سے محبتِ دنیا ہی مراد ہے تو یہ باطنی اور الحادی تفسیر یا تحریف ہے۔ اس طرح سورۃ بقرہ میں بنی اسرائیل کے سلسلے میں آیا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ط (سورۃ بقرۃ آیۃ ۶۷) بنی اسرائیل کے مقتول شخص کے قاتل معلوم کرنے کے لئے ان کو حکم ہوا کہ بقرہ ذبح کرو اور پھر اس کے جُزء کو مقتول سے لگا دو، مقتول زندہ ہو کر اپنا قاتل بتا دے گا۔ اس آیت کی یہ تفسیر کرنا کہ بقرہ سے گائے یا بیل مراد نہیں بلکہ نفسِ بہیمیہ مراد ہے، یعنی خود ان لوگوں کا نفسِ حیوانی اور اس کے ذبح کرنے سے مراد یہ ہے کہ ریاضت اور عبادت سے نفس کشی اختیار کرو، تاکہ نفسِ بہیمی کی سرکشی ختم ہو جائے اور جب اُس کی سرکشی ختم ہوگی تو وہ زندہ ہو جائے گا۔ اور اس کو رُوحانی حیات نصیب ہو کر اصل قاتل یعنی خواہشاتِ نفس کو بتلا دیگی، کہ یہی ملکیت اور روحانیت کے قاتل ہیں اور فی الحقیقت کسی ظاہر گائے کو ذبح کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ یہی الحادی اور باطنی تفسیر ہے۔ لیکن اگر اصل واقعہ کو صحیح تفسیر قرار دیتے ہوئے بوجہ مناسبت ان

امور کی طرف انتقال ہو تو کوئی حرج نہیں، جیسے قاضی بیضاوی نے اپنی تفسیر میں مذکورہ اشارات کو نکات معرفت کے درجہ میں نقل کیا ہے۔

تفسیر بالرائے کی قسمیں امام سیوطی نے اتقان میں ابن النقیب سے نقل کیا ہے:-

مَاتَحْصِلُ فِیْ مَعْنٰی حَدِیْثِ التَّفْسِیْرِ بِالرَّائِ خَمْسَۃُ اَقْوَالٍ ۔ اَحَدُھَا اَلتَّفْسِیْرُ مِنْ غَیْرِ حُصُوْلِ الْعُلُوْمِ الَّتِیْ یَجُوْزُ مَعَھَا التَّفْسِیْرُ وَالثَّانِیْ تَفْسِیْرُ الْمُتَشَابِہِ الَّذِیْ لَا یَعْلَمُہٗ اِلَّا اللّٰہُ وَالثَّالِثُ التَّفْسِیْرُ الْمُقَرِّرُ لِلْمَذْھَبِ الْفَاسِدِ بِاَنْ یَجْعَلَ الْمَذْھَبَ اَصْلًا وَّالتَّفْسِیْرَ تَابِعًا فَیُرَدَّ اِلَیْہِ بِاَیِّ طَرِیْقٍ اَمْکَنَ وَاِنْ کَانَ ضَعِیْفًا ۔ اَلرَّابِعُ اَنَّ مُرَادَ اللّٰہِ کَذَا بِالْقَطْعِ مِنْ غَیْرِ دَلِیْلٍ اَلْخَامِسُ التَّفْسِیْرُ بِالْاِسْتِحْسَانِ وَالْھَوٰی۔ (الاتقان جلد۲ صـ۱۸۳)

تفسیر بالرائے جو شرع میں ممنوع ہے، اس کی پانچ صورتیں ہیں۔ (۱) یہ کہ قرآن کی تفسیر کے لئے جس قدر علوم کی ضرورت ہے ان کے حصول کے بغیر قرآن کی تفسیر کی جائے (۲) آیات صفات و مقطعات اور متشابہ کی تفسیر کی جائے جن کا علم اللہ جلّ شانہ سے مخصوص ہے (۳) ایک اپنی ٹھیرائی ہوئی غلط رائے کے لئے قرآن کی تفسیر کی جائے، جس میں رائے اصل ہو، اور قرآن کو اس کا تابع بنایا جائے (۴) اس طرح تفسیر کرنا کہ یقینی دعویٰ کیا جائے کہ اللہ کی مراد یہ ہے اور اس کی دلیل موجود نہ ہو۔ (۵) قرآن کی کسی آیت کی تفسیر اپنی پسند اور میلان کے تحت کی جائے۔

یہ سب صورتیں تفسیر بالرائے میں داخل ہیں۔ جن پر دوزخ کی سزا کی وعید آئی ہے۔ آج تک جدید رنگ کی تفسیروں میں بہت کم ایسی ہوں گی، جو ان پانچ صورتوں میں سے کسی نہ کسی صورت میں داخل نہ ہوں۔ العیاذ باللہ۔

اقسامِ تفسیر ابن عباس نے تفسیر کی چار قسمیں قرار دی ہیں۔ (۱) وہ جو صرف عربی زبان کی خاص مہارت اور قواعد جاننے سے معلوم ہو سکے (۲) وہ واضح احکامِ اعتقادی و عملی جو قرآنی الفاظ کے سُن

لینے سے معلوم ہو سکے۔ جیسے :-

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ط (محمد آیۃ ۱۹) جان لو کہ کوئی معبود نہیں بجز اللہ کے۔

اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ ط (بقرۃ آیۃ ۴۳) نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔

جس کو عوام عرب معلوم کر سکتے ہیں اور دقائق عربیہ کی معرفت اس کے لئے ضروری نہیں اور میں کسی کی طرف سے جہل کا عذر پیش کرنا قبول نہیں۔ (۳) وہ جس کو صرف علماء مجتہدین ہی جانتے ہیں اور عام طور پر اس کو تاویل کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً استنباط احکام فقہیہ، بیان مجمل و تخصیص عام و تقلید مطلق حقیقۃ شرعیہ کو حقیقۃ لغویہ پر ترجیح دینا اور حقیقۃ عرفیہ کو حقیقۃ لغویہ پر ترجیح دینا، اور اس صورت میں کہ اس کے خلاف پر دلیل موجود ہو جیسے وَصَلِّ عَلَیْهِمْ ط اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ط میں معنی لغوی پر دلیل قائم ہے۔ (۴) چہارم وہ تفسیر جس کا علم اللہ تعالےٰ سے مختص ہے۔ جیسے علم متشابہات، وقتِ قیامت و روح وغیرہ (الاتقان جلد ۱ صفحہ ۱۸۲)

وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ ط میں قرآن کی جس آسانی کا ذکر ہے اس سے قسم دوم مراد ہے جس پر لفظ ذکر قرینہ ہے کہ صرف ان مضامینِ قرآن کو آسان کہا گیا ہے جو پند و موعظمت سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ صرف قسم دوم ہیں۔ امام زرکشی نے اس تقسیم کو پسند کیا ہے اور اس تقسیم میں علماء سے جو تفسیر مختص کی گئی ہے اور اسی کو عام اصطلاح میں تاویل کہا جاتا ہے۔ یعنی تاویل محمود۔ وہ مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔ ورنہ وہ تاویلِ محمود نہیں ہوگی، تاویلِ مذموم اور تحریف کہلائے گی۔

(۱) تاویل جس آیت کی کیجائے وہ ماقبل آیت کے مطابق ہو۔ (۲) اور مابعد آیت کے بھی موافق ہو۔ (۳) لغۃً آیت کے مفہوم میں اس کی گنجائش ہو۔ (۴) کتاب و سنت کے خلاف نہ ہو۔ الاتقان ج۲ ص۳۱۱ میں ہے

قَالَ قَوْمٌ مِّنْهُمُ الْبَغَوِیُّ وَالْكَوَاشِیُّ
التَّاوِیْلُ صَرْفُ الْاٰیَةِ اِلٰی مَعْنًی مُّوَافِقٍ
لِمَا قَبْلَهَا وَمَا بَعْدَهَا تَحْتَمِلُهُ الْاٰیَةُ غَیْرَ
مُخَالِفٍ لِّلْکِتَابِ وَالسُّنَّةِ۔

تاویل کی صحت کی تین شرطیں بغوی اور کواشی نے نقل کی ہیں (۱) سابق آیت سے موافقت (۲) مابعد آیت سے مطابقت (۳) کتاب و سنت کا مخالف ہونا۔

(۵) امام زرکشی نے علامہ زمخشری سے پانچویں شرط یہ نقل کی ہے کہ اس تاویل و تفسیر سے قرآن کی معجزانہ بلاغت میں نقص واقع نہ ہوتا ہو، بلکہ بلاغتِ اعجازی برقرار رہے۔

قَالَ الزَّمَخْشَرِيُّ مِنْ حَقِّ مُفَسِّرِ كِتَابِ اللّٰهِ الْبَاهِرِ وَ كَلَامِهِ الْمُعْجِزِ أَنْ يَتَعَاهَدَ فِيْ مَذَاهِبِهِ بَقَاءَ النَّظْمِ عَلٰى حُسْنِهِ وَالْبَلَاغَةِ عَلٰى كَمَالِهَا[1]

مفسّر قرآن پر لازم ہے کہ وہ تفسیر کی تمام راہوں میں یہ پیش نظر رکھے کہ نظم قرآن کی خوبی بلاغتِ قرآن کا کمال باقی رہے۔ اس سے چوتھی شرط معلوم ہوئی۔ علامہ زمخشری کی رائے بالکل درست ہے قرآنی آیت کا جو اصلی مقصد ہے اس کے لئے قرآنی تفسیر میں اعجازی شان موجود ہے۔ لیکن اگر معنی بدل جائے اور خود ساختہ معنی کئے جائیں تو قرآنی تفسیر کی اعجازی شان ختم ہو جاتی ہے اور خود الفاظ قرآنی کی نظمِ قرآنی اور سیاق وسباق میں خود ساختہ معنی کے اعتبار سے شانِ دلالۃ و ارتباط کمزور ہو جاتی ہے (۶) کتاب وسنّت میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ ایک آسمانی حق ہے اور حق ناقابلِ تقسیم ہے۔ اس لئے قرآن کی جس آیت کی بھی تفسیر کی جائے، اس میں دیکھنا ہوگا کہ وہ تفسیر یا وہ مراد قرآن کے دیگر مقامات یا سنّت نبوی کے مطالب سے ٹکراتی تو نہیں۔ اگر ٹکراتی ہے تو یہ اس امر کی دلیل ہے، کہ یہ تفسیر خود ساختہ اور تحریف ہے۔ حق ایک دوسرے سے نہیں ٹکراتا۔ اس لئے تفسیر وہی صحیح ہوگی جس میں تعارض و تصادم نہ ہو۔ اس سے حقیقی تعارض مراد ہے ورنہ ظاہر تعارض مضر نہیں۔ اس کو تامل فی القرآن سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے ہر آیت کی تفسیر میں مفسّر کی نگاہ پوری کتاب و سنّت پر ہو، تاکہ اس کی تفسیر مجموعی کتاب وسنّت کے خلاف نہ ہو۔ (۷) اسی طرح صحابہ و تابعین و تبع تابعین جو کہ خیر القرون ہیں اور فہم قرآن کی نعمت سے ممتاز حصّہ رکھتے ہیں۔ مابعد کی کوئی تفسیر جو ان کی تفاسیر کی مجموعی روح کے خلاف ہو تحریف ہے اور قابلِ پذیرائی نہیں۔ البتہ اگر کوئی ماہر مفسّر شرائط تفسیر کے تحت ایسے مطالب بیان کرے جو سلف نے بیان نہیں کئے۔ لیکن سلف نے اُن کے خلاف بھی بیان نہیں کیا۔ تو ایسے تحت الضوابط معارف قرآنیہ کا دروازہ مابعد کے لوگوں کے لئے بھی بند نہیں اور تدبر فی القرآن کے ذریعے استخراج معارف و اسرار کا سلسلہ رہتی دنیا تک جاری رہیگا

[1] البرہان جلد ا صا۳۱

حدیث میں آیا ہے لَا یَنْتَہِیْ عَجَائِبُہٗ قرآن کے مضامین عجیبہ ختم نہ ہوں گے۔ اس کے متعلق امام شافعی کا ارشاد ہے۔

جَمِیْعُ مَا تَقُوْلُہُ الْاُمَّۃُ شَرْحٌ لِّلسُّنَّۃِ	ائمہ مجتہدین نے جو احکام اجتہاد سے نکالے
وَجَمِیْعُ السُّنَّۃِ شَرْحٌ لِّلْقُرْاٰنِ وَ	ہیں، وہ شرحِ حدیث و سُنّت ہے اور
جَمِیْعُ الْقُرْاٰنِ شَرْحٌ لِّلْاَسْمَآءِ	پوری سنّت قرآن کی شرح ہے اور قرآن اللہ تعالےٰ
الْحُسْنٰی وَصِفَاتِہِ الْعُلْیَاتِہ۔	کے اسماء الحسنٰی اور صفاتِ عالیہ کی شرح ہے۔

اور ان اسرار کے متعلق حضرت ابنِ مسعود کا ارشاد ہے:۔

قَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ مَّنْ اَرَادَ الْعِلْمَ	جو علم چاہے تو قرآن کی جستجو سے
فَیْشُوْرُ الْقُرْاٰنَ فَاِنَّ فِیْہِ عِلْمَ	مضامین کرے۔ اس میں اولین و آخرین
الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ۔	کا علم ہے۔ مراد اصولِ علم ہے۔

(رَوَاہُ الْبَیْہَقِیُّ فِی الْمَدْخَلِ)

اسی کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ تبیان لکل شی وتفصیلا لکل شی ۔ الغرض دین کے کل اصول قرآن میں موجود ہیں اور اسرار دین بھی قرآن سے فیضان الٰہی کے تحت اللہ تعالےٰ کے مخصوص بندوں پر فائز ہوتے رہتے ہیں۔ اِس فیضان کے لئے دیکھو روح المعانی جلد ا صک۔ اس قسم کے فیوضات کو تفسیرِ اشاری کہا جاتا ہے۔ باطنیہ کی تفسیر اشاری میں چونکہ ظاہری معنے کا انکار ہے اس لئے وہ مردود ہے اور اہل السنۃ کے صوفیہ نے جو اشاری تفسیریں کی ہیں ان میں اہم چار ہیں تفسیر نیشاپوری، تفسیر الالوسی، تفسیر التستری سہل بن عبداللہ التستری المتوفی ۲۸۳ھ ولم یتم وتفسیر الالوسی المتوفی ۱۲۷۰ھ وتفسیر محی الدین ابن العربی المتوفی بدمشق ۶۳۸ھ اور یہ سب حضرات ظاہری معنی قرآن کو تسلیم کرنے کے بعد اشاری تفسیر کرتے ہیں جن کے متعلق زرکشی برہان میں لکھتے ہیں:۔

کَلَامُ الصُّوْفِیَّۃِ فِیْ تَفْسِیْرِ الْقُرْاٰنِ	صوفیہ کا کلام تفسیر نہیں بلکہ واردات
قِیْلَ لَیْسَ بِتَفْسِیْرٍ وَّاِنَّمَا ھُوَ مَعَانٍ	اور وجدانیات ہیں جو وہ تلاوت قرآن

وَمَوَاجِیْدُ یَجِدُوْنَ عِنْدَ التِّلَاوَةِ۔	کے وقت محسوس کرتے ہیں۔

ابن الصلاح اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں۔

وَجَدْتُ عِنْدَ الْاِمَامِ اِبِی الْحَسَنِ	میں نے ابُوالحسن الواحدی سے معلوم
الْوَاحِدِیِّ اَنَّہٗ قَالَ صَنَّفَ اَبُوْ	کیا کہ ابو عبدالرحمان السلمی نے حقائق
عَبْدِالرَّحْمَانِ السُّلَمِیُّ حَقَائِقَ التَّفْسِیْرِ	التفسیر لکھی ہے۔ اگر وہ اس کو تفسیر
فَاِنْ کَانَ اِعْتَقَدَ اَنَّہٗ تَفْسِیْرٌ فَقَدْ	سمجھتا ہے، تو کافر ہے۔ ابن
کَفَرَ قَالَ ابْنُ الصَّلَاحِ اِنَّہٗ لَمْ	الصلاح فرماتے ہیں کہ انہوں نے
یَذْکُرْہُ تَفْسِیْرًا وَّلَا ذَهَبَ بِهٖ	بطور تفسیر اس کو ذکر نہیں کیا
مَذْهَبَ الشَّرْحِ لِلْکَلِمَةِ فَاِنَّہٗ لَوْ	ہے اور نہ کسی لفظ کی تشریح قرار
کَانَ کَذٰلِكَ کَانُوْا قَدْ سَلَکُوْا	دی گئی، اگر ایسا ہوتا تو یہ باطنیت
مَسْلَكَ الْبَاطِنِیَّةِ وَاِنَّمَا ذَالِكَ	ہے۔ بلکہ قرآنی مدلول کی نظیر
مِنْهُمْ ذِکْرُ نَظِیْرٍ لِمَا وَرَدَ بِهِ الْقُرْاٰنِ	کو ذکر کیا گیا ہے۔ کہ نظیر سے نظیر
فَاِنَّ النَّظِیْرَ یُذْکَرُ بِالنَّظِیْرِ۔	یاد آتی ہے۔

ان اقوال سے معلوم ہوا کہ صوفیہ تفسیر کو نہیں بلکہ مقاصد قرآن کی نظیر کو بیان کرتے ہیں۔ اس سے باطنیہ اور صوفیہ کی تفسیر کا فرق معلوم ہوا۔ اوّل ظاہر قرآن کا انکار کرتے ہیں لیکن صوفیہ ظاہر قرآن کو تسلیم کرتے ہیں۔ مناہل العرفان جلد ا ص۵۴۵ میں ہے۔

ومن ههنا یعلم الفرق بین تفسیر	یہاں سے صوفیہ اور باطنی ملحدین کا
الصوفیة المسمی بالتفسیر الاشاری	فرق معلوم ہوا۔ صوفیہ ظاہری معنی
وبین تفسیر الباطنیة الملاحدة	کا انکار نہیں کرتے، بلکہ ترغیب
فالصوفیة لا یمنعون ارادة	دیتے ہیں۔ اور ضروری سمجھتے ہیں

الظاهر بل يحضون عليه ويقولون	جو ظاہری مراد کی پختگی کے بغیر اسرار
لابدمنه اولا اذمن ادعیٰ فهم	قرآن کا دعوٰے کرے، تو یہ ایسا
اسرار القران ولم يحكم الظاهر	ہے جیسا کوئی کہے کہ میں دروازے
كمن ادعیٰ بلوغ سطح البيت قبل	سے گذرے بغیر اندر گیا۔
ان يجاوز الباب۔	(مناہل العرفان جلد ا صـ۵۴۷)

صاحب مناہل نے تفسیر اشاری کے مقبول ہونے کے لئے پانچ شرطیں بیان کی ہیں۔

۱۔ ظاہر معانی قرآن کے خلاف نہ ہو۔

۲۔ یہ دعوی نہ کیا جائے کہ اشاری معنی مراد ہے اور ظاہر معنی نہیں۔

۳۔ الفاظ قرانی کی تاویل بعید نہ ہو کہ الفاظ من حیث العربیۃ اس کے خلاف ہوں۔

۴۔ اشاری تفسیر شرع اور عقل کی معارض نہ ہو۔

۵۔ اشاری مضمون شرعی دلیل سے مؤید ہو۔

مناہل العرفان جلد ا صـ۵۴۹ امام ابن تیمیہ نے قرآن کی ہر اس تفسیر کو غلط قرار دیا ہے جو صحابہ اور تابعین کی تفسیر کے خلاف ہو۔ اصول التفسیر میں لکھتے ہیں:۔

وَفِى الْجُمْلَةِ مَنْ عَدَلَ عَنْ مَذَاهِبِ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِيْنَ وَتَفْسِيْرِهِمْ اِلٰى مَا يُخَالِفُ ذَالِكَ كَانَ مُخْطِئاً فِىْ ذَالِكَ بَلْ مُبْتَدِعاً لِاَنَّهُمْ اَعْلَمُ بِتَفْسِيْرِهٖ وَمَعَانِيْهِ كَمَا اِنَّهُمْ اَعْلَمُ بِالْحَقِّ الَّذِىْ بَعَثَ اللّٰهُ بِهٖ رَسُوْلَهٗ۔ انتهىٰ

یعنی ہر وہ تفسیر جو صحابہ وتابعین کی تفسیر کے خلاف ہو اس کا مفسر غلطی کا مرتکب ہے اور بدعتی ہے کیونکہ قرآن کی تفسیر اور معانی کے وہ سب سے بڑا علم رکھنے والے ہیں۔ جیسے کہ حضور علیہ السّلام کے لائے ہوئے حق کے وہ بہت بڑے عالم ہیں۔ امام سیوطی اتقان جلد ۲ صـ۱۷۸ میں اسی کے

متعلق لکھتے ہیں وَھُوَ نَفِیْسٌ جِدًّا یعنی بہت قیمتی اور عمدہ بات ہے۔ لیکن اس کے ساتھ لکھتے ہیں کہ صحابہ اور تابعین کی سند کی صحت کی تحقیق کرنی چاہیئے کہ ان سے منقول روایات میں ضعیف اور مصنوعی بھی موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام احمدؒ نے فرمایا ثَلَاثُ کُتُبٍ لَا اَصْلَ لَهَا الْمَغَازِیُ وَالْمَلَاحِمُ وَالتَّفْسِیْرُ۔ جن کی تشریح امام احمدؒ کے محقق اصحاب نے یہ کی ہے کہ ان تینوں کے اکثر حصے ایسے ہیں کہ ان کے لئے اسانید صحیحہ متصلہ نہیں، ورنہ ان میں صحیح بھی موجود ہیں[1] بلکہ اسرائیلیات بھی ان روایات میں موجود ہیں، جن کی تنقیح ضروری ہے۔ امام ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں تنقید کی ہے۔

ازالۂ شبہ | اتقان جلد ۲ ص ۱۸۴ میں بروایۃ حسنؒ بصری مرفوعاً روایت ہے ۔

لِكُلِّ اٰيَةٍ ظَهْرٌ وَّبَطْنٌ وَّلِكُلِّ حَرْفٍ حَدٌّ وَّلِكُلِّ حَدٍّ مَّطْلَعٌ۔

پہلے فقرہ کا معنی کہ قرآن کے لئے ظاہر اور باطن ہے چند ہیں۔

۱۔ ظاہر سے مراد لفظ اور باطن سے مراد معنے ہے۔

۲۔ ظاہر سے مراد اس وقت کے موجود لوگوں کا عمل ہے اور باطن سے مراد آنے والے لوگوں کا عمل ہے۔

۳۔ ابو عبیدہؓ کے نزدیک ظاہر سے مراد اُمم ماضیہ کے واقعات اہلاکیہ کا بیان ہے اور باطن سے مابعد کے لوگوں کی تحذیر ہے۔

۴۔ ابن النقیب کے نزدیک ظاہر سے مراد احکام ظاہرہ ہیں اور باطن سے اس کے اسرار ہیں[2] ہمارے نزدیک آخری قول سب سے راجح ہے۔ دوسرے فقرے لِكُلِّ حَرْفٍ حَدٌّ کا معنی یہ ہے کہ حد سے مراد احکام حلال وحرام اور تیسرے فقرے لِكُلِّ حَدٍّ مَّطْلَعٌ سے مراد اُن احکام حلال وحرام کے نتائج وثمرات ہیں جیسے وعدہ جنت وعید دوزخ۔ اور یہی معنی ابن عباسؓ کے اس قول کا بھی ہے جو ابن ابی حاتمؒ نے نقل کیا ہے۔ اَلْقُرْاٰنُ ذُوْ شُجُوْنٍ وَّفُنُوْنٍ وَّظُهُوْرٍ وَّ

---

[1] اتقان جلد ۲ ص ۱۷۸ [2] اتقان جلد ۲ ص ۱۸۴ [3] اتقان جلد ۲ ص ۱۸۵

طُوْنٍ لَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُہٗ ۔ خود ابنِ عباس سے اتقان جلد ۲ ص۱۸۴ میں اس آیت کی اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْ اٰیٰتِنَا لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا[1] (جو لوگ ہماری آیتوں کی ملحدانہ تفسیر کرتے ہیں وہ ہم سے پوشیدہ نہیں) یہ تفسیر کی ہے ھُوَ اَنْ یُّوْضَعَ الْکَلَامُ غَیْرَ مَوْضِعِہٖ ۔ یعنی اس الٰہی وعید کے مصداق وہ لوگ ہیں جو قرآن کے معنی کو بدلاتے ہیں۔ اسمیں تمام باطنی فرقے اور مغرب زدہ ملحد داخل ہیں ۔ باطنیوں میں قرامطہ ہوں یا اسمٰعیلیہ یا امامیہ آیت وَوَرِثَ سُلَیْمٰنُ دَاوٗدَ[2] کا یہ معنی کیا ہے کہ اس سے حضرت علی کی وراثتِ علمی مراد ہے یا جنابت سے راز کا افشار اور غسل سے عہد و پیمان کی تجدید مراد ہے اور طہارت سے مراد ہر اعتقاد سے بجز متابعتِ امام کے بری ہونا ہے۔ صوم سے مراد افشار راز سے بچنا ہے ۔ صفا سے مراد پیغمبر اسلام اور مروہ سے حضرت علیؓ ہے ۔ اسی طرح کعبہ سے مراد حضورؐ اور باب کعبہ سے مراد علیؓ ہے ۔ نارِ ابراہیم علیہ السلام سے مراد نمرود کا غصہ اور عصائے موسیٰ سے حجت و دلیل موسےٰ علیہ السلام مراد ہے ، اسی طرح دیگر خرافات[3] ۔ اسی طرح تمام وہ تفاسیر بھی جو مغرب زدہ طبقہ نے ہمارے زمانے میں لکھی ہیں وہ الحاد کی وعید میں داخل ہیں ۔

عبد العظیم زرقانی مناہل العرفان جلد ۲ ص۵۴۳ میں لکھتے ہیں ۔ قرآن کی ان تحریفات سے بڑھ کر اسلام اور مسلمانوں کیلئے کوئی اور مصیبت نہیں۔ اس سے اسلام کی پوری بنیاد کو مسمار کرنا چاہتے ہیں۔

فصل چہارم ــــــ وحی اور نزولِ قرآن کی حقیقت

وحی کے معنے اَلْاِشَارَۃُ السَّرِیْعَۃُ ۔ یعنی اشارہ سے جلد سمجھنا ۔ یا اَلْاِعْلَامُ فِیْ خِفَاءٍ ۔ (فتح الباری ابتدار، جلد اوّل) یعنی دوسرے کو پوشیدہ طور پر کچھ بتلانا ۔ یہ وحی کے لغوی معنی ہیں ۔ شرعی معنی الاعلام بالشرع یعنی صرف شرعی احکام بتلانے کا نام وحی ہے ۔ وحی لغوی کی تین قسمیں ہیں ۔

۱۔ فطری ۲۔ ایجادی ۳۔ عرفانی

---

[1] سورة حم السجدة آية ۴۰ [2] سورة النمل آية ۱۶ [3] مناہل العرفان جلد ۲ ص۵۴۳

فطری | فطری جیسے الہامِ الٰہی سے شہد کی مکھیاں چھتہ بنا کر اس میں شہد جمع کرتی ہیں۔ اسی طرح دیگر حیوانات کے کارنامے بھی۔ اسی قسم کی وحی حیوانات سے مختص ہیں۔ قرآن میں ہے۔

وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا (النحل آیۃ ۶۸)	ہم نے شہد کی مکھیوں کو وحی فطری سے بتلایا کہ تم پہاڑوں میں اپنے لئے چھتہ بناؤ۔

ایجادی | جیسے یورپ کے سائنس دان ایک چیز کی ایجاد کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس کیلئے جد وجہد کرتے ہیں تو اس مطلوب چیز کی صورت اور نقشہ خالقِ کائنات کی طرف سے اُنکے ذہنوں پر فائض ہوتا ہے اور چیز وجود میں آتی ہے۔ مثلاً پہلا شخص جس نے ہوائی جہاز بنانا چاہا، تو اُس نے چونکہ قبل از ایجاد ہوائی جہاز نہیں دیکھا تھا اس لئے اُس نے ابتداء میں ایک اوپر کو اُڑ جانے والی چیز کے اجمالی تخیل کو مقصد بنا کر کام شروع کیا اور اپنا ذہن اُس کی طرف متوجہ کیا۔ بار بار کے تجربے کی تکلیف اٹھائی یہاں تک کہ قدرتِ الٰہی نے ہوائی جہاز کا مکمل نقشہ اُس کے ذہن میں ڈالا۔ موجد کا کام ذہن متوجہ کرنا تھا، خدا کا کام مطلوبہ چیز کا نقشہ ڈالنا۔ یہی وہ وحی والہام ہے جو عام انسانوں کو ہوتا ہے، چاہے غیر مومن ہو۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰۤؤُلَآءِ وَهٰۤؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ط وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ط (بنی اسرائیل آیۃ ۱۹)	یعنی مومن اور غیر مومن دونوں جب کوشش کرتے ہیں تو ہم اُن کو مدد دیتے ہیں۔ تیرے خدا کی بخشش وفیض کسی سے بند نہیں۔

یہی وحی عام انسانوں سے مختص ہے چاہے کافر ہو۔

عرفانی | تیسری قسم عرفانی ہے جو اولیاء سے مختص ہے کہ جب کوئی ولی اتباعِ شریعت اور ریاضت سے تزکیہ قلب حاصل کر لیتا ہے تو اس پر خاص علوم، الہام کی راہ سے فائض ہوتے ہیں جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے:۔

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط (عنکبوت آیۃ ۶۹)	جو لوگ راہِ دین اور اطاعت میں مجاہدہ کرتے ہیں تو ہم اُن پر ہدایت کی خاص راہیں کھول دیتے ہیں

یہ ہدایت معارفِ الہامیہ سے ہے جو عام ہدایت ایمانی کے علاوہ ہیں کیونکہ ایمانی ہدایت تو مجاہدہ کرنے والے کو پہلے سے حاصل ہے یہ وحی یا الہام اولیاء سے مختص ہیں اور یہ تینوں قسمیں باوجود فرق مراتب کے لغوی اور عام معنی میں وحی ہے جو غیر انبیاء علیہم السلام میں پائی جاتی ہیں، خواہ حیوان ہو، یا انسان، یا اولیاء۔

وحی شرعی

چوتھی قسم وحی شرعی ہے جو صرف انبیاء علیہم السلام سے مختص ہے۔ اگرچہ ہر نبی ولی بھی ہوتا ہے اس لئے وحی عرفانی سے بھی موصوف ہے لیکن نبی کی وحی عرفانی بھی وحی شرعی کی قسم ہے۔ جو قانونی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن ولی کا الہام قانونی حیثیت نہیں رکھتا۔ کتبِ کلام کا عام مسئلہ ہے:۔

وَالْاِلْهَامُ لَيْسَ بِحُجَّةٍ عِنْدَ الشَّرْعِ — یعنی ولی کا الہام شرعی قانون نہیں بن سکتا

وحی شرعی کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے بواسطہ ملک یا براہ راست خواب یا بیداری میں الہٰی ہدایت الفاظ کی شکل میں نبی کی ذات میں منتقل ہو جاتے۔ اسی حقیقت کو وحی شرعی کہا جاتا ہے اور یہی نبوت کی روح ہے اس تعبیر میں وحی کی وہ تمام شکلیں آجاتی ہیں جو اتقان جلد ۱ ص۴۲ میں مذکور ہیں۔ وحی اور نبوت کی یہ حقیقت جو آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر خاتم الانبیاء پر ختم ہوئی۔ کوئی خلاف عقل یا ناممکن چیز نہیں اور نہ دنیا کا کوئی فلسفہ اس کی تردید کر سکتا ہے۔ انسان جو خدا کے مقابلہ میں ہر لحاظ سے ہیچ ہے وہ ایک بیجان آلہ (ٹیپ ریکارڈر) کے ذریعے الفاظ منتقل کر سکتا ہے اور روزانہ ہم اس کا مشاہدہ کرتے ہیں تو کیا خالق انسان اور خالقِ عالم کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی بیجان آلہ میں نہیں بلکہ ایک مقدس انسان میں الفاظ وحی منتقل کر سکے۔

وحی نبوت | جدید علمی تحقیق کی رو سے بھی ایک ثابت شدہ حقیقت ہے جو ہم منکرین وحی کی تسکین قلب کے لئے پیش کرتے ہیں۔ صاحب مناہل العرفان نے جلد ۱ ص۵۹ تا ص۶۱ میں ہپنا ٹیزم مقناطیسی جو مسمریزم کی ایک قسم ہے اس کے ایک جرمن ماہر ڈاکٹر (مسمر) کے بے شمار تجربات سے چند ثابت شدہ اصولوں کو پیش کیا ہے جن میں سے ایک یہ ہے کہ ایک اکمل ترین انسان کے لئے عام عقل کے علاوہ ایک

باطنی بلند تر عقل ہوتی ہے کہ اسی عقلِ باطنی سے وہ عالمِ محسوس کے علاوہ عالمِ غیب سے تعلق پیدا کرتی ہے جس سے وہ الفاظ اور معلومات حاصل کر لیتی ہے اور عالمِ غیب سے ایسے امور بیان کرتی ہے جو مادی عالم میں نہیں لیکن وہ بالکل درست ہوتی ہے ۔ اس کے بعد مناہل العرفان کے مصنّف نے مصر میں اپنا چشم دید واقعہ ذکر کیا ہے کہ عیسائی مبلغین نے تنویمِ مقناطیسی کے ذریعے تبلیغِ مسیحیت کیلئے مخصوص شخص پر جو اُن کی نظر میں عامل کے ساتھ مناسبت رکھتا تھا اثر ڈالنا شروع کیا ۔ جس کی وجہ سے عامل یعنی اثر انداز نے معمول کو ـــــ یعنی جس پر اثر ڈالنا مقصود تھا ـــــ نیم بیہوش کر دیا اور اس سے باتیں شروع کیں کہ تمہارا نام کیا ہے ؟ اس نے اپنا اصلی نام بتلایا ۔ عامل نے اپنی روح کی توجہ سے اس میں یہ اثر پیدا کیا کہ تمہارا نام فلاں ہے یعنی اصلی نام کی بجائے مصنوعی نام بتلایا ۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ معمول اصلی حالت پر آیا ، تو اُس نے وہی مصنوعی نام بتلانا شروع کیا اور اپنے اصلی نام سے انکار کیا ۔ جس سے ثابت ہوا کہ ایک مخلوق انسان دوسرے مخلوق انسان کی روح میں اپنے الفاظ کو راسخ اور مضبوط طور پر منتقل کرنے کی قوت حاصل کر سکتا ہے اور ایک انسانی روح کی دوسری انسانی روح پر اثر اندازی ہو سکتی ہے ، تو کیا خالقِ کائنات مخلوق میں خود یا بتوسط ملک اور جبرائیلؑ ، جو لاکھوں انسانوں سے قوی تر ہے کسی مخصوص اور ممتاز شخصیّت (نبی) میں الفاظ وحی منتقل نہیں کر سکتا ؛ یہی وہ جدید علمی تحقیق ہے جس نے منکرینِ وحی کو حیرت زدہ کر دیا ہے اور ان میں بڑی تعداد ماوراء مادہ یعنی روحانی اثرات کی قائل ہو گئی ہے ۔ مزید تحقیق دائرۃ المعارف فرید وجدی بحث روح میں ملاحظہ فرمائیں ۔ اب یہ مسئلہ شک ، وشبہ سے بالاتر سمجھا جاتا ہے ۔ سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ط (خاتمہ سورہ فصّلت میں) ہم ان منکرین کو دکھائیں گے بیرونی جہاں میں اور خود انسان کی رُوح میں دلائلِ قدرت کہ اُن پر یہ حقیقت کھل جائے گی کہ وحی و نبوّت محمّدی حق ہے ۔

نزُولِ قرآن

نزول لغتِ عرب میں کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔

۱۔ کسی جسم کا مکان میں ٹھیرنا جیسے :۔

نَزَلَ الْاَمِیْرُ الْمَدِیْنَةَ ۔	یعنی امیر نے شہر میں قیام کیا۔
رَبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا ط [۱]	اے میرے رب مجھے برکت والی جگہ میں ٹھیراؤ۔

۲۔ کسی جسم کے اوپر سے نیچی جگہ میں اُترنا جیسے :۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا ط	ہم نے آسمان سے برکت والا پانی اُتارا ہے۔

قرآن حکیم کے الفاظ جسمیت اور مکانیت سے منزہ ہے لہٰذا نزولِ قرآن سے اعلام مراد ہے یعنی خدا کی طرف سے بواسطہ ملک رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو الفاظِ قرآن بتلانے کا نام نزولِ قرآن ہے اور اس تعبیر میں قرآن کی عظمت و شان بتلانا مقصود[۲] ہے کہ انسان کے پاس ایک بلند مقام کی چیز آ گئی ہے، یا قرآن پر نزول کا اطلاق قرآن کے لانے والے ملک یعنی جبرئیل کے اعتبار سے ہے۔ کہ وہ بلند مقام سے زمین پر اُترا اور اس کا یہ نزول بالواسطہ قرآن کا بھی نزول ہے۔

۳۔ تیسرا معنی نزول کا یہ بھی ہے کہ خود ایک چیز اوپر سے نیچے نہیں آئی لیکن اس کے اسباب عالمِ بالا سے متعلق ہوں خواہ ارادۂ الٰہیہ ہو یا آسمانی تاثیرات۔ اس اعتبار سے لوہے، مویشیوں اور انسانی لباس اور پوشاک پر بھی قرآن حکیم میں نزول کا لفظ استعمال ہوا۔

وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ	ہم نے لوہے کو اُتارا جس سے جنگ کے
وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ط (الحدید آیۃ ۲۵)	ہتھیار بھی بنتے ہیں اور دیگر فائدہ مند چیزیں بھی۔
وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَةَ	ہم نے تمہارے فائدے کے لئے مویشیوں کے
اَزْوَاجٍ ط	آٹھ جوڑے اتارے ہیں۔
اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ	ہم نے لباس اتارے جو تمہارے بدن پر ہو کر
سَوْاٰتِكُمْ ط (الاعراف آیۃ ۲۶)	تمہاری شرمگاہوں کو ڈھانکیں۔

ان تینوں چیزوں کے اسباب سماوی ہیں اس لئے ان کے لئے بھی نزول کا لفظ استعمال ہوا۔

---

[۱] سورۃ مؤمنون آیۃ ۲۸۔ [۲] مناہل جلد ۱ صفحہ ۳۴

نزول سے پھر دو لفظ مزید بنتے ہیں۔ انزال اور تنزیل۔ تنزیل تدریجاً مختلف اوقات میں آتاری ہوئی چیز کے لئے استعمال ہوتا ہے اور انزال کا لفظ عام ہے، خواہ کوئی چیز یکبارگی اور دفعتہً اتاری جائے یا آہستہ آہستہ تدریجاً۔ چنانچہ عذاب کے لئے بھی انزال کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جیسے :-

اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰۤى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ۔ (عنکبوت آیۃ ۳۴)
ہم اس بستی والوں پر آسمان سے عذاب اتارنے والے ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ عذاب کا نزول دفعتہً ہوا، اور قرآن جس کا اُتارنا تدریجاً ہوا۔ اس کے لئے بھی نزول استعمال ہوا ہے جیسے :-

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ[1] (کہف آیۃ : ۱)
سب خوبیاں اُس اللہ کے لئے ہیں جس نے اپنے بندے پر یہ کتاب نازل فرمائی۔

قرآن کے تین تنزلات

نزولِ اوّل | بارگاہِ خداوندی سے لوحِ محفوظ میں۔ اس نزول کا قرآن کی اس آیت میں ذکر ہے۔
بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ۔ (البروج آیۃ : ۲۱-۲۲)

نزولِ دوم | لوحِ محفوظ سے سماء الدنیا کے مقام بیت العزۃ میں۔ یہ نزول سورۂ دخان، سورۂ قدر اور سورۂ بقرہ میں مذکور ہے۔ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ[2]۔ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ[3]۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ[4]۔ یہ دونوں نزول مجموعی شکل میں یکبارگی اور دفعتہً ہوئے۔ مذکورہ آیات میں تعارض نہیں کیونکہ لیلۃ مبارکہ اور لیلۃ القدر ایک ہے اور وہ رمضان المبارک میں ہے۔ لہٰذا بیت العزۃ میں رمضان کے مہینے میں قرآن لیلۃ المبارکہ یا لیلۃ القدر میں اتارا گیا۔ اسی نزول کو صراحت کے ساتھ ابنِ عباس نے مستدرک حاکم میں اور اسی طرح نسائی

---

[1] مفردات راغب ص۵۰۷ [2] دخان آیۃ : ۳ [3] القدر آیۃ : ۱ [4] البقرۃ آیۃ : ۱۸۵

اور بیہقی نے ابنِ عباس سے نقل کیا ہے۔

نزولِ سوم | بواسطہ جبرئیل قلبِ نبوی پر ہوا۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ۝[1] یہ نزول تقریباً تئیس سال میں مکمل ہوا، اور قلب سے یہ شبہہ نہ کیا جائے کہ معانی قرآن کا نزول ہوا ہوگا، بلکہ الفاظِ قرآن کا نزول تھا۔ اس لئے آیت مذکور میں قلب کے بعد یہ تصریح کی گئی ہے۔ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ۔ جس میں الفاظ کے نزول کو لسانِ عربی کہہ کر واضح کیا گیا ہے۔ قرآن کا دو بار دفعی نزول ہوا۔ اوّل لوحِ محفوظ میں اور دوم سماء الدنیا کی بیت العزت میں، سوم بار تدریجی نزول حضور پر ہوا۔ بخلاف دیگر کتبِ سماوی کے کہ ان کا نزول صرف ایک بار دفعۃً کتابی شکل میں ہوا۔ قرآن کے لئے دونوں نزول جمع ہوتے۔ جس کی حکمت آسمان کے ملائکہ کو قرآن کی آخری کتاب ہونے کی تعلیم تھی، یا سماء دنیا لانے میں حضور کے اشتیاق کو بڑھانا مقصود تھا کہ محبوب چیز کے قریب ہونے سے شوق میں اضافہ ہوتا ہے یا کمالِ حفاظت اور شک و شبہہ کا ازالہ مقصود تھا۔[2]

احقر کا خیال ہے کہ آخری کتاب ہونے کی وجہ سے اس کتاب کی حفاظت کا مکمل انتظام مقصود تھا۔ ایک بار انتظامِ عمومی کی صورت میں قرآن کو لوحِ محفوظ میں محفوظ کیا گیا۔ جو حکومت الٰہیہ کا مرکزی محافظ خانہ ہے۔ دوسری مرتبہ بیت العزت میں سماوی حفاظت کا انتظام کیا گیا تیسری مرتبہ حضور کے قلبِ اطہر پر نازل فرما کر آپ کے قلبِ مبارک میں ارضی حفاظتِ قرآن کا انتظام کیا گیا۔ پھر اُمتِ محمدیہ کے قلوب کو قرآن کی طرف مائل کرکے، چہارم مرتبہ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ[3] کے وعدہ کے مطابق اُمت کے سینوں حفاظتِ قرآن کا انتظام ہوا۔ بعدہٗ ابوبکر صدیق، حضرت عمر اور حضرت عثمان کو آمادہ کرکے تحریری صورت میں، پانچویں بار حفاظتی انتظام عمل میں لایا گیا۔

---

[1] الشعراء آیۃ: ۱۹۳ تا ۱۹۵ [2] مناہل العرفان جلد ۱ ص ۳۶ تا ۴۲ [3] الحجر آیۃ: ۹

جبرائیل نے قرآنی الفاظ کیسے حاصل کئے

اس میں صحیح قول یہ ہے کہ جبرائیل نے الفاظ قرآن کو اللہ جل جلالہٗ سے سُن کر حاصل کیا جسے بیقہی نے اِنَّا اَنزلنا کی تفسیر میں تحریر فرمایا ہے ۔ اس کی موید طبرانی کی حدیث ہے جو نواس بن سمعان سے مرفوعًا اس نے نقل کی ہے ۔

اِذَا تَکَلَّمَ اللّٰہُ بِالْوَحْیِ اَخَذَتِ السَّمَاءَ	یعنی جب اللہ تعالیٰ وحی کے ساتھ کلام کرتا
رَجْفَۃٌ شَدِیْدَۃٌ مِّنْ خَوْفِ اللّٰہِ	ہے تو آسمان خوف خداوندی سے کانپ
فَاِذَا سَمِعَ اَھْلُ السَّمَاءِ صَعِقُوْا	جاتا ہے اور جب آسمان کے فرشتے سُنتے ہیں تو
وَخَرُّوْا سُجَّدًا فَیَکُوْنُ اَوَّلُھُمْ	بیہوش ہو کر سجدے میں گر پڑتے ہیں۔ سب سے
یَرْفَعُ رَاْسَہٗ جِبْرِئِیْلُ فَیُکَلِّمُہٗ	پہلے جبریل سر اُٹھاتا ہے تو اللہ وحی کے ساتھ
اللّٰہُ بِوَحْیِہٖ مَا اَرَادَ فَیَنْتَھِیْ بِہٖ	اس سے کلام کرتا ہے تو وہ جہاں حکم ہوتا ہے
حَیْثُ اُمِرَ۔	وہیں وحی پہنچا دیتا ہے ۔

جبریل کی کیفیت تحصیل وحی غیبی معاملہ ہے جس میں رائے کی گنجائش نہیں ۔ لہٰذا یہی صورت سب سے ارجح ہے ۔ مناہل العرفان جلد ا صفحہ ۴۰، اتقان جلد ا صفحہ ۴۳ میں جبریل کا اللہ تعالیٰ سے بطور تلقف رُوحانی یعنی روحانی القاء یا لوحِ محفوظ سے حاصل کرنا بھی ذکر کیا گیا ہے ۔

منزّل الفاظِ قرآن جس طرح ایک انسان نفسِ کلام ذہن میں رکھتا ہے اور پھر الفاظ مرتّبہ کی شکل میں اس کو ادا کرتا ہے ، تو چاہے اس کو لاکھوں انسان پڑھ لیں وہ مرتّبِ اوّل کا کلام سمجھا جاتا ہے ۔ مثلاً امرأ القیس کا قصیدہ یا حریری کی مقامات کوئی بھی پڑھ لے لیکن وہ تدوینِ اُولیٰ کے اعتبار سے کلام امرأ القیس و حریری سمجھا جائے گا ۔ اسی طرح اللہ جل جلالہٗ نے اپنے نفسِ کلام کو الفاظِ قرآن کی شکل میں ظاہر فرمایا ۔ پھر جبریل اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور لاکھوں کروڑوں انسانوں نے اس کو پڑھا ۔ لیکن اس کو کلامِ اِلٰہی کہا جائے گا ، نہ کلامِ جبریل یا محمد علیہ السلام

قرآن میں ہے۔ حَتّٰی یَسْمَعَ کَلَامَ اللّٰہِ اور بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ۔ جس سے الفاظِ قرآن کا منجانب اللہ ہونا اور کلامِ الٰہی ہونا واضح طور پر ثابت ہوتا ہے۔ اگر مضمون کسی اور کا ہو مثلاً زید کا اور الفاظ مضمون کسی دوسرے کے ہوں مثلاً عمرو کے، تو اس کو کلامِ زید نہیں کہا جائیگا بلکہ کلامِ عمرو کہا جائے گا۔ اس لئے قرآن کے الفاظ و معانی ہر دو منجانب اللہ ہیں اور قرآن اسی کا مرتب کردہ ہے۔ ہم اس سے زیادہ کلامی پیچیدگیوں میں پڑنا نہیں چاہتے کہ اس کا چنداں فائدہ نہیں۔ مناہل العرفان میں مندرجہ بالا مضمون موجود ہے۔

قرآن، سنّت اور حدیثِ قدسی کا فرق

سیوطی نے امام جوینی سے نقل کیا ہے کہ قرآن کے الفاظ اور معانی بتوسط جبرئیل دونوں منزل من اللہ ہیں اور حدیث میں مضمون من جانب اللہ ہے اور عبارت اور الفاظ رسول اللہ کے ہیں[1]۔ حدیث قدسی وہ ہے جس کے الفاظ اللہ کی طرف سے ہوں لیکن معجز نہ ہوں اور نہ ان کے الفاظ کی تلاوت میں وہ ثواب مرتب ہوتا ہو جو قرآن کے ایک ایک حرف پر مرتب ہوتا ہے۔ اور نہ نماز میں اس کی قرارت مامور ہے[2]۔ احقر کی رائے میں حدیث نبوی اور حدیثِ قدسی دونوں کے مضامین من اللہ ہیں لیکن حدیثِ نبوی کا انتساب الی اللہ معنوی ہے اور اس کا القاء فی الحقیقت من جانب اللہ ہے لیکن اس کا انتساب صریح الفاظ میں خدا کے حوالہ سے بیان نہیں کیا گیا۔ لیکن حدیث قدسی میں امرِ الٰہی کے تحت صریح الفاظ میں خدا تعالےٰ کی ذاتِ اقدس کی طرف انتساب بھی ضروری ہوتا ہے۔ اسی انتسابِ صریح کی وجہ سے حدیث قدسی کے الفاظ کی تبدیلی اور روائیت بالمعنی جائز نہیں، لیکن حدیثِ نبوی کی جائز ہے بشرطیکہ اصلی معنوں میں فرق نہ آئے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیثِ قدسی کو حدیث کہا گیا ہے جو الفاظِ نبوی کے لئے مختص ہے۔ لفظ قدسی کا اضافہ انتسابِ صریح کی وجہ سے کیا گیا ہے جس میں حدیثِ نبوی سے اس کی مزید خصوصیت اور اہمیت کا اظہار مقصود ہے۔ واللہ اعلم۔

---

[1] اتقان جلد ۱ صفحہ ۴۲ [2] مناہل العرفان فی علوم القرآن جلد ۱ صفحہ ۴۴

نزولِ وحی کی قسمیں

وحی بتوسط ملک ہوگی یا باالذات ۔ وحی ملکی کی تین قسمیں ہیں

وحی تصلصلی ۲- وحی تمثلی ۳- وحی رُوعی

وحی تصلصلی میں حقیقتِ جبرئیلیہ ملکیت پر برقرار رہ کر القار وحی کرتی ہے جس کو حدیث بخاری میں وھو اشدہ علیّ کہا گیا ۔ بشریت اور ملکیّت میں عدم تجانس کی وجہ سے بھی اس قسم میں شدت ہے اور حضور علیہ السلام کے عروج الی الملکیۃ کی وجہ سے بھی ہے کہ ذاتِ نبوی میں تصرّف کیا گیا، جو موجب شدّت ہے ۔

دوم وحی تمثلی کہ جبرئیل انسانی صورت میں متمثل ہو کر القار وحی کر دے ۔ اس صورت میں جبرئیل نے ملکیت سے بشریت کی طرف تنزّل کیا ۔ یہ دونوں قسمیں اور اوّل قسم کا دوم سے اشد ہونا بخاری کی ابتدار میں مذکور ہیں اور عام قرانی وحی ان دونوں صورتوں میں آئی ہے ۔

تیسری قسم رُوعی ہے کہ جبرئیل قلبِ نبوی میں وحی کا القار کر دے اور قوۃ سامعہ اور کان کو اس سے تعلق نہ ہو (اخرجہ الحاکم)

یہ تین اقسام باالواسطہ وحی کی ہیں ۔ باالذات وحی کی دو قسمیں ہیں ۔ یا بیداری میں جیسے شبِ معراج میں اللہ کی طرف سے براہِ راست رسولِ کریم علیہ السلام کو وحی ہوئی یا خواب میں جیسے حدیث معاذ میں ہے أَتَانِیْ رَبِّیْ فَقَالَ فِیْمَ یَخْتَصِمُ الْمَلَأُ الْاَعْلٰی ۔ یعنی خواب میں خدا میرے پاس آئے اور فرمایا کہ عالم بالا کے فرشتے کس چیز میں بحث کرتے ہیں ۔ (اتقان جلد ا صفحہ ۴۵،۱۴) بتصرف ویقظیاً یعنی بیداری میں جیسا کَمَا فِی الْوَحْیِ لَیْلَۃَ الْاِسْرَاءِ مِنْ اِیْجَابِ الصَّلٰوۃِ الْخَمْسِ وَخَوَاتِیْمِ سُوْرَۃِ الْبَقَرَۃِ ۔

فصل پنجم

جمع و تدوین قرآن

قرآن چونکہ خالقِ کائنات کی آخری کتاب ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی محفوظیت کا مکمل انتظام فرمایا۔ عالمِ بالا میں تو اس کو لوحِ محفوظ اور بیت العزت میں محفوظ کیا اور زمین پر اس کی حفاظت کے دو انتظامات کئے گئے۔ حفاظتِ صدری یعنی نبیٔ کریم علیہ السلام اور اُمّت کے قلب و دماغ میں اس کو محفوظ کرنا، جس کو قرآن نے خود ذکر کیا ہے۔ بخاری میں ابنِ عباس سے منقول ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت جبرئیل علیہ السلام کے پڑھنے اور تلاوت کرنے کے ساتھ ساتھ حضور بھی پڑھتے جاتے تھے تاکہ وحی قرآنی محفوظ رہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ؕ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ۔ (سورہ القیامۃ آیۃ ۱۶-۱۷)

نہ چلا تو اس کے پڑھنے پر اپنی زبان تاکہ جلدی اس کو سیکھ لے۔ ہمارے ذمہ ہے اس کو جمع کرنا تیرے سینے میں اور پڑھنا تیری زبان سے۔

اس کے بعد آپ خاموش ہو کر سنتے تھے اور اسی طرح یاد ہو کر دوسروں کو پہنچا دیتے تھے۔ اسی طرح قرآن کی آیت سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰىٓ کہ ہم پڑھائیں گے تجھ کو، پھر تو نہ بھولے گا۔ اس میں حفظِ قرآن کا وعدہ کیا گیا۔ اسی طرح اُمّت کے سینوں میں قرآن کی حفاظت کا تذکرہ بھی قرآن میں موجود ہے

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ۔

قرآن کی کھلی آیتیں ہیں جو اہل علم کے سینوں میں موجود ہیں

صدری حفاظت کا انتظام

چونکہ قدرتِ الٰہی نے اس آخری کتاب کی صدری حفاظت کا سامان فرمانا تھا اس لئے نزولِ قرآن کے لئے اولاً ایسی قوم کو منتخب فرمایا جو تمام اقوام سے اپنی قوّتِ حافظہ میں لاجواب تھی۔

ان کے سینے قومی واقعات اور قبائلی انساب کے خزانے تھے اور جو ایک بار سینکڑوں اشعار کا قصیدہ سُن لیتے تھے تو پورا قصیدہ دل و دماغ پر نقش ہو کر یاد ہو جاتا تھا۔ جس پر عرب کی تاریخ شاہد ہے۔ پھر چونکہ وہ اُمّی قوم تھی تو اُن کی ہر شنید کے باقی رکھنے کا مدار صرف حافظے پر تھا۔ ان کی اس جبلّی اور فطری قوتِ حافظہ کو اسلام اور قرآن نے اور جلا بخشی اور اس میں کافی اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ عرب کے لئے قرآن کو محفوظ رکھنے، ان کی دلچسپی اور شوق بڑھانے کے لئے دیگر اسباب اور محرکات بھی جمع ہوئے۔ جس نے ان کی پوری قوّتِ حافظہ کو اور ذہن و دماغ کو حفظِ قرآن کی طرف بیش از بیش متوجّہ کر دیا۔ جو حسبِ ذیل ہیں۔

محرّکِ اوّل عرب کی زندگی سادہ تھی، پر تکلّف نہ تھی اس لئے ان کی ضروریاتِ معاش بہت مختصر تھے جن کے لئے مزید کدو کاوش اور جدّ و جُہد کی ضرورت نہ تھی۔ جو کچھ موجود تھا اس پر قناعت کرتے اور اس سے زیادہ کی طلب اُن کو نہ تھی۔ جس کی وجہ سے ان کی زندگی فارغ تھی اور حفظِ قرآن کے لئے اُن کو کافی فراغت و فرصت حاصل تھی، جس میں وہ وقت کا اکثر حصّہ صرف کر سکتے تھے، اور وقت بھی حفظ کے لئے ایک ضروری سبب اور محرّک ہے۔

محرّکِ دوم قرآن اور وحی الٰہی کے ساتھ اُن کو فوق العادت محبّت تھی اور عشق تھا اور محبت ایک چیز کے جذب کرنے اور حاصل کرنے کا سب سے بڑا محرّک ہے۔ جو ان کو حفظِ قرآن پہ عاشقانہ انداز میں آمادہ کرتا تھا۔ صحابۂ کرام کی محبّتِ قرآن سے تاریخی واقعات پُر ہیں، جس میں شک و شبہہ کی گنجائش نہیں۔ جب ایک چیز کے یاد کرنے کے ساتھ ایک قوی الحافظہ قوم کو عاشقانہ محبّت قائم ہو جاتی ہے تو وہ اس چیز کو جلد حفظ کر لیتی ہے۔

محرّکِ سوم تیسرا محرک قرآن کا تعجّب انگیز اور حیرت افزا معجزانہ رنگ تھا، بالخصوص جب کہ تمام فصحاء اور بلغاء اس کی مثل لانے سے عاجز آ گئے تھے۔ اسی معجزانہ رنگ نے بھی صحابہ کے دلوں کو حفظِ قرآن کی طرف کھینچا۔ کیونکہ انسانی فطرت ہے کہ وہ ہر عجیب و غریب اور بے مثال چیز کو یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لہٰذا اس محرّک نے بھی صحابہ کرام کے قلوب کو حفظ قرآن کی طرف جھکایا اور وہ ہمہ تن اس کے یاد کرنے

میں مصروف ہوئے اور قرآن کے حیرت انگیز اعجاز نے ان میں حفظِ قرآن کے لئے شدید جذبہ اور زبردست تڑپ پیدا کی۔

محرّکِ چہارم حدیث میں علم وعمل وحفظِ قرآن کی ترغیب دی گئی ہے، جس پر صحابہ کرام کا ایمان اور یقین کامل تھا۔ اس درجہ کا یقین کہ قرآن و حدیث کے احکام پر عمل کرنے کے لئے وہ جان تک قربان کر سکتے تھے اور اس کو بڑی کامیابی سمجھتے تھے۔ تو جب صحابہ کرام الٰہی ترغیب کی آیات مثلاً اِنَّ الَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ کِتٰبَ اللّٰہِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً یَّرْجُوْنَ تِجَارَۃً لَّنْ تَبُوْرَ۔[1] اسی طرح کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰہُ اِلَیْکَ مُبٰرَکٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِہٖ وَلِیَتَذَکَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔[2] کو سُن لیتے تو یقیناً ان میں آتشِ شوق بھڑک اُٹھتی تھی۔

صحیح مسلم کی حدیث ہے۔ بروایت عثمان رضی اللہ عنہ۔

خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَہٗ — تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور دوسروں کو سکھائے۔

اور ترمذی کی حدیث ہے بروایت ابنِ مسعود مَنْ قَرَءَ حَرْفًا مِّنَ الْقُرْاٰنِ فَلَہٗ بِہٖ حَسَنَۃٌ وَّالْحَسَنَۃُ بِعَشْرِ اَمْثَالِھَا لَا اَقُوْلُ الٓمّٓ حَرْفٌ بَلْ اَلِفٌ حَرْفٌ وَّلَامٌ حَرْفٌ وَّمِیْمٌ حَرْفٌ۔ جس میں قرآنی الفاظ کے ایک ایک حرف پر دس نیکیوں کے اجر وثواب مل جانے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس ترغیب سے صحابہ کے شوق پر کیا اثر پڑا ہوگا ایسی بہت سی آیات واحادیث درباره علم وعمل وحفظِ قرآن موجود ہیں، جن کی ترغیبات صحابہ کرام کے لئے حفظِ قرآن کی طرف متوجّہ کرنے کا باعث ہوئیں اور انہوں نے حفظِ قرآن میں پوری زندگی لگا دی۔

محرّکِ پنجم قرآن حکیم صحابہ کرام کے لئے دین ودنیا کی نجات کا واحد ذریعہ تھا اور اپنی دین ودنیا کی کل کامیابیوں کو قرآن سے وابستہ سمجھتے تھے۔ تو جس چیز کو وہ اپنے دین و دنیا کے فوائد کا سرچشمہ اور مرکز جانتے تھے اُن کے لئے یہ تصور ان کو حفظِ قرآن پر آمادگی کا بہت بڑا محرّک ہوتا تھا۔ جو اُن کے

---

[1] سورہ فاطر آیۃ: ۲۹ [2] سورہ ص آیۃ: ۲۹

دلوں میں حفظِ قرآن کا عشق پیدا کرتا تھا۔

محرکِ ششم | قرآن حکیم کو وہ نمازیں پڑھتے تھے، تراویح میں سناتے تھے۔ زندگی کے معاملات میں اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔ عقائد، عبادات، اخلاق و اعمال میں اس کی ہدایت پر چلتے تھے۔ اس وقت کی اسلامی سوسائٹی میں قرآن کا حفظ عزت و شرف کا ذریعہ تھا۔ یہ تمام اُمور حاجی و شرفی اس امر کے محرک بنے کہ وہ حفظِ قرآن کا پورا اهتمام رکھیں۔

حفظ قرآن اور صحابہ کرامؓ

ان گذشتہ محرکات کا اثر تھا کہ صحابہ کرام نے حفظِ قرآن کی طرف پوری توجہ مبذول کی۔ قبائل عرب دور دراز سے مسافت طے کرکے حفظِ قرآن کے لئے مدینہ پہنچتے تھے اور قرآن حفظ کرتے تھے، اور خود حضور علیہ السلام حفاظ و قراء قرآن کی جماعتیں قبائل میں بھیجا کرتے تھے کہ اُن کو قرآن حفظ کرا دیں۔ صفر ۴ھ میں ابو براء کی درخواست پر اہلِ نجد کی تعلیمِ قرآن اور تبلیغ کے لئے آپ نے منذر بن عمرو ساعدیؓ کی امارت میں ستّر قاریوں کو روانہ کیا جو عامر بن طفیل کی غداری سے بجز دو حضرات منذر بن محمدؓ اور عمروؓ بن امیہ کے سب کے سب شہید کر دیئے گئے۔ حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ نے لوقت قتل۔ جب نیزہ اُن کے پار ہوا۔ یہ کہا :-

اللہ اکبر فزت و رب الکعبہ۔ اللہ اکبر۔ کعبہ کے پروردگار کی قسم میں کامیاب ہوا

اسی جماعت کا نام سریۃ القراء تھا ۔اس سے حفاظ و قراء قرآن کی کثرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔[1]

علامہ ذہبی نے طبقات القراء میں مشہور ساتؐ قراء و حفاظ کا نام لیا ہے جن تک قراء کی سند قراءت پہنچتی ہے وہ یہ ہیں۔ ۱۔عثمانؓ بن عفان ۲۔علیؓ ابن ابی طالب ۳۔ابیؓ بن کعب ۴۔عبداللہؓ بن مسعود ۵۔سالمؓ مولی ۶۔ابی حذیفہؓ ۷۔معاذ بن جبلؓ۔ جن میں ابی بن کعبؓ سید القراء ہیں۔ مفتاح السعادات جلد اوّل میں ہے کہ ابو موسیٰ الاشعریؓ نے پورا قرآن حفظ کیا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا۔ صحابہ کرام میں دس ہزار حافظ صحابہ زیادہ مشہور تھے۔ جن میں ۷۔۳ کو اعلیٰ مقام حاصل تھا،

---

[1] فتح الباری جلد: ۷ صفحہ: ۲۹۶ - زرقانی جلد: ۲ صفحہ: ۷۴

جن کے اسماء یہ ہیں ۔ ۱۔ ابوبکرصدیق ۲۔ عمرفاروق ۳۔ عثمان بن عفان ۴۔ علی ابن ابی طالب ۵۔ عبداللہ بن مسعود ۶۔ طلحہ ۷۔ سعد بن ابی وقاص ۸۔ حذیفہ بن الیمان ۹۔ ابوہریرۃ ۱۰۔ عبادۃ بن الصامت ۱۱۔ معاذ بن جبل ۱۲۔ مجمع بن حارثہ ۱۳۔ فضالہ بن عبید ۱۴۔ ابوموسیٰ اشعری ۱۵۔ عمرو بن عاص ۱۶۔ سعد بن عبادہ ۱۷۔ عبداللہ بن عباس ۱۸۔ ابوایوب انصاری ۱۹۔ عبید بن ذوالحارین ۲۰۔ عبید بن معاویۃ بن زید بن ثابت ۲۱۔ ابوزید ۲۲۔ سالم مولی ابی حذیفہ ۲۳۔ سلمہ بن مخلد بن الصامت ۲۴۔ سعد بن علید بن نعمان انصاری ۲۵۔ زید بن ثابت ۲۶۔ ابی بن کعب ۲۷۔ عبداللہ بن السائب ۲۸۔ سلیمان بن ابی حشمۃ ۲۹۔ تمیم الداری ۳۰۔ معاذ بن الحارث ۳۱۔ ابوالدرداء ۳۲۔ عقبۃ بن عامر الجہنی ۳۳۔ عبداللہ بن عمر بن خطاب ۳۴۔ سعد بن المنذر بن اوس ۳۵۔ قیس بن صعصعہ ۳۶۔ عبداللہ بن عمرو بن عاص ۳۷۔ ابوحلیمہ معاذ[1] یہ تو پورے قرآن کے حفاظ کا مختصر بیان ہے اور جن کو جزوی طور پر قرآن حفظ تھا ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا اور یہ حفاظِ قرآن کا دورِ اوّل تھا، جوں جوں اسلام کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، تعدادِ حفاظِ قرآن بھی بڑھتی گئی ۔ سر ولیم میور جیسے دشمنِ اسلام کو بھی لائف آف محمدؐ میں اعتراف کرنا پڑا کہ صحابہ کرام بے مثال حافظہ رکھتے تھے ۔ چنانچہ لکھتا ہے۔ "قوت حافظہ ان کی انتہائی درجہ پر تھی اور اس کو وہ لوگ قرآن کی نسبت سرگرمی سے کام میں لاتے تھے ۔ ان کا حافظہ ایسا مضبوط تھا اور اُن کی محبت ایسی قوی تھی کہ اکثر صحابہ پیغمبر کی حیات میں بڑی صحت کے ساتھ وحی کو حفظ پڑھ سکتے تھے (لائف آف محمدؐ) چھٹی صدی عیسوی میں عرب کیا ساری دنیا میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد ایک فی ہزار سے بھی کم تھی ۔ پریس اور مطابع کا انتظام نہ تھا ۔ اس لئے زیادہ تر انحصارِ حفاظت یاد کرنے پر ہوتا تھا ۔ ورنہ چند تحریرات میں ردّ و بدل کا احتمال ممکن تھا ۔ یہی وجہ ہوئی کہ مذاہبِ عالم کی تحریری کتابوں میں تحریف ہوئی ۔ قرآن حکیم عہدِ رسالت میں ہزاروں سینوں میں مکمل محفوظ تھا، اور لاکھوں سینوں میں متفرق طور پر محفوظ تھا، اسی کو قرآن نے سورۃ عنکبوت میں بیان کیا ہے ۔

---

[1] تہذیب التہذیب ، طبقات بن سعد تذکرۃ الحفاظ ذہبی ، مفتاح السعادت ، اتقان صحیح البخاری

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِىْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ـ (عنکبوت آیۃ: ۴۹) یعنی قرآن کھلی ہوئی آیتوں کا مجموعہ ہے جو اہلِ علم کے سینوں میں محفوظ ہیں

حفظ و تلاوتِ قرآن کا سلسلہ تمام مسلمانوں میں جاری تھا۔ نماز میں قرآن پڑھنا فرض تھا اور تمام مسلمان نماز میں قرآن پڑھتے تھے۔ یہاں تک کہ عثمان غنی اور تمیم داری ایک رکعت میں قرآن ختم کرتے تھے[۱] عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عمرو العاص ایک رات میں قرآن ختم کرتے تھے[۲] سعد بن المنذر تین دن میں قرآن ختم کرتے تھے[۳] سلف کی تلاوتِ قرآن کا یہ حال تھا کہ بعض دن رات میں آٹھ بار قرآن کریم ختم کرتے تھے، چار دن میں اور چار رات میں۔ بعض دن میں تین بار قرآن ختم کرتے بعض دو بار، یہاں تک کہ حضور علیہ السلام نے تین دن سے کم مدت میں ختم کرنے کی ممانعت فرمائی تاکہ فہم مطالب قرآن میں خلل واقع نہ ہو۔ ترمذی میں عبداللہ بن عمر نے مرفوعاً روایت کی ہے۔ لَا یَفْقَهُ مَنْ قَرَءَ الْقُرْاٰنَ فِیْ اَقَلَّ مِنْ ثَلَاثٍ[۴] سینوں میں حفاظت کا یہ انتظام کسی انسانی یا آسمانی کتاب کو نصیب نہیں ہوا۔ جو کتاب مسلمانوں کے گوشت و پوست اور دل و دماغ میں پیوست ہو چکی ہو اور مشرق و مغرب میں ہر دور میں اس کے لاکھوں حفاظ موجود ہوں اور پھر سب کے محفوظ اور یکساں ہوں، ایک حرف کی کمی بیشی نہ ہو، اس بے نظیر انتظام حفاظ کے باوجود کیا قرآن کی حفاظت میں کسی شک و تردد کا احتمال باقی رہ سکتا ہے؟

قرآن حکیم کی تحریری حفاظت

اتقان میں مستدرک حاکم کے حوالے سے منقول ہے کہ قرآن تحریری صورت میں تین بار جمع ہوا۔

۱۔ عہد نبوی میں ۲۔ عہد صدیقی میں ۳۔ عہد عثمانی میں

جمع نبوی و صدیقی، بخاری وغیرہ میں زید بن ثابت انصاری کی روایت سے ثابت ہے[۵]

---

[۱] تہذیب التہذیب و استیعاب [۲] فتح الباری [۳] اسد الغابۃ [۴] اتقان جلد ۱ صفحہ ۱۰۴ [۵] اتقان جلد ۱ ص ۵۷ تا ۵۹

اور جمع عثمانی حضرت حذیفہ بن الیمانی کی روایت سے منقول ہے۔ ان تینوں جمع کی نوعیت میں فرق تھا۔ جمع نبوی کا مقصد قرآن کو ضائع ہونے سے محفوظ رکھنا تھا۔ اس لئے قرآن کو مختلف اشیاء پر تحریر کیا گیا۔ کچھ سفید پتھروں کی تراشی ہوئی تختیوں پر، کچھ سفید چمڑوں اور کچھ لکڑی کی ہموار تختیوں پر۔ اس لئے یہ جمع یکجائی شکل میں نہ تھی۔ عہد صدیقی میں جمع قرآن سے یہ مقصود تھا کہ قرآن کو یکجا کتابی صورت میں جمع کیا جائے تاکہ متفرق قطعات میں سے کسی قطع کے ضائع ہونے کا خطرہ باقی نہ رہے۔ یہ جمع کاغذ پر ہوا جو عہد نبوی میں نہ تھا، اور عہد صدیقی میں شام سے مدینہ منورہ میں پہنچ چکا تھا۔ موطاء مالک میں سالم بن عبداللہ سے روایت ہے:۔

جَمَعَ اَبُوْبَکْرٍ الْقُرْاٰنَ فِی الْقَرَاطِیْسِ — ابوبکر صدیقؓ نے قرآن کو کاغذ پر لکھ کر جمع کیا۔

مغازی موسیٰ بن عقبہ میں ہے:۔

حَتّٰی جُمِعَ عَلٰی عَهْدِ اَبِیْ بَکْرٍ فِی الْوَرَقِ — یعنی ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں قرآن کاغذ پر لکھ کر جمع کیا گیا۔ (اتقان جلد ۱ ص۵۹)

عہد عثمان میں جمع قرآن کا مقصد قرآن کو اختلاف تلفظ سے محفوظ رکھنا تھا تاکہ اختلاف قرأت اور اختلاف طرز تلفظ سے فتنہ پیدا نہ ہو۔ یہی فرق امام سیوطیؒ نے اتقان میں ابن تین سے نقل کیا ہے۔ (اتقان جلد ۱ ص۶۰)

جمع صدیقیؓ

اس جمع کے محرک فاروق اعظمؓ تھے۔ بخاری میں زید بن ثابت سے روایت ہے، کہ جب جنگ یمامہ میں ستر حفاظ اور قراء قرآن شہید ہو چکے تو ابوبکر صدیق نے مجھے بلایا۔ جب میں گیا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس حضرت عمرؓ موجود تھے۔ حضرت صدیقؓ نے فرمایا:۔

اِنَّ عُمَرَ اَتَانِیْ فَقَالَ اِنَّ الْقَتْلَ قَدِ اسْتَحَرَّ یَوْمَ الْیَمَامَةِ بِقُرَّاءِ الْقُرْاٰنِ — یعنی عمرؓ میرے پاس آئے اور کہا کہ یمامہ کی جنگ کی تیزی میں قراء قرآن شہید ہو گئے۔

وَاِنِّیْ اَخْشٰی اَنْ یَّسْتَحِرَّ الْقَتْلُ بِالْقُرَّاۤءِ فِی الْمَوَاطِنِ فَیَذْهَبَ کَثِیْرٌ مِّنَ الْقُرْاٰنِ وَاِنِّیْ اَرٰی اَنْ تَاْمُرَ بِجَمْعِ الْقُرْاٰنِ فَقُلْتُ کَیْفَ تَفْعَلُ شَیْئًا لَّمْ یَفْعَلْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَقَالَ عُمَرُ هٰذَا وَاللّٰهِ خَیْرٌ فَلَمْ یَزَلْ یُرَاجِعُنِیْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرِیْ لِذٰلِكَ ۔

اگر اور جنگوں میں بھی شہادت قراء کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا، تو قرآن کے اکثر حصوں کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے لہٰذا آپ حکم دیں کہ قرآن کو تحریری صورت میں جمع کیا جائے۔ میں نے اُن سے کہا کہ ہم ایسا کام کیوں کریں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ عمر نے کہا قسم خدا کی کہ اسی میں خیر ہے۔ آپکا یہ مطالبہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ اس کام کیلئے کھول دیا۔

پہلے ہم لکھ چکے ہیں کہ قرآن عہد نبوی میں تحریری صورت میں خود حضور علیہ السلام نے لکھوایا تھا لیکن ایک کتابی، اجتماعی شکل میں نہیں تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا مطالبہ اجتماعی اور کتابی صورت میں جمع کرنے کا تھا، اس لئے حضرت صدیقؓ نے فرمایا کہ ہم ایسا کیسے کر سکتے ہیں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ اس سے مراد مجموعی کتابی صورت کی تدوین تھی۔ جس کی عہدِ نبوت میں ضرورت نہ تھی۔ لیکن عہد صدیقی میں ایسے احوال اور حادثات پیش آئے کہ ایسا کرنا ضروری ہوا اور حضرت صدیقؓ پر مصلحت کھل گئی، اس لئے انہوں نے حضرت عمرؓ کی رائے سے اتفاق کیا۔ عہدِ نبوی میں قرآن کو مجموعہ کتابی صورت میں مدوّن نہ کرنے کے اسباب حسب ذیل تھے۔

۱۔ عہدِ نبوی میں وہ اسباب پیدا نہیں ہوئے تھے جو عہدِ صدیقؓ میں پیدا ہوئے اور جس کی وجہ سے کتابی شکل میں قرآن کا قلمبند کیا جانا ضروری ٹھیرا۔

۲۔ عہدِ نبوی میں تحریر کی وہ سہولتیں فراہم نہیں تھیں جو عہدِ صدیقی میں فراہم ہوئیں مثلاً کاغذ دیگر ادوات کتابت۔

۳۔ عہدِ نبوی میں نسخِ تلاوت کا احتمال تھا، جس کی وجہ سے کتابی صورت میں تغیر کرنا پڑتا، جو موزوں نہ تھا۔

۴۔ قرآن کی ترتیب نزولی احوال و واقعات کے مطابق تھی اور آیات و سور کی ترتیب ربطِ مضامین کے اعتبار سے تھی اگر عہدِ نبوت میں قرآن کتابی صورت میں مرتب کیا جاتا، تو جدید نازل شدہ آیات کو ان کے مناسب آیات و سور کے ساتھ ملا دینے میں دشواری ہوتی۔

ان وجوہات کی بناء پر عہدِ نبوت میں قرآن کو کتابی صورت میں جمع نہیں کیا گیا، لیکن عہدِ صدیقی میں حالات بالکل بدل گئے، قراء کی شہادت نے قرآن کو کتابی صورت میں جمع کرنے کی ضرورت پیدا کی۔ کاغذ اور ادوات کتابت کی سہولتیں مہیا ہوئیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد وحی منقطع ہوئی اور قرآن کا نزول مکمل ہوا۔ لہذا قرآن کو کتابی صورت دینے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی۔

دستورِ جمعِ صدیقی

حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جمع قرآن میں پوری احتیاط برتی اور ایسے انتظام کئے کہ قرآن کے جمع کتابی میں کسی قسم کے سہو اور فروگذاشت کا احتمال باقی نہیں ہے۔ آپ نے جمع قرآن میں صرف محفوظ یا مکتوب یا مسموع ہونے پر اکتفا نہیں کیا کہ ان آیات کو قلمبند کیا جاتے جو کسی کو حفظ ہوں یا کسی چیز پر تحریر ہوئی ہوں یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی گئی ہوں بلکہ جمع قرآن میں دو قاعدوں پر عمل کیا گیا۔

۱۔ ان لکھی ہوئی آیات کو جمع کیا جائے گا جو رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے سامنے لکھوائی ہوں اور دو عادل گواہوں کے ذریعے اسی طرح لکھوانے کا ثبوت مہیا ہو جاتے۔ ابوداؤد میں عروہ سے روایت ہے۔ ان اَبَا بَكْرٍ قَالَ لِعُمَرَ وَزَيْدٍ أُقْعُدَا على بَابِ الْمَسْجِد فمن جَاءَ كُمَا بِشَاهِدَيْنِ عَلٰى شَيْءٍ مِنْ كتابِ الله فَاكتباهُ۔

۲- دوم یہ کہ وہ آیات مکتوب ہونے کے علاوہ کثیر تعداد صحابہ کے سینوں میں محفوظ بھی ہوں۔ (مناہل العرفان جلد ا صفحہ ۲۴۵)

اسی طرح ابن ابی داؤد نے کتاب المصاحف میں سند کے ساتھ بیان کیا ہے۔

وَمَا كَانُوا يَكْتُبُونَ فِي الصُّحُفِ وَ	یعنی صحابہ قرآن کو لکھتے تھے، صحیفوں،
الْاَلْوَاحِ وَالْعُصُبِ وَكَانَ لَا يُقْبَلُ	تختیوں اور شاخہائے خرما پر لیکن اس کو
مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَشْهَدَ شَاهِدَانِ۔	دو گواہوں کی گواہی کے بعد قبول کیا جاتا تھا۔

جمعِ عثمانی

اسلام کا دائرہ جب وسیع ہوگیا تو جن مسلمانوں نے قرآنی آیات کو جس استاد سے جس طرز تلفظ اور قرارت سے سیکھا تھا۔ ان میں اور دیگر مسلمانوں میں جن کو دوسری قرارت کی تعلیم دی گئی تھی اختلاف پیدا ہونے لگا۔ چنانچہ بخاری میں حذیفہؓ بن الیمان صحابی کا جو فتح آرمینیہ و آذربائیجان سے واپس حضرت عثمانؓ کی خدمت میں پہنچے تھے یہ قول مذکور ہے جو اختلافِ قرارت کے فتنے پر دال ہے کہ آپ نے حضرت عثمانؓ سے کہا۔

اَدْرِكْ هٰذِهِ الْاُمَّةَ قَبْلَ اَنْ تَخْتَلِفُوْا	اس اُمت کو سنبھالو اس سے پہلے کہ ان میں
اِخْتِلَافَ الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰى۔	یہود و نصاریٰ کی طرح اختلاف پیدا ہو۔

یہاں تک کہ خود مدینہ میں معلموں اور متعلموں میں اختلافِ قرارت کا فتنہ پیدا ہونے لگا۔ جس حضرت عثمانؓ نے خطبہ میں فرمایا کہ جب تم میں یہ اختلاف ہے تو دور کے شہر والوں میں اس سے زیادہ اختلاف کا اندیشہ ہے فرمایا۔

اَنْتُمْ عِنْدِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فَمَنْ نَأَى مِنَ الْاَمْصَارِ اَشَدُّ اِخْتِلَافًا (مناہل العرفان ج۱ ص۲۴۹ - اتقان ج۱ ص۵۹)

تو آپ نے یہ مسئلہ صحابہ کرامؓ کے آگے پیش کیا۔ صحابہ کے اجماع پر حضرت عثمانؓ نے حضرت

حفصہؓ سے قرآن کا وہ نسخہ منگوایا جو عہدِ صدیق میں لکھا گیا تھا اور اس کے متعدد نقول لیئے گئے تاکہ مشہور شہروں میں ان کو بھیج دیں اور اسی کے مطابق قرآن کی تعلیم و تعلّم جاری ہو اور اس کے علاوہ دوسری قراءتوں کی بندش کردی گئی اور اس لیئے اس مجموعہ عثمانی کا نام امام رکھا گیا کہ وہ تمام نسخہائے قرآن کے لیئے پیشوا ہے۔ اجماع صحابہ نے اِس مصحفِ عثمانی کی تحریر کو جس مجلس کے حوالے کیا اس کے چار ارکان تھے تین قریش اور ایک انصاری۔ قریشی حضرات عبداللہ بن زبیر، سعد بن العاص، عبدالرحمٰن بن الحارث تھے اور زید بن ثابت انصاری تھے

دستورِ جمع عثمانی

جمع عثمانی میں مندرجہ ذیل اُمور کا لحاظ رکھا گیا۔

۱۔ مصحف میں وہ چیز درج ہو جس کے قرآن ہونے کا قطعی یقین ہو۔

۲۔ جو معلوم ہو کہ حضور علیہ السّلام کے آخری دورِ تلاوت میں وہ باقی تھا۔

۳۔ جس کی صحت حضور علیہ السّلام سے ثابت ہو اور منسوخ التلاوت نہ ہو[۱]

امام سیوطی نے ان نسخوں کی تعداد سات تک نقل کی ہے جو سات شہروں سے متعلق ہیں۔ ایک نسخہ حضرت عثمانؓ نے مدینہ میں رکھا اور مکّہ، مدینہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ، کوفہ کو ایک ایک نسخہ بھیجا[۲]۔ پھر ان نسخوں سے بیشمار نسخے مسلمانوں نے نقل کیئے اور حضرت عثمانؓ نے حکم دیا کہ تمام دیگر نسخوں کو جن میں قرارت کا اختلاف موجود ہو، ان کو تلف کیا جائے۔
حارث محاسبی سے اتقان میں منقول ہے کہ مشہور یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ جامع القرآن ہیں، لیکن جامع القرآن فی الحقیقت ابوبکر صدیقؓ ہیں۔ حضرت عثمان نے لوگوں کو صرف ایک قسم کے طرزِ تلفظ یعنی قرارت پر جمع کیا۔ اس کے قبل کے نسخوں میں متعدد قرارت موجود تھیں۔ جن کے اصل مضمون میں فرق نہیں پڑتا تھا، لیکن طرز تلفظ کا اختلاف موجود تھا۔ حضرت علیؓ

---

[۱] مناہل العرفان جلد ۱ صفحہ ۲۵۰ [۲] اتقان جلد ۱ صفحہ ۶۰

نے فرمایا کہ اگر میں امیر ہوتا تو بھی وہی کرتا جو حضرت عثمان رضؓ نے کیا۔ (اتقان جلد ا صفحہ ٦٠)

آیات و سور قرآن

جمع عثمانی ۲۵ھ میں ہوا۔ امام زرکشی و دیگر علماء نے اجماع نقل کیا ہے کہ ترتیب آیات قرآن توقیفی ہے یعنی حکم الٰہی سے ہوا ہے۔ ہر آیت کے متعلق حضرت جبرئیلؑ حکم کر دیتے تھے کہ اس آیت کو فلاں آیت کے ساتھ رکھو۔ امام احمد نے عثمان بن العاصؓ سے اسناد حسن کے ساتھ نقل کیا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جبرئیل نے مجھے امر کیا کہ اس آیت کو فلاں سورۃ میں رکھو۔ اس طرح ابوداؤد و ترمذی و نسائی میں ابن عباس سے نقل کیا گیا ہے:۔

كَانَ اِذْ نَزَلَ عَلَيْهِ الشَّيْئُ دَعَا بَعْضَ	یعنی جب حضورؐ پر آیات نازل ہوتیں تو
مَنْ كَانَ يَكْتُبُ فَيَقُوْلُ ضَعُوْا	کاتب کو بلا کر فرماتے کہ ان آیات کو اس
هٰذِهِ الْاٰيَاتِ فِي السُّوْرَةِ الَّتِيْ	سورۃ میں جس میں فلاں مضمون ہے،
يُذْكَرُ فِيْهَا كَذَا وَكَذَا۔	شامل کر دو۔

ترتیب سور میں راجح قول یہ ہے کہ وہ حکم الٰہی سے ہوئی اور توقیفی ہے۔ امام جلال الدین سیوطیؒ نے کرمانی کی کتاب البرہان سے نقل کیا ہے:۔

تَرْتِيْبُ السُّوَرِ هٰكَذَا هُوَ عِنْدَ اللهِ	سورتوں کی ترتیب بھی اسی طرح ہے اور
فِي اللَّوْحِ الْمَحْفُوْظِ عَلٰى هٰذَا	اسی کے مطابق لوح محفوظ میں ہے اور اسی
التَّرْتِيْبِ وَعَلَيْهِ كَانَ صَلَّى اللهُ	ترتیب کے ساتھ ہر سال حضور علیہ السلام
يَعْرِضُ عَلٰى جِبْرِيْلَ كُلَّ سَنَةٍ۔	جبرئیل کو سناتے تھے۔

اسی طرح امام یحییٰؒ سے بھی منقول ہے امام بیہقیؒ نے المدخل میں بھی لکھا ہے۔

كَانَ الْقُرْاٰنُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُرَتَّبًا سُوَرُهٗ وَاٰيَاتُهٗ عَلٰى هٰذَا التَّرْتِيْبِ اِلَّا الْبَرَاءَتَه وَالْاَنْفَال للحديث (ابن عطیہ)

ابوجعفر نحاس سے بھی یہی منقول ہے۔ توقیفی ہونے کے ثبوت کے لئے سیوطیؒ نے اتقان جلد۲ صفحہ ۶۳ میں حذیفہ ثقفی کی روایت سے حدیث نقل کی ہے جو مسند احمد و سنن ابی داؤد میں موجود ہے اور ابن رشد کی کتاب المصاحف سے بھی موید روایت نقل کی ہے۔ امام زرکشی نے برہان میں لکھا ہے کہ جو ترتیب سور کو اجتہادی کہتے ہیں وہ درحقیقت توقیفی مانتے ہیں اور نزاع لفظی ہے۔ کیوں؟ توقیف عام ہے قولی ہو یا فعلی۔ بہرحال ذخیرۂ حدیث میں قرآن کی اکثر سورتوں کے نام عہد نبوت میں رائج اور معروف تھے جو اتقان میں مذکور ہیں۔ جو سور کی توقیفی ہونے کی دلیل ہے۔

مصاحفِ عُثمانیہ کی تاریخ

مصحف مدنی

مصاحفِ عثمانیہ کا جو نسخہ مدینہ میں رکھا گیا وہ تاحینِ حیات حضرت عثمانؓ کے پاس رہا۔ آپ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ کے پاس رہا۔ پھر خلافت کے ساتھ امیر معاویہؓ کے سپرد ہوا۔ وہاں سے اندلس پہنچا، وہاں سے مراکش کے دارالسلطنت فاس میں پہنچا۔ (تاریخ ادریسی تذکرۃ المصاحف) پھر کسی طرح مدینہ منورہ پہنچا۔ جنگِ عظیم اول میں —— فخری پاشا گورنر مدینہ اس کو دیگر تبرکات کے ساتھ قسطنطنیہ لے گیا، وہاں اب تک موجود ہے۔

مصحفِ مکی

مکی نسخہ ۶۵۷ھ تک مکہ معظمہ میں رہا۔ محمد بن جبیر اندلسی نے ۵۷۹ھ میں مکہ میں اُس کی زیارت کی تھی۔ مولانا شبلی نعمانیؒ نے لکھا ہے کہ جس زمانہ میں انہوں نے سیاحت کی یہ نسخہ جامع دمشق میں موجود تھا۔ آپ کی زیارت غالبًا انیسویں صدی کے آخیر میں تھی۔ کشاف المہدی ۱۵۷ میں ہے کہ سلطان عبدالحمید خان جو ۱۸۷۶ء میں تخت نشین ہوئے اور تقریبًا تیس برس تک انہوں نے حکومت کی۔ ان کے زمانے میں مسجد جامع دمشق کو آگ لگ گئی، اس میں یہ مصحف بھی

جل گیا۔

مصحفِ شامی

احمد مقری مؤرخ نے ۱۰۲۷ھ میں اس کی زیارت کی تھی۔ یہ نسخہ کوفہ سے سلاطینِ اندلس پھر سلاطین موحدین پھر سلاطین بنی مرین کے قبضہ میں آیا، اور جامع قرطبہ میں رہا۔ اہل قرطبہ نے سلطان عبدالمومن کو دیا۔ عبدالمومن کے حکم سے ابن لشکوال نے دارالسلطنت مراکش کو منتقل کیا یہ منتقلی اا/ شوال ۵۵۲ھ کو ہوئی۔ ۶۴۵ھ میں خلیفہ معتضد علی بن مامون کے پاس رہا۔ اسی سال خلیفہ مذکور نے تلمسان پر فوج کشی کی اور مارا گیا۔ اسی فوج کشی میں وہ گم ہوگیا، لیکن پھر تلمسان کے شاہی خزانہ میں پہنچا۔ وہاں سے ایک تاجر خرید کر کے فاس لایا۔ وہاں اب تک موجود ہے

مصحفِ بصری

یہ نسخہ کتب خانہ خدیویہ جو مصر میں ہے، موجود رہا۔ اس کو سلطان صلاح الدین ایوبی کے وزیر نے ۵۷۵ھ تیس ہزار اشرفی میں خریدا۔

مصحفِ یمنی

کتب خانہ جامع ازہر مصر میں موجود ہے۔

مصحفِ بحرین

فرانس کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

مصحفِ کوفی

کتب خانہ قسطنطنیہ میں موجود ہے۔ حضرت عثمانؓ کے تین مصاحف اور ہیں۔ جن میں مصحفِ عثمانی دوم جامع سیدنا حسینؓ قاہرہ میں ہے اور مصحفِ عثمانی سوم جامعہ ملّیہ دہلی میں موجود تھا۔ اگر ہنگامہ تقسیم ہندوستان میں تلف نہ ہوا ہو تو موجود ہوگا۔ مصحفِ عثمانی چہارم انڈیا آفس لندن کے کتب خانہ میں ہے۔ اس پر لکھا ہوا ہے "کتبہ عثمان بن عفان"۔ یہ نسخہ شاہانِ مغلیہ کے پاس تھا۔ اکبر کی مہر اس پر ہے۔ ۱۸۴۵ء میں یہ نسخہ میجر راونس کو ملا۔

اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے کتب خانہ کو دیا۔ اب انڈیا آفس کے کتب خانہ میں ہے۔ اس کے ۱۸۱ صفحات ہیں۔ فی صفحہ ۱۶ سطریں ہیں۔

قرآن حکیم کی محفوظیت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اقرار خود مخالفینِ اسلام نے کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بعض مستشرقین مثلاً گولڈ لیسٹر وغیرہ نے مسلمانوں کے یقین کو متزلزل کرنے کے لئے کچھ بے سروپا شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ہم مختصر طور پر ناظرین کو انکی حقیقت سے بھی آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کی کوشش یہ ہے کہ قرآن حکیم کے متعلق بھی تحریف پیدا کرنے کی سعی کی جائے۔ گولڈ لیسٹر یہودی مستشرق نے مذاہب تفسیریہ میں اس امر کی انتہائی کوشش کی جس کے لئے اُس نے بیشمار اسلامی کتابوں کا مطالعہ کیا اور یہ کتاب اُس نے علمی تحقیق کے نام سے لکھی۔ لیکن جیسے مستشرقین کی عام عادت ہے کہ ہر مذہب کے متعلق اُن کی کتاب تحقیقی اور علمی کم، اور سیاسی زیادہ ہوتی ہے۔ ان کو یہ یقین ہے، کہ مسلمانوں کو اپنے دو ایمانی مرکزوں (قرآن اور صاحب قرآن) سے سیاسی قوت کے ذریعے ہٹانا ممکن نہیں، تو اب انہوں نے اسی نصب العین کی تکمیل کے لئے حربی اور سیاسی میدان کو ناکافی سمجھ کر علمی میدان میں قدم رکھا اور استشراق کے اسلحہ سے مسلح ہو کر انہوں نے مسلمانوں کے یقین کو کمزور کرنے اور تشکک کا زہر پھیلانے کے لئے اسلامی تحقیق کے نام سے لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کر کے تصنیفات لکھنا شروع کیا تاکہ وہ اپنے مقصد میں اس راہ سے کامیاب ہو سکیں۔ جن اُمور کی وجہ سے انہوں نے اپنی کامیابی کی امید رکھی وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ مغربی قوتوں کا سیاسی عروج اور مسلمانوں کا سیاسی زوال جس سے وہ نفسیاتی طور پر یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ مغلوب قومیں غالب قوموں کی ہر بات پر چاہے وہ سو فی صد غلط ہو، اپنی کمزوری کی وجہ سے یقین کرتی ہیں۔

۲۔ انگریزی دان طبقہ خاص کر مغرب زدہ طبقہ جو احساس کہتری کا شکار ہے، یورپ کے ہر مصنف کو محقق سمجھتا ہے اور اپنے دین کے ہر عالم سے متنفر رہتا ہے اور یورپی مصنفین کی

ہر بات کو بلا تحقیق مان لینے کا جذبہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں موجود ہے۔ اور وہ خود علمِ دین سے بے بہرہ ہے اور علماء دین کی طرف نفرت کی وجہ سے رجوع نہیں کرتا۔ ان کمزوریوں نے مستشرقین کی کامیابی کی راہ کھولی اور مسلمانوں کے دل و دماغ میں شکوک و شبہات پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ قرآن حکیم کی محفوظیّت کے سلسلے میں ان کے شبہات اصولاً حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) بعض آیات و روایات سے قرآن کے غیر محفوظ ہونے پر استدلال کرنا۔

(۲) اختلافِ قرارت اور سبعۃ احرف سے استدلال کرنا۔

(۳) شیعہ روایات سے احتجاج کرنا۔

ہم ان کو اختصار کے ساتھ نقل کرکے جواب دیں گے۔

بعض آیات و روایات

سورۃ اعلیٰ کی آیت | سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰىٓ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ۔ البتہ ہم پڑھائیں گے تجھ کو، پھر تو نہ بھولیگا مگر جو چاہے اللہ۔

اس آیت سے مستشرقین یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ قرآن کی کچھ آیات بھُلا دی گئی ہیں، حالانکہ یہ غلط ہے۔

۱۔ یہ استثناء صوری ہے حقیقی نہیں۔ علمی اصطلاح میں یہ استثناء اظہارِ فضل یا اظہارِ قدرت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ مقصد نہیں ہوتا کہ کسی چیز کا مستثنیٰ کرنا مقصود ہے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ ہم قرآن تجھ کو ایسا پڑھا دیں گے کہ بھُولے گا نہیں مگر اللہ چاہے تو اور بات ہے۔ یعنی بھُلا دینا اب بھی ہماری قدرت میں ہے اس لئے نہ بھُلا دینے کو ہمارا فضل اور احسان سمجھنا چاہیئے۔ یہ ایسا ہے جیسا قرآن میں دوسری جگہ اہلِ جنّت کا جنّت میں ہمیشہ رہنا بیان کر دینے کے بعد فرمایا گیا۔ اِلَّا ماشاء اللہ (سورہ ہود) مگر جو چاہے اللہ۔ یعنی دوامِ جنّت کو فضلِ خداوندی سمجھو ورنہ خدا تعالیٰ تو جنّت کی زندگی چھین بھی سکتا ہے۔ اگرچہ نظر بر وعدہ چھینے گا نہیں

۲۔ اس کے علاوہ اگر واقعی فَلَا تَنْسٰٓی اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ سے مقصود یہ ہے کہ تو بھولے گا نہیں مگر اس صورت میں کہ ہم واقعی بھلا دینا چاہیں۔ یعنی نہ بھولنا ہماری مشیّت پر معلّق ہے، تو بھی بھلا دینا ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ دوسری جگہ قرآن نے صاف بتایا کہ ہم بھلانا نہیں چاہیں گے، بلکہ ہم نے یہی چاہا ہے کہ قرآن تمہارے سینے میں محفوظ رہے۔ جیسے سورۂ قیامت میں ہے۔

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ۔ (سورۃ القیامہ) ہمارے ذمہ ہے قرآن کو تیرے سینے میں جمع کر کے محفوظ رکھنا اور تمہاری زبان سے پڑھوا دینا

اس صورت میں استثنائی صورت کے واقع نہ ہونے کی تصریح کر دی گئی لہٰذا بھلا دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۳۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ اگر کسی وقت کچھ آیات بھلا دی گئی ہوں تو یہ بھی نسخ کی ایک صورت ہے۔ اس سے قرآن کی محفوظیّت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ جن آیات کو حضور علیہ السلام کے سینے میں محفوظ رکھا اور آپ نے اُمت کو پہنچایا وہی قرآن ہے اور جو کسی حکمت کے تحت فراموش کر دیا گیا کہ نزول کے بعد باقی نہ رہنے دیا گیا تو وہ قرآن نہیں رہا، بلکہ خود خالقِ کائنات نے اس کو قرآن کا جزء نہ بننے دیا۔ ہر حاکم کو اپنے فرمانِ عمل میں یہ اختیار حاصل ہے کہ جس جملے کو چاہے فرمان کا جزء بنائے اور جس کو چاہے فرمان سے خارج کر دے۔ ایسا کرنے کو فرمان کی محفوظیّت کے خلاف نہیں سمجھا جاتا۔ یہ صاحبِ فرمان کا اپنا تصرّف ہے کسی دوسرے کا نہیں تاکہ فرمان میں کسی دوسرے کے تغیّر دینے کا شبہہ نہ ہو۔ قرآن کا ارشاد ہے۔

قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ (یونس: ۱۵) اے پیغمبر اعلان کر دو کہ میں اپنی طرف سے وحیِ الٰہی میں ردّ و بدل نہیں کر سکتا میں تو صرف وحیِ الٰہی کا اتباع کرتا ہوں، نہ تبدّل و تغیّر۔

حدیثِ عائشہ | عَنْ عَائِشَةَ اَنَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ سَمِعَ رَجُلًا يَقْرَءُ مِنَ حضور علیہ السلام نے رات کے وقت ایک شخص کا قرآن سنا تو فرمایا اللہ اس پر رحم

اللَّيلِ قَالَ يَرحَمُهُ اللهُ لَقَدْ ذَكَّرَنِي	کرے۔ اُس نے مجھے فلاں فلاں آیتیں
كَذَا وَكَذَا آيَةً كُنتُ اُسقِطهَامِنْ	یاد دلائیں جو مجھ سے رہ گئی تھیں فلاں فلاں
سُورَةِ كَذَا وَكَذَا ۔ (رواہ مسلم)	سورت میں سے۔

اس روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن کی وہ آیتیں مطلقاً ضائع ہوئیں، بلکہ وہ آیات اُس پڑھنے والے شخص سے قبل حضورؐ کو بھی یاد تھیں، صحابہ کرامؓ کو بھی یاد تھیں، تحریر میں بھی آچکی تھیں۔ صحابہ کرامؓ اُن کو پڑھتے تھے جیسا کہ اس شخص نے اُن کو پڑھا۔ اس لئے ان آیات کے ضائع ہونے کا تو احتمال ہی نہیں۔ البتہ بعض اوقات حافظہ میں ایک چیز موجود ہوتی ہے لیکن اس کی طرف توجہ نہیں ہوتی، دوسرے کے پڑھ دینے سے اس کی طرف توجہ ہو جاتی ہے جس پر کہا جا سکتا ہے کہ فلاں کے پڑھ دینے سے مجھے فلاں آیت یاد آگئی یعنی اس کی طرف توجہ ہوگئی۔ یہ ایک عام محاورہ ہے۔ اس کے باوجود قرآن جب تحریری صورت میں بھی موجود ہو، ہزاروں لاکھوں کو محفوظ بھی ہو تو اگر ایک فرد یا چند افراد کسی آیت کو بھول بھی جائیں جیسے اس زمانے میں اکثر ایسا ہوتا ہے تو اس سے قرآن کی محفوظیت پر کیا اثر پڑتا ہے۔

ضابطہ عمومیہ | مستشرقین جن روایات کو لے کر حفظ و تواترِ قرآن پر اعتراضات کرتے ہیں اس کا عام جواب جو ایسے تمام مواقع کے لئے کافی ہے، وہ یہ کہ تواتر و حفظ قرآن، تواتر اور اجماع قطعی ثابت ہے اور جو روایت اس کے خلاف پیش کی جاتی ہیں وہ اکثر ضعیف ہوتی ہیں۔ اور زیادہ سے زیادہ خبر واحد ہوتی ہے، جو ظنی ہے اور ظنی قطعی کے مقابلے میں کالعدم ہے۔

روایت ابن مسعود | مسند احمد وطبرانی و ابن حبان میں عبداللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے کہ وہ قرآن میں معوذتین یعنی قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ وَقُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ نہیں لکھتے تھے۔ اسی طرح ابوعبیدہؒ نے بروایت ابن سیرین ابن مسعود سے نقل کیا ہے کہ وہ فاتحہ قرآن میں نہیں لکھتے تھے اور حافظ ابن حجر نے شرح بخاری میں ان روایات کی تصحیح کی ہے۔ اس کے چند جوابات ہیں :۔

۱۔ فاتحہ اور معوذتین کی قرارت تواتر قطعی سے ثابت ہے لہٰذا ظنی خبر اس کے مقابلہ میں کالعدم ہے لہٰذا اگر ابنِ مسعودؓ سے یہ انکار ثابت بھی ہو تو اجماع اور تواتر کسی ایک فرد کی مخالفت سے نہیں ٹوٹتا۔ ورنہ تمام متواترات کا انہدام لازم آئے گا۔

۲۔ قاضی ابوبکر نے ابن مسعودؓ کے انکار کے متعلق جواب دیا ہے کہ یہ قرانیت کا انکار نہیں تھا بلکہ کتابت فی المصحف کا انکار ہے کیونکہ کتابت اس چیز کی ضروری ہوتی ہے، جس کے بھول جانے کا خطرہ ہو اور فاتحہ اور معوذتین کے بھول جانے کا خطرہ نہیں تھا اس لئے لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ یہی جواب ابن قتیبہ نے مشکلات القرآن میں دیا ہے اگرچہ روایات میں اِنَّهُمَا لَيْسَتَا مِنْ كِتَابِ اللهِ آیا ہے تو کتاب اللہ سے بھی مراد مصحف ہے۔

۳۔ ابن الصباغ نے جواب دیا ہے کہ یہ سورتیں ابنِ مسعودؓ کے زمانے میں متواتر تھیں لیکن ان کو تواتر کا علم نہیں پہنچا تھا۔ اس لئے احتیاط برتا۔ اس کے جو ان کو تواتر پہنچا تو اس اپنے قول سے رجوع کیا۔ جیسے عاصم نے بواسطہ زرعن ابنِ مسعودؓ کی قرارت نقل کی ہے جس میں یہ تینوں سورتیں ثابت ہیں جو اس کے اپنے پہلے قول سے رجوع کرنے کی دلیل ہے۔ ۱۱

ان سب جوابات کی ضرورت اس وقت ہے کہ ابنِ مسعودؓ سے ان تینوں سورتوں کے قرآن نہ ہونے کا انکار ثابت ہو لیکن بہت سے محققین نے انکار ابنِ مسعود کی تردید کی ہے اور اس کو موضوع باطل اور غلط قرار دیا ہے۔

قَالَ النَّوَوِيُّ فِي شَرْحِ الْمُهَذَّبِ اَجْمَعَ	نووی نے شرح مہذب میں لکھا، کہ
الْمُسْلِمُوْنَ عَلٰى اَنَّ الْمُعَوِّذَتَيْنِ	معوذتین اور فاتحہ قرآن کا جزء ہے۔
وَالْفَاتِحَةَ مِنَ الْقُرْاٰنِ وَاَنَّ مَنْ	اور جو انکار کرے، کافر ہے اور جو
جَحَدَ شَيْئًا مِنْهَا كَفَرَ وَمَا نُقِلَ عَنْ	ابنِ مسعود سے نقل ہے وہ باطل ہے
اِبْنِ مَسْعُوْدٍ بَاطِلٌ لَيْسَ بِصَحِيْحٍ	صحیح نہیں۔ ابنِ حزم محدث نے
وَقَالَ اِبْنُ حَزْمٍ فِيْ قَدْحِ الْمُعَلّٰى	قدح معلی میں لکھا ہے کہ یہ انکار ابنِ

اَلْمُجَلِّیْ هٰذَا كِذْبٌ عَلٰی	مسعود پر بہتان اور جھوٹ ہے ، اس
اِبْنِ مَسْعُوْدٍ وَاِنَّمَا صَحَّ عَنْهُ قِرَاءَتُهٗ	سے قرار عاصم ثابت ہے۔ اس میں
عَاصِمٍ عَنْ زِرٍّعَنْهُ وَفِيْهَا الْمُعَوَّذَتَانِ	یہ تینوں سورتیں ہیں۔
وَالْفَاتِحَةُ۔	(اتقان جلد ا صفحہ ۶۵، ۷۰)

اسی طرح امام رازی نے کبیر میں بھی لکھا ہے۔ اتقان جلد ا صفحہ ۶۵ و ۷۰ میں تفصیل ملاحظہ ہو ابن مسعودؓ کے انکار کو نووی نے باطل کہا ، ابنِ حزم نے جھوٹ اور موضوع قرار دیا ہے۔

اختلاف قرارت وسبعۃ احراف

مستشرقین نے قرآن کی قرارتِ مختلفہ کو تحریفِ قرآن ثابت کرنے کے لئے بطور دلیل پیش کیا ہے ، حالانکہ یہ استدلال بالکل غلط ہے۔ تحریف اس کا نام ہے کہ کسی شاہی دستاویز میں اصلی متکلم اور دستاویز مرتب کرنے والے کے علاوہ دوسرا شخص الفاظ میں ردّ و بدل کر دے لیکن اگر بادشاہ اپنے دستاویز کے الفاظ میں رد و بدل کر دے ، اس کو کوئی عقل مند تحریف نہیں کہہ سکتا۔ قرآن پاک کی قرارت کی دو قسمیں ہیں۔ متواتر اور غیر متواترہ۔ غیر متواترہ قرآن نہیں کیونکہ ائمہ اصول متفق ہیں کہ قرآنیت کے لئے تواتر شرط ہے اور قرارت متواترہ قرآن ہے۔ اس سے تحریف ثابت نہیں ہو سکتی۔ تحریف اس کا نام ہے کہ یا غیر قرآن کو قرآن میں داخل کیا جائے یا قرآن کے کسی جزء کو قرآن سے خارج کیا جائے اور اختلاف قرارت میں دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت بھی نہیں اس کے علاوہ امام زرکشی نے برہان میں لکھا ہے کہ قرآن الفاظ کا نام ہے۔ اور قرارت قرآنی الفاظ کے طرز تلفظ کا نام ہے لہٰذا قرارت کے تعدد سے قرآن کے الفاظ کی تحریف نہیں ہوتی۔ (اتقان ج ا صفحہ ۸۰)

سبع قرارت | برہان میں امام زرکشی نے لکھا ہے کہ قرآن الفاظ وحی کا نام ہے جو حضور علیہ السلام پر بیانِ احکام کے لئے معجزانہ انداز میں اترا ہے اور قرارت اس کے طرز تلفظ اور کیفیتِ ادا

کا نام ہے۔ سات قرارت سات قرار تک متواترہ طریقہ سے ثابت ہے۔ اور آئمہ سبعہ سے حضور علیہ السلام تک کی تو سند کتب قرارت میں موجود ہے جو ایک راوی نے دوسرے سے نقل کی ہے لیکن اتقان میں ابن جزری سے نقل کیا ہے کہ حضور تک بھی قرارت سبعہ متواتر ہیں۔ وَقَدْ نَصَّ عَلٰی تَوَاتُرِ ذَالِكَ كُلِّهِ اَئِمَّةُ الْاُصُوْلِ كَقَاضِیْ اَبِیْ بَكْرٍ وَّغَیْرِهٖ وَهُوَ الصَّوَابُ لِاَنَّهٗ اِذَا ثَبَتَ تَوَاتُرُ اللَّفْظِ ثَبَتَ عَلٰی تَوَاتُرِ هَیْئَةِ اَدَائِهٖ لِاَنَّ اللَّفْظَ لَا یَقُوْمُ اِلَّا بِهٖ وَلَا یَصِحُّ اِلَّا بِوُجُوْدِهٖ ۔ آئمہ اصول نے تصریح کی ہے کہ سات قرارت از اول تا آخر حضور تک متواتر ہیں کیونکہ جب الفاظ متواتر ہیں تو طرز ادا۔ الفاظ بھی متواتر ہے کیونکہ الفاظ کا تلفظ طرز ادا کے بغیر ممکن نہیں۔ (اتقان جلد ا صفحہ ۸۰)

قرار صحابہؓ جن صحابہ کرام نے حضور علیہ السلام سے قرارت حاصل کی اور قرار کے نام سے مشہور ہوئے اور مابعد زمانے کے قرار کے لئے بالذات یا بالواسطہ شیوخ و اساتذہ بنے وہ سات تھے جنکی قرارت بلاد اسلامیہ میں پھیلی اور آج تک ان کا سلسلۂ قرارت موجود ہے۔

۱۔ عثمان ۲۔ علی ۳۔ ابی بن کعب ۴۔ زید بن ثابت ۵۔ عبد اللہ بن مسعود ۶۔ ابو الدردار ۷۔ ابو موسیٰ الاشعری۔ (مناہل العرفان جلد ا صفحہ ۴۰۷)

قرارت سبعہ ۱۔ ابنِ عامر جس کا نام عبد اللہ یحصبی ہے جو حمیر قبیلے کی ایک شاخ یحصب کی طرف منسوب ہے۔ ابو نعیم و ابو عمران کنیت ہے۔ تابعی ہے۔ اس نے قرارت مغیرۃ بن ابی شہاب المخزومی سے حاصل کی۔ اس نے حضرت عثمانؓ سے اور عثمانؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ ابن عامر دمشق میں ۱۱۸ھ میں فوت ہوئے۔

۲۔ ابن کثیر نام عبد اللہ بن کثیر دارمی ہے۔ ابو محمد یا ابو معبد کنیت ہے۔ یہ مکہ معظمہ کے امام قرارت تھے۔ آپ نے قرارت مجاہد سے اس نے ابن عباس سے اس نے ابن کعب اور ابی بن کعب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی۔ ابن عامر کے بالواسطہ شاگردوں میں ہشام و ابن ذکوان مشہور ہیں اور ابن کثیر کے بالواسطہ شاگردوں میں البزی و قنبل مشہور ہیں۔ ابن کثیر

سنہ ۱۲۰ھ میں مکّہ میں فوت ہوئے۔

۲۔ عاصم۔ عاصم بن ابی النجود نام ہے۔ قرات، فصاحت اور خوش آوازی میں مشہور تھے۔ آپ نے قرات زر بن حبیش اُس نے عبداللہ بن مسعودؓ سے اُس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی اور کوفہ میں سنہ ۱۲۷ھ میں اُس نے وفات پائی۔ آپ کے بالذات شاگردوں میں سے شعبہ بن عباس اور حفص بن سلیمان زیادہ مشہور ہیں۔

۴۔ ابوعمرو مازنی بن العلاء بن عمار البصری۔ آپ نے قرات مجاہد و سعید بن جبیر سے حاصل کی اور اور ان دونوں نے ابن عباس سے اور اُس نے ابی بن کعب سے اور اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی۔ ان کے مشہور شاگرد یزیدی کے واسطے سے دو ہیں۔(۱) دوری ابوعمر حفص بن عمر المقری العزیز البغدادی سنہ ۲۴۶ھ۔ (۲) ابوشعیب صالح بن زیاد سنہ ۲۶۱ھ۔

۵۔ حمزۃ بن حبیب بن الزیات الکوفی مولی عکرمۃ بن ربیع التیمی۔ آپ نے قرات اعمش سے اُس نے یحییٰ بن وثاب سے اس نے زر بن حبیش سے اس نے عثمانؓ و علیؓ و ابن مسعودؓ سے حاصل کی۔ اور اُنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی۔ عربیۃ فرائض اور حدیث کے ماہر تھے حلوان میں سنہ ۱۵۶ھ میں فوت ہوئے۔ آپ کے مشہور شاگرد بواسطہ ابی عیسیٰ سلیم بن عیسیٰ الکوفی خلف م سنہ ۲۲۹ھ و خلاد م سنہ ۲۲۰ھ تھے جن سے آپ کا سلسلۂ قرات چلا۔

۶۔ نافع بن عبدالرحمٰن بن ابی نعیم المدنی۔ آپ نے ابوجعفر القاری اور دیگر ستر تابعین سے قرات حاصل کی، اُنہوں نے ابن عباسؓ اور ابوہریرۃؓ سے اور ان ہر دو نے ابی بن کعب سے اور آپ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرات حاصل کی۔ نافع کی کنیت ابو رویم ہے آپ کے دو مشہور شاگرد تھے جن سے آپ کا سلسلہ چلا۔(۱) قالون ابوموسیٰ۔ عیسیٰ بن منیا النحوی قالون کے معنی جیّد کے ہیں۔ آپ کی قرآت عمدہ تھی۔ م سنہ ۲۲۰ھ۔ (۲) ورش جس کا نام عثمان بن سعید المصری ہے۔ قرات اور خوش آوازی میں بے مثال تھے۔ مصر میں سنہ ۱۹۷ھ میں وفات ہوئی۔

۷۔ الکسائی ۔ ابوالحسن علی بن حمزہ الکسائی النحوی ۔ احرام میں کساء پہننے کی وجہ سے کسائی مشہور ہوئے ۔ نحو، عربیت اور قرآن میں بے مثال تھے ۔ ۱۸۹ھ میں وفات پائی ۔

قراء عشرہ میں باقی تین یہ ہیں ۔

۸ ۔ ابوجعفر یزید بن القعقاع جس کی قرارت کی سند ابن عباس، ابی ھریرۃ عن ابی بن کعب عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے ۔ ۱۳۰ھ میں وفات پائی ۔

۹ ۔ یعقوب بن اسحاق الحضرمی ۔ آپ نے عاصم اور ابوعمرو بن العلاء سے قرارت حاصل کی م ۲۰۵ھ

۱۰ ۔ خلف بن ہشام بن ثعلب ۔ کنیۃ ابومحمد ۔ آپ بالواسطہ عاصم کے شاگرد ہیں م ۲۲۹ھ

(طبقات القراء لابن جزری و مناہل جلد ا صفحہ ۴۹ ۴ تا غایت ۴۵۷)

سبعۃ احرف حدیث نزول القرآن علی سبعۃ احرف اکیس ۲۱ صحابہ سے مروی ہے ۔ ابوعبید نے اس کے متواتر ہونے کی تصریح کی ہے ۔ (اتقان جلد ا صفحہ ۴۵) صحیحین میں ابن عباس کی روایت کے الفاظ میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جبرئیل نے مجھے ایک حرف پر پڑھوایا میں زیادہ طلب کرتا رہا وہ بڑھاتا رہا ۔ یہاں تک کہ سات حرف تک نوبت پہنچی ۔ اس حدیث کی شرح میں امام سیوطی نے اتقان جلد ا صفحہ ۴۵ میں چالیس ۴۰ اقوال اور علامہ آلوسی نے روح المعانی میں سات اقوال نقل کئے ہیں ۔ راجح یہ ہے کہ سات حرف سے سات لغات قبائل عرب مراد ہیں ، جو عرب کے فصیح تر سات قبائل کے تھے جو یہ ہیں ۔ ۱۔ قریش ۲۔ ہذیل ۳۔ تمیم ۴۔ ازد ۵۔ ربیعۃ ۶۔ ہوازن ۷۔ سعد بن بکر ۔ یہ قول مختار ہے ۔ ابوعبید وثعلب و زہری و دیگر علماء کا ابن عطیۃ نے بھی اس کو مختار کہا ہے ، اور بیہقی نے شعب الایمان میں اس کو صحیح قرار دیا ہے ۔ (اتقان جلد ا ص ۴۷ ، روح المعانی جلد ا ص ۲۱)

اس قول پر امام سیوطی نے اعتراض کیا ہے کہ عمرو ہشام نے قرارت میں جھگڑا کیا جب حضورؐ کے پاس آئے تو آپ نے دونوں کی تصدیق کی جیسے بخاری وغیرہ میں ہے ، حالانکہ یہ دونوں قریشی تھے اور دونوں کی لغت ایک تھی جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سات حرف لغۃ

قریش میں تھے جیسے ابن قتیبہ اور ابوعلی الاہوازی کا قول ہے۔ ہمارے نزدیک یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایسا ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضورؐ سے ایک قبیلہ کی لغت کے مطابق سُن لیا ہو اور ہشام نے آپ سے دوسرے قبیلے کی لغت کے مطابق۔ اس لئے نزاع کی نوبت آئی ہو۔ لہذا سات حرف سے مراد عرب کی سات لغات ہیں نہ صرف قبیلہ قریش کی سات لغات۔

سات احرف کی حکمت ابتدا میں سات لغات پڑھنے کا جواز اور بعد میں صرف ایک لغت پر اکتفا میں راز اور حکمت یہ ہے (واللہ اعلم) کہ قرآن میں تصریح ہے کہ بلسان عربی مبین یعنی قرآن عربی زبان میں اُترا ہے۔ بعض مخصوص الفاظ میں قبائلِ عرب میں اختلاف تھا جیسے کہ دہلی اور لکھنؤ کی زبان اُردو میں یا پشاور اور قندھار کی پشتو میں۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ۔ (القرآن) ہم نے ہر رسُول، اُس کی قوم کی زبان میں مبعوث فرمایا۔

اور ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم قریب قریش تھی اور عام قوم عرب تھی۔ دوسری طرف عرب کا مزاج قبائلی خصوصیات کا تحفظ تھا اور ان خصوصیات میں وہ درجہ تعصب کو پہنچے ہوئے تھے۔ آج بھی اقوام میں لسانی تعصب کا جذبہ موجود ہے، لہذا حکمتِ الٰہی کا تقاضہ یہ ہوا کہ قرآن کے محدود الفاظ میں جہاں عرب قبائل کی لغات میں فرق تھا۔ ہر قبیلہ کو اپنی اپنی لغت کے مطابق تلفظ کی اجازت دی جائے تاکہ ایک طرف عربی زبان کی تمام شاخیں کلام الٰہی کی برکت سے بہرہ یاب ہوں اور عرب قبائل کی زبانیں عمومی شکل میں بلسان عربی کے تحت نزولِ کلامِ الٰہی کی برکت سے فیضیاب ہو سکے اور دوسری طرف یہ کہ عرب قبائل کو اپنی لغت خاصہ کی محرومی کا افسوس بھی نہ ہو اور لسانی تعصب کا اندیشہ بھی نہ رہے۔ جمع عثمانی کے وقت جب دائرہ اسلام وسیع ہو گیا اور قبائلی خصوصیات ختم ہو کر وحدتِ عرب بلکہ وحدتِ اسلامی کے رنگ میں تمام قبائل پوری طرح رنگے گئے ہوں تو سبعہ لغات یا قبائلی خصوصیات کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ لہذا صرف لغتِ قریش پر مصحفِ عثمانی میں اکتفا کیا گیا یہ اجماع صحابہ لغتِ قریش پر با امرِ نبوی سے

تھا یا انتہائے حکم یا انتہائے علت کی شکل تھی، جیسے مولفۃ القلوب عہدِ نبوت میں مصرف زکوٰۃ تھے لیکن عہدِ فاروقی میں قوتِ اسلام کی وجہ سے ان کو زکوٰۃ دینے کی علت باقی نہ رہی۔ لہذا وہ مصارف زکوٰۃ سے خارج کر دیئے گئے۔ ایسے اور بہت سے احکام ہیں جو امام زرکشی نے برہان میں نقل کئے ہیں مستشرقین نے تحریف قرآن ثابت کرنے کے لئے سات حرف یا سات لغات سے قرآن پڑھنے کی اجازت کو بطور دلیل پیش کیا ہے جو صحیح نہیں۔ تحریف کا معنی یہ ہے کہ متکلم کے کلام میں دوسرا شخص یا کچھ بڑھائے یا گھٹائے تو یہ تحریف یعنی متکلم کے کلام کو بدل دینا ہے اور یہ تحریف نہیں کہ اپنے کلام میں متکلم کسی مصلحت کے ماتحت کوئی تبدیلی کر دے۔ لہذا دورِ اوّل میں قرآن حکیم کے محدود اور چند الفاظ میں ہر قبیلہ کو اپنے قبیلہ کی خاص لغت کے پڑھ دینے کی اجازت دینا اور بعد ازاں اس اجازت کو موقوف کر دینا یہ تحریف نہیں بلکہ الٰہی تصرف ہے جو قرآن کا متکلم ہے اور متکلم کو بالاتفاق یہ حق حاصل ہے۔ اسی طرح منسوخ التلاوت یعنی آیت رجم کو بھی سمجھو کہ اس آیت کا جزءِ قرآن ہونا اور بعد ازاں قرآن سے اس کو خارج کر دینا خود منزلِ قرآن کا تصرف تھا نہ کسی اور کا۔ خود حضور کی زبان سے کہلوایا۔ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَائِ نَفْسِي ج إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَى إِلَيَّ ج (سورہ یونس: ۱۵) اسی طرح سورہ خلع و حفد کو جو مصحف ابی میں تھا، منسوخ التلاوت کر دیا گیا وہ بھی الٰہی تصرف تھا۔ اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ منسوخ التلاوت کے الفاظ قرآن حکیم کے الفاظ کے ساتھ اعجاز میں ہمسر نہیں بلکہ کم ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریع سے ارادہ الٰہی اُن کے باقی رکھنے کا نہ تھا۔

قرارتِ سبعہ سات حرفوں والی حدیث کی دوسری تشریح سات قرارت متواترہ سے کی گئی ہے۔ اس تشریح پر بھی تحریفِ قرآن کا سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ جیسے ہم قرارت کی بحث میں لکھ چکے ہیں کہ یہ سب قرارتِ متواترہ قرآن ہیں، لہذا ان قراءت سے نہ قرآن میں کمی آتی ہے نہ بیشی۔ لہذا اس صورت میں قرآن کے سات حرفوں کے ساتھ پڑھنے سے تلفظِ قرآن کے سات طرز مراد ہیں کیونکہ حرف کا نحوی معنی مراد نہیں بلکہ لغوی معنی مراد ہے جو سات قرارت پر صادق ہے۔

اس معنی پر یہ اشکال پیش کیا گیا ہے کہ قرات سات سے زیادہ ہیں اور حدیث مذکور میں سات حروف کی تصریح ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ صاحب اتقان نے ابن جزری سے نقل کیا ہے کہ میں نے صحیح و شاذ و ضعیف سب قرات کی جستجو کی تو معلوم ہوا کہ وہ سب کے سب بالآخر سات سے باہر نہیں۔ (اتقان جلد ا ص ۴۶) اور اگر زائد بھی ہوں تو لفظ سبع حصر کے لئے نہیں لہٰذا دیگر قرات کی بھی گنجائش ہے لیکن مشہور ان میں سات ہیں۔

دوسرا اشکال یہ پیش کیا گیا کہ قرات سبعہ نزول قرآن کے بعد ظاہر اور مدوّن ہوئی ہیں اور حدیث ان سے مقدم ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرات سبع کا وجود پہلے تھا، اگرچہ بحیثیت فن اس کی تدوین بعد میں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یہ قرات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں جیسے کہ ہم نے پہلے لکھ دیا۔ بعد ازاں آپ سے یہ قرات سات مشہور قراء صحابہ نے حاصل کیں اور ان سے قراء سبعہ کو پہنچیں جس سے قرات سبعہ کا وجود عہد نبوت میں ثابت ہوتا اگرچہ فن کی شکل میں تدوین قرات مابعد زمانہ میں ہوئی۔

تیسرا اشکال یہ ہے کہ ہر آیت میں سات قرات جاری نہیں ہوتیں۔ جواب یہ ہے کہ مجموعہ قرآن میں سات قرات کا موجود ہونا ضروری ہے، نہ ہر آیت میں۔

اب مخالفین اسلام خصوصاً مستشرقین نے مصحفِ عثمانی پر چند شبہات پیش کئے ہیں جن کو ہم نقل کر کے اُن کا جواب دیتے ہیں۔

۱۔ پہلا شبہہ یہ پیش کیا گیا ہے کہ حضرت عثمانؓ پر جب مصاحف پیش کئے گئے تو آپ نے فرمایا

اِنَّ فِی الْقُرْاٰنِ لَحْنًا سَتُقِیْمُہُ یعنی مصحفِ عثمانی میں غلطی ہے جس کو عرب

اَلْعَرَبُ بِاَلْسِنَتِہِم (روح المعانی ج ۱ ص ۲۸) اپنی زبان سے درست کر لیں گے۔

اسی طرح فوز الکبیر میں بھی ہے۔ جواب اوّلاً یہ ہے کہ علامہ آلوسی لکھتے ہیں:۔

لَمْ یَصِحَّ عَنْ عُثْمَانَ اَصْلًا۔ کہ یہ روایت حضرت عثمانؓ سے بالکل ثابت نہیں۔

۲
دوئم جواب یہ ہے کہ مصحف عثمانی پر اجماع صحابہ ہے اور رسم عثمانی بھی وحی سے ثابت

ہے۔ تو غلطی پر اجماع کیونکر ممکن ہے۔

سوم[۳] یہ کہ اس روایت کی ابتداء میں یہ مذکور ہے کہ حضرت عثمانؓ نے ارکان جمع قرآن کو خطاب کیا۔ اَحْسَنْتُمْ وَاَجْمَلْتُمْ، "تم نے اچھا اور عمدہ کام کیا" اگر اس مجموعہ میں غلطی ہوتی تو آپ غلطی کی تحسین کس طرح کر سکتے تھے۔ ابو عبیدہ نے عبدالرحمن بن ہانی سے نقل کیا ہے کہ میں حضرت عثمان کے پاس تھا کہ کاتبان قرآن مصاحف پیش کرتے تھے تو اس میں لَمْ یَتَسَنَّ، لَا تَبْدِیْلَ لِلْخَلْقِ، وَاَمْهِلِ الْکَافِرِیْنَ لکھا ہوا تھا۔ آپ نے قلم دوات منگا کر تین جگہوں کی کتابت کی غلطی کو درست کر دیا۔ لَمْ یَتَسَنَّ کے ساتھ ہا لگا کر لَمْ یَتَسَنَّهْ کر دیا، لِلْخَلْقِ کو لِخَلْقِ اللّٰهِ کر دیا اور اَمْهِلِ الْکَافِرِیْنَ کو مَهِّلِ الْکَافِرِیْنَ کر دیا۔ اس روایت سے لحن والی روایت کی غلطی ثابت ہو گئی کہ جب آپ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ کتابت کی معمولی غلطی تک کو آپ نے نہ چھوڑا بلکہ درست کر دیا تو دیگر غلطیوں کو قرآن میں کس طرح رہنے دیتے ہوں گے۔

چہارم[۴] یہ کہ قرآن میں لحن ہے جس کو عرب اپنی زبانوں سے درست کر دیں گے۔ یہاں لحن کے معنی غلطی نہیں بلکہ قرآن کے وہ صحیح الفاظ مراد ہیں جو عرب کی زبان پر چڑھے ہوئے نہ تھے اور ان کے طرز گفتگو کے موافق نہ تھے ایسے الفاظ کے متعلق فرمایا کہ قرآن میں ایسے انداز کے الفاظ ہیں جن کو عرب بار بار پڑھ دینے سے قابو کر لیں گے اور ان کی زبان رفتہ رفتہ اس طرز کی عادی بن جائے گی اس میں شک نہیں کہ لفظ لحن دو معنوں میں مشترک ہے۔ ایک معنی غلطی ہے اور دوسرا معنی طرز کلام۔ حضرت عثمانؓ کی روایت میں دوسرا معنی مراد ہے اور یہی معنی امام لغت راغب نے مفردات القرآن میں لکھا ہے کہ اس کو لحنِ محمود کہا جاتا ہے اور اسی کے متعلق عرب کے شاعر نے کہا ہے ؎

خیر الحدیث ما کان لحنا ۔۔۔ اچھی بات وہ ہے جو خاص طرز سے کہی جائے

اور یہی معنی خود قرآن کے وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِیْ لَحْنِ الْقَوْلِ میں استعمال کیا گیا ہے اور حدیث بخاری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی استعمال کیا ہے لعل بَعْضَكُمْ اَلْحَنُ بِحُجَّتِهٖ جس کا مطلب یہ ہے کہ فریقین مقدمہ میں سے کبھی ایک فریق فصیح طرز کلام کا ماہر ہوتا ہے میں اس کی

بات سُن کر فیصلہ کرتا ہوں۔ لہٰذا اگر وہ چیز واقع میں اس شخص کا حق نہ ہو تو یہ ڈگری اس کے حق میں آگ کا ایک ٹکڑا ہوگا۔ ان حوالہ جات کے تحت لفظ لحن سے غلطی مراد نہیں، بلکہ ایک خاص طرزِ تلفظ مراد ہے۔

پنجم[۵] یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لحن رسم الخط کا لحن مراد ہو کہ رسم مصحفِ عثمانی میں بعض جگہ ملفوظ اور مکتوب موافق نہیں لیکن عرب اہلِ لسان اپنی زبان سے اس کو درست پڑھ لیں گے۔ جیسے خود انگریزی زبان میں مکتوب اور ملفوظ برابر نہیں لیکن زبان دان درست پڑھ لیتے ہیں۔

روایاتِ ابنِ عباس در بارہ تحریف | مستشرقین نے ابنِ عباس کی بعض روایات کی نقل کی ہے۔ مثلاً وَقَضٰی رَبُّكَ کی جگہ وَصّٰی، اَوْ مِثْلُ نُوْرِہٖ کی جگہ نُوْرُ الْمُؤْمِنِ وغیرہ۔ اگرچہ ان روایات سے معنی قرآن میں کوئی معتد بہ فرق نہیں پڑتا تاہم صاحب مناہل العرفان نے کئی جواب دیئے ہیں۔

۱۔ اِنَّ هٰذِهٖ رِوَايَاتٌ ضَعِيْفَةٌ لَمْ يَصِحَّ شَئٌ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ۔ یعنی یہ روایات ضعیف ہیں۔ ابنِ عباس سے ثابت نہیں۔

۲۔ یہ روایات قرآن کی قراءتِ متواترہ کے خلاف ہیں لہٰذا ساقط ہیں۔

جوابِ عام۔ ابنِ عباس سے اسی سلسلہ میں جس قدر روایات مخالفینِ اسلام نے نقل کی ہیں اُن سب کا جوابِ عام یہ ہے کہ ابنِ عباس قرآن اور قراءتِ قرآن میں زید بن ثابت اور ابی بن کعب کے شاگرد ہیں، اور آپ نے جو قراءت سیکھی انہی سے سیکھی اور یہ دونوں حضرات اس مجلس کے رُکن تھے جو جمع قرآن کے لئے حضرت عثمانؓ نے مقرر کی تھی لہٰذا ابنِ عباس کے دونوں استادوں نے جن الفاظ کے ساتھ اتفاق کیا اور سب صحابہ نے بھی کیا۔ ابنِ عباس قطعاً اس کے مخالف نہیں ہو سکتے لہٰذا ایسی تمام روایات ضعیف اور ناقابلِ اعتماد ہیں اور اگر بالفرض ان کو ثابت بھی تسلیم کیا جائے تو بھی قرآن موجود کے تمام الفاظ جو وقتِ نزول سے اب تک متواتر ثابت ہیں اُن کے مقابلے میں کسی ایک فرد کا بیان قابلِ اعتبار نہیں۔ جیسے کہ شہر بغداد کا وجود تواتر سے ثابت ہے اب ایک شخص اس تواتر کے خلاف بیان دے تو وہ قطعاً قابلِ اعتبار نہیں ہو سکتا بلکہ صحابہ کرام

میں سے کسی ایک کی طرف تواتر کے خلاف کسی بیان کو منسوب کرنا خود اس بیان کو ناقابلِ اعتماد قرار دینے کے لئے کافی ہے، کسی جواب کی ضرورت نہیں۔

شیعہ اور تحریفِ قرآن

مستشرقین جب ہر طرح قرآن کی تحریف ثابت کرنے سے عاجز آگئے تو بڑے زور شور سے یہ لکھ دیا کہ مسلمانوں کا بڑا فرقہ تحریفِ قرآن کا قائل ہے اور وہ شیعہ ہے اور اس انداز سے لکھا کہ گویا تحریفِ قرآن شیعوں کا مسلّم عقیدہ ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ شیعوں کا مذہب وہی ہے، جو سنّیوں کا ہے کہ قرآن مکمّل طور پر محفوظ ہے اور اس میں ایک حرف کی کمی بیشی نہیں ہوئی جس کے لئے شیعوں کی متعدد کتابوں کے حوالجات پیش کرتا ہوں۔

۱۔ شیخ صدوق ابوجعفر محمد بن علی بابویہ رسالہ اعتقادیہ میں لکھتے ہیں:۔

مَا بَیْنَ الدَّفَّتَیْنِ لَیْسَ بِاَکْثَرَ مِنْ ذٰلِکَ وَمَنْ نَسَبَ اِلَیْنَا اِنَّہٗ اَکْثَرُ فَھُوَ کَاذِبٌ۔	جو کچھ قرآن کی ان دو جلدوں میں ہے قرآن اس سے زیادہ نہیں اور جس نے ہم کو یہ منسوب کیا کہ وہ زیادہ ہے وہ جھوٹا ہے۔

۲۔ تفسیر مجمع البیان ابوالقاسم علی بن الحسین الموسوی میں ہے:۔

اِنَّ الْقُرْاٰنَ عَلٰی عَھْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَجْمُوْعًا مُّؤَلَّفًا عَلٰی مَا ھُوَ الْاٰنَ وَذَکَرَ اَنَّ مَنْ خَالَفَ مِنَ الْاِمَامِیَّۃِ وَالْحَشْوِیَّۃِ لَا یُعْتَبَرُ بِخِلَافِھِمْ لِاَنَّھُمْ قَبِلُوا الْاَخْبَارَ الضَّعِیْفَۃَ۔	قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جمع ہو چکا تھا۔ جیسا کہ اب ہے۔ جو امامیہ اور حشویہ اس کے خلاف ہیں اُن کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ انہوں نے ضعیف خبروں کو قبول کیا ہے۔

۳۔ سیّد مرتضیٰ شیعی لکھتے ہیں:۔

اِنَّ الْعِلْمَ بِصِحَّةِ الْقُرْآنِ	موجودہ قرآن کی صحت کا علم الیسا یقینی ہے
كَالْعِلْمِ بِالْبُلْدَانِ وَالْوَقَائِعِ	جیسے مشہور شہروں کی موجودگی کا علم، اور
الْكِبَارِ۔	بڑے بڑے واقعات تاریخیہ کا علم۔

۴۔ قاضی نوراللہ الشوستری الشیعی مصائب النواصب میں لکھتے ہیں:۔

مَانُسِبَ اِلَى الشِّيْعَةِ الْاِمَامِيَّةِ	جو بات امامیہ شیعوں کی طرف منسوب
بِوُقُوْعِ التَّغَيُّرِ فِي الْقُرْآنِ لَيْسَ	کی گئی ہے کہ وہ قرآن میں تغیر مانتے ہیں
مِمَّا قَالَ بِهٖ جَمْهُوْرُ الْاِمَامِيَّةِ وَاِنَّمَا	یہ جمہور امامیہ کا قول نہیں، بلکہ جھوٹے
قَالَ بِهٖ شِرْذِمَةٌ قَلِيْلَةٌ مِّنْهُمْ لَا	گروہ کا قول ہے جن کا اعتبار نہیں
اِعْتِدَادَ بِهِمْ وَقَالَ الْمُلَّا صَادِقٌ	ملا صادق شرح کلینی میں لکھتے ہیں
فِيْ شَرْحِ الْكُلَيْنِيِّ مُظْهَرُ الْقُرْآنِ	کہ قرآن کو اسی ترتیب کے ساتھ
بِهٰذَا التَّرْتِيْبِ عِنْدَ ظُهُوْرِ الْاِمَامِ	بارھواں امام ظاہر فرمادیں گے۔
الثَّانِيْ عَشَرَ۔	

۵۔ محمد بن الحسن الحر العاملی جو شیعہ امامیہ کے بڑے محدثین میں سے ہیں اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں جو انہوں نے کسی ہم عصر عالم کی رد میں لکھا ہے کہ "ہر کسے تتبع اخبار تفحص تواریخ و آثار نمودہ بعلم یقینی میداند کہ قرآن در غایت درجہ تواتر بودہ و آلاف صحابہ ضبط و نقل کردہ و آں در عہد رسول اللہ مجموع و مولف بودہ"۔ (ترجمہ) جس نے بھی اخبار و آثار تواریخ کی جستجو کی وہ یقینا جانتا ہے کہ قرآن موجودہ انتہائی تواتر کے ساتھ ثابت ہے اور ہزارہا صحابہ نے اس کو نقل و ضبط کیا ہے اور وہ حضور علیہ السلام کے زمانے میں جمع ہو چکا تھا۔

۶۔ فروع کافی کتاب الروضہ ص۸۵ میں حضرت علیؓ سے روایت ہے :۔

هُوَ كِتَابٌ كَرِيْمٌ فَضَّلَهٗ وَفَصَّلَهٗ	قرآن معزز کتاب ہے۔ جس کو
وَبَيَّنَهٗ وَاَوْضَحَهٗ وَاَعَزَّهٗ وَ	اللہ نے فضیلت اور بزرگی بخشی

وَحَفِظَهُ مِنْ اَنْ يَاتِيَهُ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ ۔ ہے اور اس کو باطل کی آمیزش سے محفوظ کیا ہے۔

۷۔ شیخ صدوق رسالہ عقائد میں لکھتے ہیں :۔

اَلْقُرْآنُ الْمُنَزَّلُ وَمَا بِاَيْدِي النَّاسِ وَاحِدٌ لَا زِيَادَةَ فِيْهِ وَلَا نُقْصَانَ ۔ نازل شدہ قرآن اور جو قرآن لوگوں کے ہاتھ میں ہے ایک ہے جس میں کمی بیشی نہیں۔

ان مستند حوالجات شیعہ کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ شیعہ میں چند ناقابلِ اعتبار افراد کے سوا کوئی بھی تحریف یا قرآن میں کمی بیشی ہونے کا قائل نہیں۔ مزید تفصیل نعمان آلوسی کی کتاب الجواب النبیح لما لفقہ عبدالمسیح میں ملاحظہ کی جائے۔ قرآن حکیم تحریری اور دماغی دونوں طرح محفوظ ہے اور الفاظ قرآن اور مطالب قرآن دونوں معجزہ ہیں۔

تحریفِ بائبل

اس کے برخلاف بائبل کی نہ کوئی تاریخی بنیاد ہے نہ علمی۔ اناجیل کا یہ حال ہے کہ :-

۱۔ اصل انجیل ایک تھی اور اب چار ہیں اور نجار نے قصص الانبیاء میں لکھا ہے کہ محققین یورپ تسلیم کرتے ہیں کہ ابتدائی تین صدیوں میں ایک سو سے زائد انجیلیں تھیں۔ جو بعد میں ان سے چار کا انتخاب کر کے باقی اناجیل کو ترک کر دیا گیا، اور یہ فیصلہ بھی نایسیا کونسل نے ایک فال کی بناء پر کیا۔

۲۔ پوپ سگٹس کے قدیم کتب خانہ سے انجیل برنابا برآمد ہوئی جو سورۂ مریم کے مطابق حضرت مسیح کی ولادت اور بشارۃ پیغمبر اسلام پر مشتمل تھی۔ پوپ کا مقرب شاگرد فرا مرینو اس کو دیکھ کر مسلمان ہوا۔ یہ انجیل المنار پریس میں چھپ گئی ہے۔ محققین یورپ متفق ہیں کہ ان انجیلوں میں ایک بھی حضرت عیسیٰ کی نہیں اور نہ اُن کا ترجمہ ہے نہ ان کی سند ہے۔ مشہور دشمن مسیحیت

پولوس نے گر کر یہ مشہور کیا کہ مسیح نے اس کو چھوا اور اب ان کی ہدایت پر مسیحیت کی دشمنی چھوڑ کر تبلیغ مسیحیت میں کوشش کروں گا۔ اس نے اور سینٹ پال نے مسیحیت کو بگاڑا۔ دائرۃ المعارف کا مسیحی مصنّف البستانی لکھتا ہے۔ لوقا نے مسیحیت کو مسیحیت کے بدترین دشمن سینٹ پال سے لیا اور ابنیت کفارہ، شراب، مردار اور خنزیر کی حلّت اس نے مسیحیت میں شامل کر کے مسیحیت کو برائیوں کا ایک مجموعہ بنایا۔

انجیل متی | قدمائے نصاریٰ کا اتفاق ہے کہ یہ اصل انجیل نہیں اور نہ اس کا ترجمہ ہے۔ اگر ترجمہ ہو تو ترجمہ کا زمانہ اور مترجم کا نام معلوم نہیں۔ متی نے یہ انجیل ۱۲۹ء بیت المقدس میں بیٹھ کر لکھی وہ حضرت عیسیٰؑ کے صحابی بھی نہیں۔ زدبن بغانی نے یہی لکھا ہے۔

مرقس | پطرس گوانا گو مروج الاخبار میں لکھتا ہے۔ مرقس یہودی تھا۔ رومیوں کے مطالبہ پر اُس نے یہ انجیل لکھی۔ غالباً ۶۱ء میں لکھی۔

لوقا | مسٹر گڈل رسالہ الہام میں لکھتا ہے کہ لوقا کی انجیل الہامی نہیں کیونکہ لوقا نے خود ابتدار میں لکھا ہے کہ اس نے یہ انجیل شاہ فیلس کے ساتھ خط و کتابت کی بنار پر لکھی۔ لوقا انطاکیہ میں طبابت کرتا تھا مسیحیت کو اُس نے بدترین دشمن سینٹ پال سے لیا اور ابنیت کفارہ، شراب مردار، خنزیر کی حلّت مسیحیت میں داخل کی۔

انجیل یوحنا | کیتھولک ہیرالڈ جلد ۷ میں پروفیسر لق سے منقول ہے کہ انجیل یوحنا از ابتدار تا انتہا اسکندریہ کے ایک طالب علم کی تصنیف ہے۔ (الفاروق باجہ زادہ ص۲۴۲)

تثلیث | دائرۃ المعارف کا مسیحی مصنّف البستانی لکھتا ہے کہ تثلیث کا لفظ مسیحیوں نے سب سے پہلے سینٹ پال اور پولوس سے سُنا جو متعصب یہودی تھا اور انہوں نے مسیحی توحید کو شرک سے آلودہ کر کے کامیابی کا سانس لیا۔ اس ضم پرستانہ عقیدہ میں مسیحی صداقت گم ہو گئی۔

ختنہ و غسلِ جنابت | نصاریٰ کو اقرار ہے کہ اختتان سب انبیار نے کیا۔ عیسیٰ علیہ السلام مختون

تھے۔لیکن پولس یہودی نے خلاف کتاب ختنہ بند کرایا چنانچہ (۱) وَلْيُخْتَنَ كُلُّ ذَكَرٍ کہ ہر مرد کا ختنہ کیا جائے[1] (۲) قُلْ لَّهُمْ فِي الْيَوْمِ۔ اَلثَّامِنِ يُخْتَنَنُ الصَّبِيُّ[2]۔اور حضرت مسیح فرماتے ہیں لَا اُغَيِّرُ شَيْئًا فِي التَّوْرَاتِ کہ میں تورات میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کروں گا[3] (۳) جس مرد سے منی نکلے تو سارے بدن کو پانی سے دھو ڈالے اور حائضہ بھی اسی طرح کرے۔ (۴) خنزیر حرام ہے[4]۔ ان حوالجات سے معلوم ہوا کہ اناجیل اور اُن کے احکام کی تحریف کس حد تک کی گئی۔

بائیبل کی تحریف کی داخلی شہادت اگر تاریخی شہادتوں اور خود محققین یورپ کے اقرار سے قطع نظر کی جائے تو خود بائیبل کے اندر ایسے مضامین موجود ہیں جن سے اُن کی تحریف نمایاں طور پر واضح ہو جاتی ہے۔ دین و مذہب میں بنیادی مسائل تین ہیں۔

۱۔ تصوّر الوہیّت ۲۔ تصوّر نبوّت ۳۔تصوّر مجازات اعمال یا آخرت۔

ہر مذہب کے یہ بنیادی اصول ہیں۔

۱۔ تصوّر الوہیّت میں خدا کی عظمت و تنزیہ و تقدّس کا ہونا ضروری ہے تاکہ انسان اس کی صحیح معرفت کو پا سکے اور قلب اس کی شان جلال و جمال سے منوّر و معمور ہو سکے۔

۲۔ تصوّر نبوّت کو ایسے انداز سے پیش کیا جائے کہ انسان کا دل و دماغ نبی کی عظمت و عصمت کے آگے جُھک جائے اور اس کی اطاعت کی تڑپ اس کے دل میں پیدا ہو۔

۳۔ تصوّر مجازاۃ و جزاء اعمال کا نقشہ ایسا ہو کہ انسان کو نیکی کی ترغیب اور بدی سے خوف اور نفرت دلائے اور نتائج اعمال کا دینی تصوّر اس کو اطاعت پر آمادہ کرے اور معصیّت سے روک دے کیونکہ ابشار نتائج خیر اور انذار نتائج شر کا مقصد انسانی شخصیّت کی اصلاح اور جماعتی زندگی کی پاکی ہے۔

اسی معیار پر اب ہم بائیبل کی تعلیمات اور ہدایات کو پرکھتے ہیں کہ وہ تینوں تصوّرات

---

[1] تورات تکوین [2] سفر الاحبار باب ۱۸ [3] متی باب ۵ [4] سفر الاحبار باب ۲۱

کے مقاصد کو کہاں تک پورا کرتی ہے۔

تصورِ الوہیت اور بائیبل ۱۔ خداوند زمین پر انسانی پیدائش کرنے سے پچتایا اور دلگیر ہوا[له]
۲۔ پچتاتے پچتاتے میں تھک گیا۔ (کتاب یرمیا باب ۱۵۔ درس ۶) خط کشیدہ الفاظ سے خدا کا جاہل اور مغموم ہونا اور تھکنا ثابت ہوتا ہے جو کسی طرح اللہ کی شایانِ شان نہیں۔

۳۔ "تم بے شک اس زمین کو نہ پہنچو گے جس کی بابت میں نے قسم کھائی ہے کہ میں تمہیں وہاں بساؤنگا" (تورات گنتی باب ۱۴ آیت ۳۰ پھر آیت ۳۵ میں ہے) تب تم میری عہد شکنی کو جان لوگے۔ قسمیہ عہد کو توڑنا شریف انسان کی شایانِ شان نہیں چہ جائیکہ خالقِ کائنات کی۔

۴۔ یعقوب صبح صادق تک تمام رات خدا کیساتھ کشتی کرتا رہا اور صبح جب جانے لگا تو یعقوب نے بغیر برکت سے لئے جانے نہ دیا۔ (پیدائش باب ۳۲ آیت ۲۴)

۵۔ خدا ان کے اندامِ نہانی کو اُگھاڑ دے گا۔ (کتاب یسعیا باب ۳ آیت ۱۸)

۶۔ خدا خیمے کے دروازے پر کھڑا ہوا اور اس کے منہ سے آگ اور نتھنوں سے دھواں نکلا اور سوار ہو کر دوڑا۔ لوگوں نے موسیٰ و ہارون کے ساتھ خدا کو کرسی پر بیٹھے دیکھا اور کھایا پیا۔ اس کا لباس برف کا سا سفید اور اس کے سر کے بال ستھرے اون کے مانند تھے[له]

۷۔ ہمارا خدا یہودا سے پیدا ہوا۔ (عبرانیوں باب ۷ آیت ۱۴)

۸۔ خدا کی بیوقوفی لوگوں کی حکمت اور اس کی کمزوری لوگوں کے زور سے زیادہ ہے۔ تو میرا بیٹا ہے۔ تو آج مجھ سے پیدا ہوا (اعمال باب ۱۳ آیت ۳۲)

ان حوالجات سے آپ خدا کے بائیبلی تصور کا اندازہ لگا لیجئے جس سے بڑھ کر خدا کی توہین کیا ہو سکتی ہے۔ پھر قرآن کا یہ حکم کہ لیس کمثله شی، ولم یکن له کفوا احد کو تصور کیجئے کہ خدا کی ہستی کسی شی کی مانند نہیں اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے۔

له تورات پیدائش درس ۵-۶ ۔ ٢ه اوّل سلاطین باب ۲۲

بائیبل اور تصوّرِ نبوّت

۱: نوح شراب پی کر بدمست ہوگئے۔ ستر ان کا برہنہ ہوا اور ان کے بیٹوں نے ڈھانکا (پیدائش باب ۱۹)

۲: لوط نے شراب پی کر اپنی بیٹیوں سے زنا کیا اور معاملہ ۲ دو بار وقوع میں آیا۔ (پیدائش باب ۱۹)

۳: حضرت یعقوب نے بکری کے بچوں کی کھال ہاتھ پر لپیٹ کر جھوٹ بولا، اور اپنے باپ کو دھوکہ دینے کے لئے اپنا نام عیص بتلایا۔ (پیدائش باب ۲۷)

۴: حمور کے بیٹے سکم نے حضرت یعقوب کی بیٹی دینا سے زنا کیا۔ (پیدائش باب ۳۴)

۵: بنی اسرائیل کے کہنے سے موسیٰ کی غیبت میں ہارون نے زیور کا بت بنوایا اور بنی اسرائیل سے اس کو پُجوایا، اور اس کے لئے قربانی گذارنے کا حکم دیا، اور کہا یہ تمہارا معبود ہے جو تم کو مصر کی زمین سے نکال لایا۔[۱]

۶: داؤد بام پر چڑھے حتی اوریا کی جورو کو نہاتے دیکھ کر اس پر فریفتہ ہوا اور بلوا کر اس سے زنا کیا جب وہ حاملہ ہوئی تو اُس کے خاوند کو مکر سے مروا ڈالا۔ (سموئیل کی دوسری کتاب باب ۱۱)

۷: حضرت سلیمان نے باوجود ممانعت کے موابی اور عمونی بت پرست عورتوں کو بیوی بنایا اور خواہشِ نفسانی کی یہ طغیانی ہوئی کہ سات سو بیگمات اور تین سو حرموں تک نوبت پہنچی۔ پھر ان پر یہاں تک عاشق اور مریدِ زن ہوئے کہ بتوں کی طرف مائل ہوئے۔ اور آخری عمر میں ایمان کو بھی سلام کر گئے۔ (اوّل سلاطین باب ۱۵)۔

۸: ہم ایمان لاتے ہیں کہ تو خدا سے نکلا ہے۔ یعنی یسوع۔ (یوحنا باب ۱۶۔ آیت ۳۰)

۹: یسوع نے کہا۔ آسمان اور زمین کا کُل اختیار مجھے دیا گیا۔ (متی باب ۲۸۔ آیت ۱۸)

۱۰: جتنے مجھ سے پہلے آئے ہیں وہ سب چور اور ڈاکو ہیں۔ (یوحنا باب ۱۰ آیت ۲۷)

نبی امت کے لئے نمونۂ عمل ہوتا ہے۔ کیا نبیوں کی یہ شان مقصدِ نبوّت کو پورا کر سکتی ہے؟

بائیبل اور مجازاۃ اعمال

۱: جتنے لوگ شریعت پر تکیہ کرتے ہیں وہ سب لعنت کے ماتحت ہیں۔[۲]

---

[۱] خروج باب ۳۲ - [۲] گلیتون باب ۳۔ آیت ۱

۲- خدا کسی کی عدالت نہیں کرتا اس نے عدالت کا سارا کام اپنے بیٹے کے سپرد کیا۔[۱]
۳- مسیح جو ہمارے لئے لعنتی بنا اُس نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا۔[۲]
۴- وہ نہ صرف ہمارے گناہوں کا کفارہ ہے بلکہ تمام دنیا کے گناہوں کا بھی۔[۳]
۵- پادریوں کو گناہ بخشوانے کا اختیار ہے۔ جن کے گناہ تم بخشواؤ، بخشے گئے۔ جن کے گناہ تم قائم رکھو، قائم رکھے گئے۔ (یوحنا باب ۱۲ آیت ۲۲)

کیا اس تصوّر مجازاۃ کے بعد نیکی کرنے اور گناہ سے بچنے کا جذبہ باقی رہ سکتا ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب تحریفات ہیں۔

فصل ششم

مکّی و مدنی و تعدادِ سور و آیات و کلمات و حروف کے بیان میں

مکّی و مدنی کے متعلق تین اصطلاحات ہیں۔

۱- جو سورتیں آغاز ہجرت کے زمانہ سے پیشتر نازل ہوئی ہیں وہ مکّی ہیں اور جو بعد میں نازل ہوئیں وہ مدنی۔

۲- جو سورتیں مکہ میں نازل ہوئیں وہ مکّی ہیں۔ مکہ سے مراد مکہ اور اس کے مضافات دونوں ہیں۔ جن جیسے منیٰ و عرفات و حدیبیہ ہیں اور جو مدینہ میں نازل ہوئیں وہ مدنی ہیں۔ مدینہ سے بھی مدینہ اور اس کے مضافات مراد ہیں مثلاً بدر، احد و سلع۔

۳- جن آیات میں اہل مکہ کو خطاب ہے وہ مکّی ہیں اور جن میں اہلِ مدینہ کو خطاب ہے وہ مدنی ہیں۔ مشہور پہلا قول ہے۔ مکّی اور مدنی کی معرفت اقوال صحابہ و تابعین سے معلوم ہوتی ہے۔ جیسے کہ

---

[۱] یوحنا باب ۵ آیت ۲۱ [۲] گلیتون باب ۳ آیت ۱۳ [۳] یوحنا کا پہلا عام خط باب ۱۲ آیت ۲

ابوبکر بن العربی نے "انتصار" میں لکھا ہے، مکی و مدنی کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول منقول نہیں۔ مکی و مدنی کے معلوم کرنے کا یہ فائدہ ہے کہ نزول میں جو آیات متقدم ہیں اور جو متاخر ان کا علم ہو جاتا ہے جو نسخ و تخصیص کی معرفت میں کار آمد ہے۔ ابوالحسن بن الحصار سے منقول ہے کہ بیس[۲۰] بالاتفاق مدنی ہیں اور بارہ[۱۲] سورتیں مختلف فیہا ہیں باقی سب مکی ہیں لیکن ابی بن کعب کے نزدیک ستائیس سورتیں مدنی ہیں باقی مکی ہیں۔ مزید تفصیل اتقان جلد ا صفحہ ۹-۱۰ پر ملاحظہ کیا جائے۔

تعداد سور قرآن تعداد سور قرآن میں مشہور دو[۲] قول ہیں۔

۱۔ قرآن کی سورتیں ایک سو چودہ[۱۱۴] ہیں یعنی سورۂ انفال و برأت الگ الگ سورتیں ہیں۔

۲۔ دوم قول یہ ہے کہ تعداد سور قرآن ایک سو تیرہ ہیں یعنی انفال و برأت ایک صورت شمار کی جاتی ہے۔

قرآن کو سورتوں میں تقسیم کرنے کی چند حکمتیں ہیں۔

۱۔ ہر سورت کو ایک مستقل معجزہ کی شکل میں پیش کرنا۔

۲۔ پڑھنے والوں اور حفظ کرنے والوں کے دل میں نشاط اور خوشی پیدا کرنا تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ ہم مستقل حصہ ختم کر چکے۔

۳۔ مضامین متناسبہ کو یکجا کرنا۔ (اتقان جلد ا ص۶۶)

فائدہ مہمہ چند ضوابط ہیں جن سے مکی و مدنی سورتوں کا علم ہوتا ہے۔

۱۔ جس سورۃ میں کلّا آیا ہے وہ مکی ہیں۔ لفظ کلّا ۳۳ جگہ ۱۵ سورتوں میں آیا ہے جو سب قرآن کے نصف اخیر میں ہے گویا نصف اخیر کا اکثر حصہ مکی ہے چند مستثنیات مدنی ہیں۔

۲۔ جس سورۃ میں سجدہ ہے وہ مکیہ ہے۔

۳۔ جس سورۃ کے اوّل میں حروف تہجی ہے بجز بقرہ آل عمران کے وہ سب مکی ہیں۔

۴۔ مفصّل یعنی قرآن کا آخری ساتواں حصہ[ع] اکثر مکی ہے۔

ع طلاق تحریم نصر مدنی ہیں

۵۔ جس سورۃ میں حدود و فرائض ہیں وہ مدنی ہیں۔

۶۔ جن سورتوں میں جہاد کا بیان ہے وہ مدنی ہیں۔

۷۔ جن سورتوں میں منافقوں کا بیان ہے وہ مدنی ہیں۔ (مناہل العرفان جلد ۱ ص ۱۸۹-۱۹۰)

تعداد آیات قرآن | شمار حضرت عائشہؓ کے مطابق ۶۶۶۶ ہے۔

تعداد کلمات | حضرت مجاہد کے شمار کے اعتبار سے ۷۶۲۵۰ ہے۔

تعداد حروف | حضرت ابن مسعودؓ کے شمار کے مطابق ۳۲۲۶۷۱ ہے۔

فتحات ۵۳۲۴۳ کسرات ۳۹۵۸۲ ضمات ۸۸۰۴

نقاط ۱۰۵۶۸۴ ۔ (تاریخ القرآن صارم ص ۱۱۹ و فنون الافنان لابن الجوزی)

مختلف سورتوں کے مختلف نام

سبع طوال | سات بڑی سورتیں۔ ۱: بقرہ ۲: آل عمران ۳: نساء ۴: مائدہ ۵: انعام ۶: اعراف ۷: انفال مع توبہ

مئین | وہ سورتیں جن میں سَو یا کسی قدر زیادہ آیتیں ہوں۔ سورۂ یونس سے سورۂ فاطر تک۔

المثانی | وہ سورتیں جن میں سَو سے کم آیتیں ہوں۔ سورۂ یٰسین سے قٓ تک۔

مفصّل | چھوٹی چھوٹی علٰحدہ سورتوں کا نام ہے۔ سورۂ قٓ سے آخر قرآن تک۔ یہ چھبیسویں پارہ[26] کے ثلث کے بعد آخر قرآن تک ہے۔ مفصّل کی تین قسمیں ہیں۔

طوال مفصّل : قٓ یا حجرات سے سورۂ بروج تک۔

اوساط مفصّل : سورۂ بروج سے سورۂ لم یکن تک۔

قصار مفصّل : سورۂ لم یکن سے والناس تک۔ اور

بعضوں کے نزدیک طوال مفصّل سورۂ قٓ سے مرسلات تک، اوساط سورۂ نبا سے والضحیٰ تک، قصار الم نشرح سے ناس تک۔

مہمّاتِ قرآن

فصلِ اوّل —— ہستیِ باری جلّ مجدّہ

اِنسانی تاریخ جب سے چلی ہے اس وقت سے اثبات باری جل مجدہ کا عقیدہ موجود چلا آیا ہے اور ہر قوم اور ہر ملک کے افراد کی اکثریت اس پر متفق چلی آئی ہیں۔ اگرچہ باقی چیزوں میں اختلاف موجود ہے لیکن وجودِ باری کا عقیدہ انسانی اکثریت کا متفقہ مسئلہ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہر دور میں اور بالخصوص دورِ حاضر میں ایک چھوٹی جماعت منکر خدا بھی رہی ہے لیکن یہ انکار کسی علمی تحقیق یا برہان و دلیل پر مبنی نہیں ہے بلکہ لاعلمی کا مظاہرہ ہے۔ ملاحدہ کی اس چھوٹی جماعت کے انکار کا سبب یہ ہے کہ اس نے دائرہ سائنس اور محسوسات میں خدا کو نہیں پایا اس لئے اس کو خدا کا وجود معلوم نہ ہوسکا اسی کا نام عدم العلم ہے جس کو بے وقوف لوگ علم بالعدم سمجھتے ہیں۔ اور ہستی باری جب محسوسات کے دائرہ سے خارج ہے تو اس دائرہ میں خدا کو پانا کیونکر ممکن ہوسکتا ہے لیکن دائرہ محسوسات میں خدا کو نہ پانا اس امر کی دلیل نہیں کہ وہ بالکل نہیں۔ اگر خشکی کے دائرہ میں مچھلی نہ مل سکے تو کیا مچھلی کے وجود سے انکار صحیح ہوگا؟ اور اگر سمندروں اور دریاؤں کے دائرہ میں خشکی کے دائرہ کی کوئی چیز معلوم نہ ہوسکے مثلاً گوہ وغیرہ تو کیا اس کے وجود سے کلیۃً انکار درست ہوگا؟ ملحدین کے متعلق جو کچھ ہم نے لکھا اس کا وہ خود اقرار کرتے ہیں۔ پروفیسر لیتر (LETTRE) جو اس گروہ کا بڑا عالم ہے، لکھتا ہے کہ چونکہ ہم کائنات کے انجام و آغاز سے ناواقف ہیں اس لئے ہمارا یہ منصب نہیں کہ کسی ازلی یا ابدی وجود کا انکار کریں جس طرح ہمارا یہ کام بھی نہیں کہ ہم اس کو ثابت کریں۔ مادی مذہب

اپنے آپ کو عقل اول کے وجود کی بحث سے بالکل الگ رکھتا ہے کیونکہ اس کو اس کے متعلق کوئی علم نہیں۔ ہم حکمتِ الٰہی کے نہ منکر ہیں نہ مثبت، ہمارا کام نفی و اثبات سے بالکل الگ رہنا ہے لیکن سائنس دانوں کی اکثریت خدا کی ہستی کی قائل ہے۔ (الکلام حصہ دوم ص۹)

۱۔ ایزک نیوٹن کہتا ہے کائنات کے اجزاء میں باوجود ہزاروں انقلابات زمان و مکان کے جو ترتیب و تناسب ہے وہ ممکن نہیں کہ بغیر کسی ایک ذات کے پایا جا سکے، جو سب سے اول ہے اور صاحب علم اور اختیار ہے۔

۲۔ اس زمانہ کا سب سے بڑا حکیم و سائنس دان ہربرٹ سپنسر کہتا ہے۔ ان تمام اسرار سے جن کی یہ کیفیت ہے کہ جس قدر ہم زیادہ غور کرتے ہیں اُسی قدر وہ اور غامض ہوتے جاتے ہیں۔ اس قدر قطعی ثابت ہوتا ہے کہ انسان کے اوپر ایک ازلی و ابدی قوت موجود ہے جس سے تمام اشیاء صادر ہوتی ہیں۔

۳۔ کیمل فلاماریاں فرانس کا فاضل کہتا ہے۔ تمام اساتذہ اس بات کے سمجھنے سے عاجز ہیں کہ وجود کیونکر ہوا اور یہ کیونکر برابر چلا آتا ہے۔ اس بناء پر ان کو مجبوراً ایک ایسے خالق کا اقرار کرنا پڑتا ہے جس کا مؤثر ہونا ہمیشہ اور ہر وقت قائم ہے۔

۴۔ پروفیسر لنی لکھتا ہے خدائے قادر و دانا اپنی عجیب و غریب کاریگریوں سے میرے سامنے اس طرح جلوہ گر ہوتا ہے کہ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں اور میں بالکل دیوانہ ہو جاتا ہوں ہر چیز میں ـــــ گو وہ کتنی چھوٹی ہو ـــــ اس کی کس قدر عجیب قدرت، کس قدر عجیب حکمت، کس قدر عجیب ایجاد پائی جاتی ہے۔

۵۔ فونتسل انسائیکلوپیڈیا میں لکھتا ہے۔ علوم طبعیات کا مقصد صرف یہ نہیں کہ ہماری عقل کی پیاس بجھائے بلکہ اُس کا بڑا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی عقل کی نظر خالق کائنات کی طرف اٹھائیں اور اس کی جلال و عظمت پر فریفتہ ہو جائیں۔ (الکلام ص۳۸، ۳۹)

ثبوتِ باری فکرِ جدید کی روشنی میں

فکرِ جدید والوں کے لئے تین شبہات راہِ معرفت الٰہی میں حائل ہیں۔ انکار خدا کا علمبردار امریکہ کا مشہور ملحد ان شبہات کو پیش کرتا ہے۔

۱۔ قطعی علم کا ذریعہ حس یا وجدان ہے (یعنی حسِ باطنی) اور ان دونوں راہوں سے باری تعالیٰ کا وجود ثابت نہیں ہوتا۔

۲۔ باری تعالیٰ کی ذات اور حقیقت، تصور سے بالاتر ہے اور جس چیز کا کنہ نامعلوم ہو وہ کیونکر ثابت مانی جا سکتی ہے۔

۳۔ اگر خدا کی ہستی تسلیم کی جائے تو عالم میں جو شر موجود ہے وہ اس کی حکمت کے خلاف ہے لہٰذا شر پر مشتمل کائنات اس کی طرف منسوب نہیں ہو سکتی۔

پہلے شبہ کا جواب پہلے شبہ کا جواب یہ ہے کہ باری تعالیٰ کی ہستی حسِ باطنی اور وجدان سے ثابت ہے جس کی بڑی دلیل انسانی اکثریت کا یہ اقرار ہے کہ خدا موجود ہے اور ایک قلیل جماعت کو اس سے انکار ہے تو یہ اس وجہ سے ہے کہ ان کا وجدان صحیح نہیں جیسے ظاہری حواس میں نقص واقع ہو سکتا ہے اسی طرح باطنی حواس اور وجدان میں بھی نقص ممکن ہے۔ اگر آنکھوں کی بینائی درست نہ ہو تو چیز نظر نہیں آتی۔ اسی طرح اگر وجدانی بینائی بگڑ جائے تو بھی وجدانی امور کا احساس نہ ہوگا۔ باقی حسِ ظاہری کے ذریعہ خدا کا معلوم نہ ہونا، تو یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ دائرہ محسوسات سے خارج ہے، اگرچہ اس کے وجود میں شبہ نہیں۔ مثلاً کسی چیز کی شیرینی و تلخی اگر آنکھ سے نہ معلوم ہو سکے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ واقع میں شیرینی اور تلخی کا وجود ہی نہیں بلکہ یہ کہنا پڑے گا کہ شیرینی و تلخی کا نظر نہ آنا اور آنکھ کی راہ سے معلوم نہ ہونا اس وجہ سے ہے کہ وہ دائرہ مبصرات سے خارج ہے، اور دائرہ مذوقات کی چیز ہے۔ اسی طرح ذاتِ باری بھی دائرہ محسوسات ظاہرہ سے خارج ہے اور دائرہ وجدانیات یا معقولات کی چیز ہے۔

دوسرے شبہہ کا جواب دوسرے شبہہ کا جواب یہ ہے کہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کو ہم مانتے ہیں لیکن ان کا کنہہ ہمیں معلوم نہیں، تو اگر خدا کی ہستی بھی ایسی ہو تو اس میں کیا اشکال ہے چنانچہ شیخ ندیم الجسر اپنی کتاب "قصتہ الایمان بین الفلسفتہ والعلم والقرآن" کے صفحہ ۲۰ پر لکھتے ہیں کہ سائنس دان تسلیم کرتے ہیں کہ مادہ، روح، حیات کو ہم مانتے ہیں لیکن ان تینوں کا کنہہ اور حقیقت ہمیں معلوم نہیں۔ اس طرح عقل کی حقیقت اور اس کا ادراک حسی پر انطباق بھی ہم کو معلوم نہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان سب اُمور کو ہم تسلیم کرتے ہیں تو پھر خدا کی ہستی سے اسی بنا پر انکار کیوں کیا جاتا ہے۔

تیسرے شبہہ کا جواب تیسرے شبہہ کا جواب یہ ہے کہ:۔

۱۔ اگر کائنات میں ایسے واقعاتِ شر موجود ہیں جس کا اس وقت حکمتِ خداوندی پر منطبق ہونا ہمیں معلوم نہیں تو ممکن ہے کہ کسی دوسرے وقت اس انطباق کا علم ہمیں حاصل ہو جائے۔ ایک خاص وقت میں انطباق کا معلوم نہ ہونا اس امر کی دلیل نہیں کہ کسی وقت بھی معلوم نہ ہو سکے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ بہت سے قوانینِ قدرت کا انسان کو ہزاروں سال علم نہیں تھا لیکن مابعد زمانے میں ہمیں اس کا علم حاصل ہوا۔ اسی طرح عالمی واقعات کا حکمتِ الٰہی پر منطبق ہونا بھی اگرچہ ہمیں اس وقت معلوم نہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر ہمیں معلوم ہو جائے۔

۲۔ ہو سکتا ہے کہ عالمی واقعات کی وہ کڑیاں جو ہمیں بظاہر شر معلوم ہوتی ہیں وہ اس وجہ سے ہو کہ ہم کو واقعات کے پورے سلسلہ کا علم نہیں۔ اگر پورا سلسلہ ہمارے سامنے ہوتا تو جس چیز کو ہم شر سمجھتے ہیں وہ ہمیں خیر نظر آتی۔

۳۔ ابنِ سینا نے شفاء میں جواب دیا ہے کہ دنیا کی تین حالتیں فرض کی جا سکتی ہیں۔

ا۔ محض بھلائی ہو۔ ب۔ محض بُرائی ہو۔

ج۔ زیادہ بھلائی ہو اور کسی قدر بُرائی ہو۔

قدرت کے سامنے یہ تینوں صورتیں تھیں۔ پہلی صورت اختیار کرنے کے قابل ہے اور دوسری

صورت قطعاً ناقابلِ اختیار ہے یہی وجہ ہے کہ قدرت نے ایسی دنیا پیدا نہیں کی جس میں برائیاں ہی برائیاں ہوں۔ صرف تیسری صورت قابلِ بحث ہے کہ کیا قدرت کو ایسا عالم پیدا کرنا چاہیئے یا نہیں جس میں بھلائیاں زیادہ اور بُرائیاں کم ہوں۔ اگر ایسا عالم پیدا نہ کیا جاتا تو یہ فائدہ ہوتا کہ چند بُرائیاں وجود میں نہ آئیں لیکن اس کے ساتھ بہت سی بھلائیوں کا وجود بھی نہ ہوتا اور شرِ قلیل کے لئے خیرِ کثیر سے دنیا محروم ہو جاتی۔ میں کہتا ہوں کہ آگ سے کھانا پکتا ہے، بدن سینکا جاتا ہے، پانی گرم کیا جاتا ہے لیکن یہ مکان اور بدن کو جلاتی بھی ہے۔ پہلی صورتیں خیر ہیں اور دوسری صورت شر لیکن دیکھا جاتا ہے کہ آگ سے ہر روز فوائد مذکورہ بے شمار حاصل کئے جاتے ہیں لیکن آگ سے نقصان کی صورتیں بہت کم ہیں۔ اسی طرح پانی سے نباتات وحیوانات و انسان کی حیات وابستہ ہے لیکن پانی کے سیلاب سے نقصان بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح ہوا مدارِ زندگی ہے لیکن طوفانی ہوا سے درخت اُکھڑ جاتے ہیں لیکن یہ سب نقصانات شاذو نادر ہیں اور فوائد کثیر اور عام ہیں اس لئے قدرت نے خیرِ کثیر کے ضمن میں قلیل مضرت کو نظر انداز کیا۔ اب یہ سوال ہو سکتا ہے کہ کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ بھلائی سے یہ تھوڑی سی برائی الگ کر دی جاتی اور خالص بھلائی باقی رہ جاتی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا کرنا ناممکن تھا۔ اگر آگ سے کھانا پکے گا تو وہ آگ مسجد کو بھی جلائے گی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اس شدید گرمی کی وجہ سے روٹی سالن تو پک سکے اور کپڑا اور مکان نہ جل سکے۔ ورنہ ایسی صورت میں آگ آگ نہ رہتی۔

۴۔ ابنِ رُشد نے اس شُبہ کا یہ جواب دیا ہے کہ دُنیا میں جو بُرائی پائی جاتی ہے وہ بالذات نہیں بلکہ کسی بھلائی کے تابع ہے۔ مثلاً غصّہ بُری چیز ہے لیکن اس سے حفاظتِ خود اختیاری حاصل کی جاتی ہے ورنہ غصّہ نہ ہوتا تو انسان قاتل کا مقابلہ بھی نہ کرتا۔ شہوت بُری چیز ہے، لیکن اس پر بقاءِ نسلِ انسانی کا مدار ہے۔ علیٰ ہذا القیاس آگ، پانی، ہوا۔ ملحدین کے شبہات کے ازالہ کے بعد ہم فکرِ جدید کی روشنی میں اثباتِ باری جل مجدہٗ کے دلائل بیان کرتے ہیں۔

دلیلِ اوّل | عالم کا وجود یا باری تعالیٰ کو منسوب ہوگا یا مادہ اور اس کی حرکت کی طرف بلا قصد و

ارادہ یا مادہ و ارادہ کی طرف منسوب ہوگا قصد و ارادہ کے ساتھ۔ تیسری صورت کا کوئی قائل نہیں نہ مومنین میں سے اور نہ منکرین خدا میں سے کیونکہ مادئین متفق ہیں کہ مادہ قصد و ارادہ سے خالی ہے اب صرف دوسری صورت زیر بحث رہ گئی کہ عالم مادہ کو بلا قصد و ارادہ اتفاقی طور پر منسوب ہو لیکن یہ صورت بھی قطعاً باطل ہے کیونکہ عالم میں حکیمانہ ترتیب موجود ہے جس پر قوانین قدرت دال ہیں۔ عناصر و مرکبات میں ترتیب ہے، تخلیق نباتات اور حیوانات میں مرتب نظام ہے، موسموں اور لیل و نہار کی تبدیلی میں، سیارات کی حرکات میں ایک خاص ترتیب ہے جو مادہ اور اس کی حرکت مصادفتہ اور اتفاقیتہ کا نتیجہ نہیں ہوسکتی۔ اگر دس پرچیوں پر ایک سے لے کر دس تک کے ہندسے لکھے جائیں۔ پہلے پر ایک ۱ دوسرے پر دو ۲ تیسرے پر تین ۳ علی ہذالقیاس دس تک اور ان پرچیوں کو ایک تھیلے میں ڈال دیا جائے اور ایک نابینا بچے سے کہا جائے کہ تم اس تھیلے میں سے ایک ایک پرچا نکالو تو کروڑہا مرتبہ نکال دینے پر بھی ایک سے دس تک کے ہندسوں کے پرچے مرتب نہیں نکل سکیں گے۔ اسی طرح اگر ایک قصیدے کے متفرق مفردات اور الفاظ کاغذ کے پرچوں پر جدا جدا لکھ کر تھیلے میں ڈال کر اسی نابینا بچے سے ایک ایک لفظ نکالا جائے تو کروڑہا مرتبہ ایسا کرنے سے مرتب قصیدہ وجود میں نہیں آسکے گا، تو عالم کا مرتب سلسلہ ایک نابینا اور بے شعور مادہ سے کیونکر ظہور میں بلا قصد و ارادہ آسکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عالم کے متعلق پہلی صورت کہ وہ ایک حکیم خدا کے قصد و ارادہ کے ماتحت ظہور میں آیا ہے، صحیح اور معقول ہے (قصۃ الایمان بین الفلسفۃ والعلم والقرآن لابن ندیم الجسر ص۲۹۶)

دلیل دوم | فلسفہ جدیدہ و قدیمہ دونوں متفق ہیں کہ مادہ عالم، علم، شعور اور حیات سے خالی ہے اور کائنات عالم میں یہ تینوں چیزیں موجود ہیں۔ زندہ اشیاء میں حیات موجود ہے اور انسان میں علم و شعور اور حیوانات میں شعور بلکہ جدید تحقیق کی رو سے بعض نباتات میں بھی شعور موجود ہے اب یہ کیونکر ممکن ہوسکتا ہے کہ ایسی اشیاء صرف مادہ اور اس کی حرکت سے وجود میں آئی ہوں جبکہ خود مادہ حیات، علم، شعور تینوں سے خالی ہیں اور صرف نفی سے اثبات کا وجود محال ہے۔ لہٰذا

کائنات کے وجود کا سرچشمہ وہ ذات ہونا چاہیئے جو حیات و علم سے موصوف ہو اور وہی ذات خدا ہے جو حیّ، علیم و حکیم ہے۔

دلیل سوم | انسانیت کا جوہر، فکر اور ادراک ہے جو نباتات میں خوابیدہ تھا، حیوانات میں اُس نے کروٹ بدلی، انسانیت میں بیدار ہوا اور اُس نے بلند نصب العین کو طلب کیا۔ اب ضروری ہے کہ اس ارتقاء کا کوئی سبب ہوگا۔ علم الحیات کا مشہور ماہر ڈاکٹر لائیڈ مارگن کہتا ہے کہ اس ارتقاء کا ظہور اس امر کی دلیل ہے کہ کائنات کا اصل تخلیقی موجود ہے اور وہ خدا ہے کیونکہ ارتقاء کے لئے منزل کا وجود ضروری ہے۔ علم کا تقاضا یہ ہے کہ تحتانی علم کے غوامض فوقانی میں حل ہوتے ہیں۔ طبعیات کے غوامض کا حل علم الحیات میں اور علم الحیات کے غوامض کا حل علم النفسیات میں اور علم النفسیات کا حل علم تحلیل و تعلیل منطقی میں اور اِس علم کے غوامض کا حل مقام روحانی میں ہوتا ہے۔

دلیل چہارم | عقل انسانی کا خاصہ ہے کہ وہ فردیّت سے کُلیۃ اخذ کرتی ہے اور تجربیّۃ تصوّریۃ پیدا کرتی ہے۔ مثلاً اشخاص انسان سے نفسِ انسانی اخذ کرتی، حیوانات سے نفس حیوانی، نباتات سے نفسِ نباتی، پھر عالمی کثرت سے نفس کلی عالم کی اخذ کرتی ہے۔ یہی نفس کلی اللہ ہے جس پر تمام کثرت ایک وحدت پر منتہی ہوتی ہے۔

ثبوتِ باری سلفی دلائل کی روشنی میں

پہلی دلیل | پہلی دلیل جس کا نام ہم دلیل غرقی رکھتے ہیں۔ امام جعفر صادق سے کسی نے اللہ کے وجود پر دلیل دریافت کی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم سمندر میں کشتی میں سوار ہو اور کشتی ڈوب جائے اور اُس کی کوئی تختی بھی تیرے ہاتھ میں نہ ہو اور تیرنا بھی نہ جانتے ہو تو پھر بھی تم کو سلامتی اور نجات کی اُمید باقی رہے گی؟ سائل نے کہا کہ اُمید تو رہے گی۔ امام موصوف نے فرمایا ظاہری اسباب نہ ہونے کے باوجود جس کے سہارے پر یہ اُمید قائم ہے وہی خدا ہے یہ گویا ہستیِ باری کی نفسیاتی دلیل ہے۔

دوسری دلیل | دلیل فلکی: امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے ثبوت باری تعالیٰ پر یہ دلیل پیش کی کہ کیا یہ

ممکن ہے کہ ایک کشتی آپ سے آپ دریا کے ایک کنارے سے خود بخود چل پڑے اور خود دوسرے کنارے پر پہنچ جاتے؟ سائل نے کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا ہے، تو آپ نے فرمایا کہ ایک چھوٹی سی کشتی خود بخود چلانے والے کے بغیر نہیں چل سکتی تو کارخانۂ عالم کی یہ بڑی کشتی خود بخود چلانے والے کے بغیر کیسے چل سکتی ہے۔ لہذا اس کا چلانے والا موجود اور وہی خدا ہے۔

تیسری دلیل جس کو ہم دلیلِ توتی سے تعبیر کرتے ہیں جو امام شافعیؒ نے ایک سائل کے جواب میں باری تعالیٰ کے اثبات میں پیش کی ہے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا، درخت توت کے پتے جب بکری کھاتی ہے تو اس کی مینگنیاں بن جاتی ہیں اور جب اس کو ریشم کا کیڑا کھاتا ہے تو اس سے ریشم تیار ہوتا ہے اور جب شہد کی مکھی کھا لیتی ہے تو اس سے شہد بن جاتا ہے۔ گویا ایک ہی چیز سے تین مختلف حقیقتیں بن جاتی ہیں، یہ اس قادر مطلق کا فعل ہے جس کو ہم خدا کہتے ہیں۔

چوتھی دلیل دلیل صوتی: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ثبوت باری کے متعلق فرمایا کہ ایک انسان کی آواز دوسرے انسان سے نہیں ملتی۔ اسی طرح شکل بھی جو اس امر کی دلیل ہے کہ اصوات و اشکال کا یہ اختلاف ایک عظیم قوت کا فعل ہے جس کو ہم خدا کہتے ہیں۔

پانچویں دلیل دلیلِ بیضی: مرغی کے انڈے میں بچہ پیدا ہوتا ہے اور پیدا ہو کر انڈے کے چھلکے کا مضبوط قلعہ توڑ دیتا ہے جس سے بچہ باہر نکل آتا ہے اور بچہ نکلنے تک مرغی برابر انڈوں پر بیٹھی رہتی ہے۔ مرغی کو بیٹھنے کا پابند بنانا، بچہ کے بن جانے کا وقت معلوم کرنا، انڈے کے توڑنے کا وقت معلوم ہونا، یہ سب بذریعہ الہام ہے، جس کا مُلہم خدا ہے اُس نے بذریعہ الہام مرغی کو یہ سب کچھ بتلا دیا ہے۔

چھٹی دلیل دلیلِ نباتی: ابو نواس نے گوناگوں پتوں اور اس میں عجیب و غریب خوشنما پھولوں سے خدا کی ہستی پر استدلال کیا ہے جس کی توضیح یہ ہے کہ پھولوں اور اُن کے پودوں کا مادہ پانی اور مٹی ہے جو ایک نوعیت کی چیزیں ہیں اُنہی میں سے مختلف پودوں اور رنگ برنگ خوشنما پھولوں کا بن جانا ایک عظیم قوت کی کارفرمائی ہے اور وہی قوت خدا ہے۔

یہ سب دلائل امام رازی نے تفسیر کبیر جلد اوّل میں نقل کئے ہیں ہم نے ذرا وضاحت سے بیان کیا۔ سعدی فرماتے ہیں ؎

برگِ درختاں سبز در نظرِ ہوشیار　　ہر ورق دفترے است معرفتِ کردگار

ساتویں دلیل | دلیل لسانی: اس وقت دنیا میں مختلف زبانیں موجود ہیں یہ زبانیں اولاد نے والدین سے اور ماحول کے لوگوں سے سیکھی ہیں اور اُنہوں نے اپنے والدین سے علی ہذا القیاس۔ لیکن انسان اوّل کے متعلق سوال ہوگا کہ اس نے بولی، زبان یا لغت کہاں سے سیکھی۔ چونکہ اس وقت دوسرا انسان موجود نہیں تھا اس لئے ماننا پڑے گا کہ اُس کی بولی الہامی ہوگی، اور یہ الہام کنندہ جس نے انسان اوّل کو بولی سکھائی، خدا ہے۔

اب ہم اثباتِ باری تعالیٰ پر فلسفی وکلامی دلائل پیش کرتے ہیں۔

ثبوتِ باری کے کلامی و فلسفی دلائل

۱۔ دلیل حدوثی | کائنات اور عالم دو چیزوں کا نام ہے یا جسم یا جسم سے قائم چیز۔ یہ دونوں چیزیں بالذات یا بالواسطہ دو حالتوں سے خالی نہیں ہوتی۔ حرکت اور سکون۔ اگر جسم اور جسم کے ساتھ قائم چیزیں دو وقتوں میں دو جگہوں میں ہوں تو متحرک ہے اور اگر دو وقتوں میں ایک ہی جگہ میں ہوں تو ساکن ہے پھر یہ دو حالتیں ایسی ہیں کہ حرکتِ سکون سے معدوم ہو جاتی ہے، اور سکون حرکت سے، لہٰذا حرکت و سکون دونوں حادث یعنی نو پیدا ہیں اور جسم اور متعلق جسم بھی ان دو حادث حالتوں سے خالی نہیں کہ ان دونوں حالتوں میں سے ایک نہ ایک حالت اس سے جدا نہیں ہوتی اور لازم رہتی ہے لہٰذا جسم اور متعلق جسم بھی ان دو حالتوں کی وجہ سے حادث ہوا اور حادث کے لئے محدِث یعنی پیدا کنندہ ضروری ہے اگر وہ محدث بھی حادث ہو تو اس کیلئے

اور محدث ہوگا اور تسلسل لازم آئے گا تو ضرور وہ پیدا کنندہ قدیم ہوگا۔ جو خدا ہے تو خدا کا وجود ثابت ہوا۔

۲۔دلیل امکانی | ہر چیز کی تین حالتیں فرض کی جاسکتی ہیں۔ یا ممتنع الوجود[1] جس کا نہ ہونا ضروری ہو جیسے ۲ دو دونے پانچ ۵ یا جس کا ہونا ضروری ہے اس کو واجب الوجود[2] کہتے ہیں یا وہ کہ نہ اس کا ہونا ضروری ہو اور نہ نہ ہونا ضروری ہو جیسے پانی مختلف رنگوں کے اعتبار سے کہ پانی کا رنگ دار ہونا ضروری نہیں لیکن اگر کوئی خاص رنگ اس میں پیدا ہوگا تو بیرونی علت سے پیدا ہوگا ایسی چیز کو ممکن الوجود[3] کہتے ہیں۔اب عالم ممتنع الوجود نہیں کہ وہ موجود ہے اور جو موجود ہے اس کا وجود ممتنع اور محال نہیں ہوتا اور واجب الوجود بھی نہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اس کا وجود ضروری ہوتا اور معدوم نہ ہوتا لیکن عالم کی بہت چیزیں بالمشاہدہ معدوم ہو جاتی اور بعض بالمقائسہ قابلِ عدم ہیں لہذا عالم تیسری قسم میں داخل ہے یعنی ممکن الوجود ہے یعنی اپنی ذات کے اعتبار سے ، عالم کے لئے نہ وجود ضروری ہے اور نہ عدم ، ان دونوں میں سے جو چیز آتے گی بیرونی علّت کے اثر سے آئے گی۔جیسے پانی کے لئے نہ سیاہی ضروری ہے نہ سُرخی۔اگر ان دونوں میں سے کوئی رنگ اس پر پڑے گا تو بیرونی علّت کی وجہ سے۔لہذا عالم کا وجود کسی بیرونی علت کا نتیجہ ہے۔خود عالم کی ذات کا تقاضا نہیں اور وہ بیرونی علت بھی اگر ممکن ہو تو اس کے وجود کیلئے اور بیرونی علت ہوگی۔اس طرح تسلسل آئے گا جو محال ہے، تو ضروری ہوا کہ عالم اور کائنات کا وجود جس علت کا نتیجہ ہے ، وہ ممکن نہیں بلکہ واجب الوجود ہے اور واجب الوجود خدا کا نام ہے۔جس کا وجود ضروری اور تقاضائے ذات ہوتا ہے کسی علّت کا نتیجہ نہیں ہوتا۔

۳۔دلیلِ قاسمی | ایک چیز کو جب دوسری چیز کے ساتھ منسوب کیا تو یا دوسری چیز پہلی چیز کے ساتھ لازم غیر منفک ہوگی جیسے گرمی آگ کے ساتھ۔ایسی چیز کو ما بالذّات یعنی ذاتی مقتضا کہا جاتا ہے جو اس شئے کی ذات کے ساتھ لازم رہے گی اور یا دوسری چیز پہلی چیز کے ساتھ لازم نہ ہوگی بلکہ جدا ہوگی۔ایسی چیز کو ما بالعرض یعنی عارضی اور غیر لازمی وصف کہا جائے گا جیسے پانی کے ساتھ گرمی

کہ کبھی گرم ہوتا ہے جب آگ پر رکھ دیا جائے اور کبھی گرم نہیں ہوتا جب کہ آگ کا اثر اس کو نہ پہنچا ہو یا پہنچ جانے کے بعد آگ سے تعلق ختم ہو کر گرمی زائل ہو گئی ہو۔ ہر ما بالعرض چیز علت کا نتیجہ ہوتی ہے اس لئے اس میں علت کی دریافت کی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہا جائے گا کہ پانی کیوں گرم ہے؟ جس کا جواب یہ ہے کہ آگ کی وجہ سے گرم ہوا، کیونکہ عرضی وصف خانہ زاد اور گھریلو نہیں ہوتا اس کی آمد علت سے ہوتی ہے لہذا علت کا سوال ضرور کیا جاتا ہے لیکن ما بالذات میں یہ سوال نہیں کیا جاتا۔ مثلاً یہ نہیں کہا جاتا کہ آگ کیوں گرم ہے؟ کیونکہ گرمی آگ کی ذاتی صفت ہے کسی علت کا نتیجہ نہیں لہذا کیوں کا سوال کرنا جو دریافت علت کے لئے ہوتا ہے یہاں غلط ہوگا، بلکہ کہنا پڑیگا کہ آگ خود بخود گرم ہوتی ہے۔ اس قاعدے کے مطابق کائنات کا وجود اس کا ما بالعرض ہے کیونکہ یہی چیز موجود ہوتی ہے کبھی معدوم ہو جاتی ہے لہذا یہ سوال کیا جائے گا کہ عالم یا کائنات کیوں موجود ہے جیسے یہ سوال کیا جاتا کہ پانی کیوں گرم ہے؟ عالم کے وجود سے متعلق سوال کا جواب یہ دیا جائے گا کہ کسی ایسی ذات کی وجہ سے موجود ہے کہ وجود اس کے ساتھ لازم غیر منفک ہے اور مقتضائے ذات ہے اور وہ اللہ رب العالمین ہے۔ جس پر آگے سوال کرنا ختم ہو جاتا ہے اور یہ نہیں کہا جاتا کہ خدا کیوں موجود ہے، جیسے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آگ کیوں گرم ہے؟ اس دلیل سے ذات وصفات باری دونوں کا ثبوت ہو جاتا ہے۔ مثلاً انسان میں جو حیات، علم، قدرت، سمع، بصر کلام، ارادہ ہے، یہ ہر وقت ساتھ نہیں ہوتے لہذا ما بالعرض ہوئے اور ما بالعرض کے لئے ما بالذات کا ہونا ضروری یعنی وجود اور صفات متعلقہ بالوجود جبکہ کسی چیز کے لئے عرضی ہوں تو اُن کے لئے ما بالذات اور ذاتی سرچشمہ کا ہونا ضروری ہیں جہاں سے یہ ما بالعرض اشیاء انسان پر فائض ہوئیں اور وہ وجود کے لئے وجودِ خداوندی اور صفات کے لئے صفاتِ خداوندی ہیں جو عالمی وجود وصفات کے لئے سرچشمہ اور خزانہ ہے۔

۴۔ **دلیل اتقانی** | کائنات میں حکیمانہ قوانین موجود ہیں جن کی وجہ سے علل سے معلولات اور اسباب سے مسببات کا علم ہو جاتا ہے اور ان حکیمانہ قوانین کا سلسلہ اس قدر وسیع ہے کہ

ماضی سے اب تک سائنس کے ذریعہ جس قدر قوانین معلوم ہو سکے ہیں یہ ان قوانین کی نسبت جو اب تک معلوم نہیں ہو سکے بہت کم ہیں بلکہ معلوم قوانین کو نامعلوم سے وہی نسبت ہے جو قطرہ کو سمندر سے ہے اور ان حکیمانہ قوانین کی لامحدودیت کی وجہ سے سائنس کی ترقی جاری ہے اور جاری رہے گی۔ اگر یہ قوانین محدود ہوتے تو سائنس کی ترقی رُک جاتی کیونکہ سائنس قوانین قدرت کی دریافت اور انکشاف کا نام ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ لامحدود حکیمانہ قوانین ایک حکیم قادر مطلق ہستی کی طرف منسوب ہو سکتے ہیں جو خدا ہے، نہ کہ مادہ کی طرف جو حیات، شعور، علم و حکمت سب سے خالی ہے۔

۵۔ دلیل حُبّی کائنات میں محبت موجود ہے اور بقول شاہ رفیع الدین نور اللہ مرقدہ کے کہ یہ تمام کائنات میں ساری ہے۔ آپ نے اپنے رسالہ اسرار المحبۃ میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ بالخصوص انسان میں سب سے زیادہ محبّت ہے۔ پھر اس محبّت کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ محبّتِ ناقصہ ۲۔ محبّتِ کاملہ

محبّتِ ناقصہ کا محبوب نفس اولاد و مال ہے اور محبّتِ کاملہ کا محبوب ذات خداوندی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبوبیّت تمام مذاہب میں موجود ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ محبّت الٰہی فطرت میں داخل ہے۔ اب محبّت کے لئے محبوب کا ہونا ضروری ہے۔ مثلاً ہم اپنی ذات، اولاد، اموال سے محبّت کرتے ہیں تو یہ تینوں محبوب موجود ہیں۔ معدوم محبوب نہیں بن سکتا۔ جب محبّتِ ناقصہ کے محبوب کا وجود ضروری ٹھہرا تو محبّتِ کاملہ کا محبوب کیونکر موجود نہ ہوگا جس سے اللہ کا وجود ثابت ہو گیا۔ رہی یہ بات کہ اللہ کی محبّت کیونکر کامل ہے تو اس کی بڑی دلیل یہ ہے کہ کہ ناقص محبوبات مثلاً نفس و مال و اولاد کو انسان اللہ کی محبّت کی راہ میں قربان کرتا ہے جس سے اللہ کا محبوب کامل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ محبوباتِ ناقصہ کا اس پر قربان کیا جانا اس کے محبوبِ کامل ہونے کی دلیل ہے۔

۶۔ دلیل التجائی دُنیا ظلم سے پُر ہے اور مظلوموں کی تعداد ہر زمانہ میں ظالموں سے زیادہ رہی۔

فطرتِ انسانی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان جب عالمِ اسبابِ ظاہرہ سے نا اُمید ہو جاتا ہے تو اپنے دل کو مضبوط کرنے کے لئے اور قنوطیت کو رجائیت میں تبدیل کرنے کے لئے ایک غیبی قوّت سے ربط قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے جو فوق الکل اور قادرِ مطلق ہو اور جو مقلب الاحوال ہو، تاکہ ظلم سے نجات پانے کے لئے اس کی اعانت طلب کی جائے۔ ایسی قوت کی طرف التجاء، دعاء و زاری کا وجود ہر مذہب میں پایا جاتا ہے جو ذاتِ الٰہی کی موجودیت کی دلیل ہے۔

۷۔ دلیل ترتیبی کائنات میں ترتیب موجود ہے۔ لیل و نہار، گرمی سردی، بہار و خزاں، مرتب ہیں۔ سیارگان کی حرکات مرتب ہیں۔ حیوانات و نباتات کی نشو و نما مرتب ہے جو ایک حکیم ذات کی موجودیت کی دلیل ہے کہ ہر ترتیب مرتب کی موجودیت پر دال ہے۔ دیوانِ حافظ کے مرتب الفاظ دلیل ہے کہ یہ الفاظ خود بخود مرتب نہیں ہوئے بلکہ ماہر شاعر نے ان کو ترتیب دیا ہے۔ اسی طرح کائنات کی ترتیب بھی خدا کی ہستی کو ثابت کرتی ہے۔

۸۔ دلیل شعوری عالم ایک عظیم عمارت ہے جس کا ایک پرزہ مبنی بر حکمت ہے اور معمار کی حکمت شعور پر دال ہے لہذا اس عظیم عمارت کو بے شعور مادہ کی طرف منسوب کرنا غیر معقول ہے جس کی مثال ایسی ہے کہ دو آدمی بیابان میں جا رہے ہوں کہ ایک عظیم الشان قلعہ میں اچانک داخل ہو جائیں جس میں کمرے مرتب موجود ہیں، ضروریات زندگی سلیقے کے ساتھ رکھی ہوئی ہوں، فرش فروش قاعدے کے ساتھ بچھے ہوئے ہیں لیکن کوئی انسان موجود نہیں۔ اب ان دو آدمیوں میں سے ایک قلعہ کی اس مضبوط عمارت کی یہ توجیہ کرتا ہے کہ مٹی خود بخود پانی میں پڑ کر گارا بن گئی پھر قالب میں خود بخود پڑ کر اینٹ تیار ہوئی، پھر کوئلہ خود بخود آگر اس نے اس کو پختہ کر دیا۔ اس قلعے کے قالین مویشیوں کے بال ان سے اُڑ کر ایک دوسرے سے جُڑ گئے۔ پھر خود رنگدار پانی میں پڑ کر رنگین ہوتے اور قالین تیار ہو گئے، لیکن دوسرا کہتا ہے کہ قلعہ کی عمارت ایک ماہر انجنیئر کے فہم و فکر کا نتیجہ ہے جس نے اپنے ذہن میں پہلے اس عمارت کا نقشہ تیار کیا پھر عمارت کے لئے جس قدر سامان ضروری تھا مہیا کیا پھر ہوشیار اور ماہر کاریگروں سے یہ عمارت نقشہ

کے مطابق تیار کرائی۔ اب دونوں شخصوں کا بیان اگر عقل کی عدالت میں پیش کیا جاتے تو کیا عقل کا فیصلہ یہ نہ ہوگا کہ پہلے شخص کا بیان ایک مجنون کی بڑ ہے اور دوسرے شخص کا بیان معقول ہے۔ اسی طرح عمارت عالم کے متعلق مادہ پرستوں کا بیان پہلے شخص کی طرح مجنونانہ ہے اور مومن اور خدا پرست کا بیان حکیمانہ اور عاقلانہ ہے۔ اس لئے خدا کا وجود عمارت عالم کے لئے از روئے عقل انتہائی ضروری ہے اور خود یہ عمارت خدائی ذات، صفات اور کمالات کے ثبوت کی دلیل ہے۔

۹۔ **دلیل حیاتی** عالم میں زندگی اور حیات موجود ہے جو اس امر کی دلیل ہے کہ عالمی حیات کے لئے ایک سرچشمۂ حیات موجود ہے۔ جو حیّ حقیقی ہے اور وہ ذات رب العالمین ہے۔

۱۰۔ **دلیل ذکری** اللہ تعالٰے کے ذکر میں لذّت کاملہ انجذاب وانبساط و اصلاحِ قلب کے آثار موجود ہیں اور معدوم کے ذکر میں یہ آثار نہیں ہوتے لہٰذا معلوم ہوا کہ ذاتِ الٰہی موجود ہے۔

۱۱۔ **دلیل اطلاق** یہ قانون ہے کہ ہر مقید کے لئے مطلق کا وجود ضروری ہے کیونکہ تقیید و تحدید نام ہے ایک وسیع اور مطلق شئی سے ایک محدود چیز کو حاصل کرنا۔ مثلاً اگر زمین کے ایک ٹکڑے پر حد بندی لگائی جائے تو یہ دلیل ہے کہ ایک وسیع زمین موجود ہے کہ یہ محدود اس سے الگ کر دی گئی ہے۔ تو کائنات میں سے ہر چیز کا وجود محدود ہے جو زمان اور مکان اور حدود سے مقید ہے۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ ایک ایسا وجود اور ہستی ہے جو حدود اور قیود، مکان و زمان سے بالاتر اور وسیع ہے اور وہ ذات رب العالمین ہے۔

وجودِ باری اور قرآن مجید

قرآن کے نزدیک خدا کا اعتراف انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ علم الانسان کے ماہرین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ انسان جب فطری حالت میں تھا یعنی علوم و فنون و تہذیب کا وجود نہ تھا تو اُس نے اُس وقت خدا کی پرستش اختیار کی۔ الکلام میں مشہور محقق مکس مولر کی کتاب

میں یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ہمارے اسلاف نے خدا کے آگے اُس وقت سر جُھکایا جب وہ خدا کا نام بھی نہ رکھ سکے۔ جسمانی خدا یعنی بُت کی پرستش اس حالت کے بعد اس طرح پیدا ہوئی کہ اصل فطرتِ انسانی مثالی صورت کے پردے میں چھُپ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ جس زمانے سے دنیا کی تاریخ معلوم ہے دنیا کے ہر حصہ میں خدا کا اعتقاد موجود تھا۔ اثوری، مصری، کلدانی، یہود، اہلِ فنیشیہ سب کے سب خدا کے قائل تھے۔ پلوٹارک کہتا ہے، اگر تم دنیا پر نظر ڈالوگے تو بہت ایسے مقامات ملیں گے جہاں نہ قلعے ہیں نہ سیاست نہ علم نہ صناعت نہ حرفت نہ دولت لیکن ایسا کوئی مقام نہ ملے گا جہاں خدا موجود نہ ہو۔ والٹیر فرانس کا مشہور فاضل جو وحی و الہام کا منکر تھا کہتا ہے کہ زردشت، منوسولن، سقراط سب ایک سردار ایک منصف ایک خدا کی پرستش کرتے تھے۔
یہی فطرت ہے جس کو قرآن نے ان لفظوں میں بیان کیا۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ	جب خدا نے بنی آدم کی پیٹھ سے
مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ	اس کی نسل کو نکالا اور خود انہی کو
عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا	اس پر گواہ کیا کہ کیا میں تمہارا خدا نہیں؟
بَلٰي ڔ شَهِدْنَا ڔ (الاعراف آیۃ: ۱۷۲)	سب بول اُٹھے ہاں ہم گواہ ہیں۔

لیکن چونکہ خارجی اسباب و اثرات سے اکثر یہ فطری احساس دب جاتا ہے اس لئے قرآن نے جا بجا اس فطرت کو متنبہ کیا۔

اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ	کیا خدا کی نسبت بھی شک ہو سکتا ہے
وَالْاَرْضِ (القرآن)	جو آسمان و زمین کا موجد ہے۔

چونکہ خارجی اسباب سے بعض اوقات یہ فطری احساس اس قدر دب جاتا ہے کہ محض اشارہ تنبیہ کافی نہیں ہوتی اس لئے قرآن نے تجربی اور حسّی مقدمات کے ذریعہ خدا کے وجود پر استدلال کیا۔ انسان کو آغاز تمیز سے جن بدیہی اور حسّی مقدمات کا علم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کو مرتب و منتظم پاتا ہے تو اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ کسی دانشمند نے چیزوں

کو ترتیب دیا ہے اور بے ترتیب چیزوں کے متعلق اس کو خیال ہوتا ہے کہ آپ سے آپ یہ چیزیں اکٹھی ہو گئی ہوں۔ حافظ یا نظامی کے شعر کے الفاظ کسی معمولی آدمی کو دو وہ سو دفعہ اُلٹ پلٹ کرے گا لیکن اتفاقیہ طور پر کبھی یہ نہ ہوگا کہ حافظ و نظامی کا شعر نکل آتے حالانکہ وہی الفاظ وہی حروف ہیں صرف ذراسی ترتیب کا پھیر ہے پھر یہ کیونکر ممکن، کہ نظام عالم جو اِس قدر باقاعدہ مرتب اور موزوں ہے ــــ وہ خود بخود قائم ہو گیا۔ قرآن مجید نے خدا کے وجود پر اس طرح استدلال کیا ہے :-

۱۔ صنع اللہ الذی	یہ خدا کی کاریگری ہے جس نے ہر شے کو پختہ طور پر بنایا۔
۲۔ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ط فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ۔ (سورہ الملک: ۳)	خدا کی کاریگری میں تمہیں کہیں فرق نظر نہیں آئے گا۔ پھر دوبارہ دیکھو کہیں ذرا اثر دکھائی دیتی ہے ؟
۳۔ خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ط لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا۔	خدا نے ہر چیز بنائی پھر اس کا ایک اندازہ معین کیا۔ خدا کی بناوٹ میں ردّ و بدل نہیں ہو سکتی۔ خدا کے طریقے میں تم ردّ و بدل نہیں پا سکتے۔

ان آیتوں میں عالم کی نسبت تین اوصاف بیان کئے ہیں۔ ۱۔ کامل اور بے نقص ہے ۲۔ موزوں اور مرتب ہے۔ ۳۔ ایسے اصول و ضوابط کا پابند ہے جس کو کوئی توڑ نہیں سکتا۔ آج جبکہ تحقیقات کی انتہا ہو گئی اور کائنات کے سینکڑوں راز فاش ہو گئے۔ بڑے بڑے فلاسفر اور حکما، انتہائے غور و فکر کے بعد خدا کے ثبوت میں یہی استدلال پیش کرتے ہیں۔ ارسطو خدا اور اس کی توحید اور قیامت کے وجود کا قائل تھا۔ (دیکھو ملل نحل الشہرستانی جلد ۲ صفحہ ۳۹۸)

۱- ملین ایڈورڈ کہتا ہے انسان اس وقت سخت حیرت زدہ ہو جاتا ہے جب یہ دیکھتا ہے کہ ان مکرر اور ناطق مشاہدات کے ہوتے ہوئے ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ یہ تمام عجائبات صرف بخت و اتفاق کے نتائج ہیں۔ یہ فرضی احتمالات اور عقلی گمراہیاں جن کو لوگوں نے علم المحسوسات کا نام دیا ہے، علمِ حقیقی نے ان کو بالکل باطل کر دیا ہے۔ فزیکل سائنس جاننے والا کبھی اس پر اعتقاد نہیں لا سکتا۔

۲- ہربرٹ اسپنسر کہتا ہے۔ یہ اسرار جو روز بروز دقیق ہوتے جاتے ہیں جب ہم اُن پر زیادہ بحث کرتے ہیں تو یہ ضرور ماننا پڑتا ہے کہ انسان کے اوپر ایک ازلی و ابدی قوت ہے جس سے تمام اشیاء وجود میں آتی ہیں۔

۳- پروفیسر لینہ کہتا ہے۔ وہ خدائے اکبر جو ازلی ہے، جو تمام چیزوں کا جاننے والا ہے جو ہر چیز پر قادر ہے، اپنی عجیب و غریب کاریگریوں کے ذریعہ میرے سامنے اس طرح جلوہ گر ہے کہ میں مبہوت اور مدہوش ہو جاتا ہوں۔ (الکلام جلد ۲۔ صفحہ ۵۶، ۵۷)

توحید باری تعالےٰ

جن دلائل سے ہم کو خدا کا یقین حاصل ہوتا ہے ان دلائل سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خدا ایک ہی ہے۔ عالم اگرچہ ظاہر میں کثیر الاجزاء معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت وہ ایک واحد شے ہے۔ جیسے انسان کے ہاتھ، پاؤں، کان، آنکھ بہت سے اعضاء ہیں تاہم وہ شئ واحد ہے۔ اب اس کا پیدا کرنے والا اور چلانے والا ایک ہی ذات ہے دو نہیں چہ جائیکہ دو سے زائد ہوں کیونکہ جب ایک خدا سے نظام چل سکتا ہے تو دوسرے خدا کا وجود بیکار رہا اور اگر نہیں چل سکتا تو دونوں میں سے کوئی بھی خدا نہیں رہا کہ عجز اور خدائی متضاد ہے۔ اس کے علاوہ اگر دونوں مختلف نظام چلائے تو عالم درہم برہم ہو جائے گا اور اگر ہر ایک ہی نظام چلائے تو بھی عالم درہم برہم ہو جائے گا کیونکہ عالم کا ہر جزء ایک حقیقت رکھتا ہے

جس کی وجہ سے اوروں سے ممتاز ہے اور ایک وجود جس کی وجہ سے اس پر آثار مرتب ہوتے ہیں وجود اور ذات میں ایسی نسبت ہے جیسے ظرف اور مظروف میں مثلاً جوتا اور پاؤں۔ اب اگر ہر ایک خدا کسی شئی کو وجود دینے لگے تو ایک ذات میں دو وجود آجانے سے ذات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ جیسے ایک جوتے میں بجائے ایک قدم کے دو قدم پڑ جانے سے جوتے کا پھٹ جانا یقینی ہے تو دونوں کا ایک نظام پر متفق ہو جانے کی صورت میں عالم درہم برہم ہوگا اور اگر معطل رہے اور ایک کام کرے تو معطل خدا نہ رہے گا۔ اس کے علاوہ متفق ہونا وہاں ہوتا جہاں اختلاف میں ضرر کا اندیشہ ہو اور جب دونوں خدا ہوں گے تو نہ ان کو ضرر کا اندیشہ ہوگا نہ اتفاق کی حاجت ہوگی کیونکہ حاجت خدائی کے خلاف ہے۔ تو ہر ایک آزادانہ کامل تصرف کرے گا۔ اگر دونوں کا تصرف مخالف ہوگا جب بھی عالم درہم برہم ہوگا اور اگر موافق ہوگا تو بھی عالم تہس نہس ہوگا جیسے ایک بوری جس میں دو من غلہ آسکتا ہے اگر دو آدمی ہوں اور ہر ایک اس میں کامل دو من غلہ ٹھونسنا چاہے تو بوری پھٹ جائے گی۔ اسی دلیل کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۔ (انبیاء : ٢٢)

اگر آسمان اور زمین میں کئی خدا ہوتے، تو دونوں برباد ہو جاتے۔

یہی وجہ ہے کہ مطلق توحید دعویٰ کی حد تک تمام مذاہب میں پائی جاتی ہے۔ جن قوموں کو مشرک مانا جاتا ہے وہ بھی قادرِ مطلق ایک ذات کو مانتے ہیں۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۔ (لقمٰن : ٢٦)

اگر آپ مشرکوں سے پوچھیں کہ آسمان اور زمین کا خالق کون ہے تو ضرور کہیں گے کہ اللہ ہے۔

عیسائی تین خدا مانتے ہیں لیکن ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ تینوں ایک ہیں۔ یہ کتنا غلط ہو لیکن اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حقیقی تعدد کو وہ بھی گوارا نہیں کرتے جن کو ہم مشرک کہتے ہیں۔ صفات افعال اور عبادت میں باری تعالےٰ کے ساتھ انہوں نے اور چیزوں کو شریک کیا۔ اس لئے

توحید کامل سے وہ محروم ہوتے۔ تمام مذاہب میں اسلام کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اُس نے توحید باری کو شرک کے ہر قسم کے شائبوں سے پاک کیا۔

مذمّتِ شرک ۱۔ شرک قابلِ مغفرت نہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَاءُ۔ (النساء : ۱۱۶)۔

۲۔ شرک کرنے والوں پر جنّت حرام ہے۔ انہ من یشرك باللہ فقد حرم اللہ علیہ الجنۃ وماواہ النار۔

۳۔ شرک کرنے والوں کی تمام نیکیاں برباد ہیں۔ وَلَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْکَ وَاِلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکَ لَئِنْ اَشْرَکْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُکَ وَلَتَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ۔ (الزمر : ۶۵)

۴۔ مشرک کے لئے دعاء مغفرت جائز نہیں۔ مَا کَانَ لِلنَّبِیِّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ یَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِکِیْنَ وَلَوْ کَانُوْٓا اُولِیْ قُرْبٰی مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّھُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ۔ (التوبۃ : ۱۱۳)

اللہ تعالیٰ کی ذات اور خالقیتِ عالم میں اللہ تعالیٰ کے شریک نہ ہونے پر مشرکین بھی متفق ہیں۔ جیسے کہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ میں تصریح کی ہے۔ مشرکین نے صفاتی، افعالی اور عباداتی شرک کیا یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات اور فوق الاسباب افعال اور عبادت میں دوسری مقدس ہستیوں کو بھی شریک کیا۔ اسلام اور قرآن کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُس نے توحید باری کو ہر قسم کے شرک کے شائبہ سے پاک کیا، یہاں تک کہ مافوق الاسباب طریقے سے نفع و ضرر کا مرکز ایک ذات رب العالمین کو قرار دیا۔ قُلْ لَّآ اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا[1]۔ حاضر و ناظر ایک ہی ذاتِ خداوندی کو قرار دیا۔ وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ[2]۔ عالم الغیب ہونا صرف ذاتِ خداوندی سے مختص کیا۔ قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ[3]۔ حل مشکلات کے لئے پکارنا اس سے

---

[1] سورۃ الاعراف [2] سورۃ الحدید آیۃ : ۴ [3] النمل : آیۃ : ۶۵

وابستہ کیا۔ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا[۱] ۔عبادت ہر قسم کی اور ما فوق الاسباب استعانت کو بھی اللہ کی ذات سے مختص کیا۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ[۲] ۔یہاں تک کہ سجدۂ تعظیمی جو دیگر ادیان میں غیر اللہ کے لئے جائز تھا اس کو بھی اللہ سے مختص کیا۔ اَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰہِ[۳] نذر لغیر اللہ، قسم لغیر اسم اللہ، طواف لغیر بیت اللہ کو ممنوع قرار دیا۔گویا اس طرح شرک کے تمام دروازوں کو بند کر دیا۔حقیقت یہ ہے کہ خدا کے اقرار کا دل پر جو اخلاقی اثر پڑتا ہے وہ اسی توحیدِ کامل کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اطاعت، انقیاد، اخبات خشوع، استقلال، توکل، اخلاص کی حالت اسی وقت دل پر طاری ہو سکتی ہے جب یہ خیال اور اعتقاد ہو کہ ہماری تمام حاجتوں، تمام ضرورتوں، تمام امیدوں، تمام اغراض و مقاصد کا ایک ہی مرکز ہے۔اسی طرح آزادی، دلیری، بے نیازی کے اوصاف اسی توحیدِ کامل کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتے۔جو شخص ایک کے سوا اور کو بھی حاجت روا مانتا ہے اس کا سر ہر آستانہ پر جھک جانے کے لئے تیار رہتا ہے۔

نبوّت

نبوّت کا لغوی معنی اگر نبا بمعنی خبر سے ماخوذ ہو تو نبی بمعنی شرعی و عرفی اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دیتا ہے اور اگر نبوۃ بمعنی رفعۃ سے منقول ہو تو نبی تمام لوگوں سے رفیع اور بلند ہوتا ہے اور اگر نبی بمعنی طریق سے منقول ہو تو پیغمبر اور نبی بھی اللہ تک رسائی کا راستہ اور وسیلہ ہے۔پہلی صورت میں مہموز اللام اور اخیر کی دو صورتوں میں معتل اللام ہے۔نبی کی شرعی اور اصطلاحی تعریف شارح مواقف نے اشاعرہ سے یہ نقل کیا ہے۔

من قال له الله ارسلتك الى قوم او الى الناس جميعا۔	یعنی جس کو اللہ حکم دے کہ میں نے تمکو فلاں قوم کی طرف بھیجا ہے یا سب لوگوں کیطرف تو وہ نبی ہے

---

[۱] سورۃ الجن آیۃ: ۱۸ [۲] سورۃ الفاتحہ آیۃ: ۴ [۳] سورۃ الجن آیۃ: ۱۸

نبی کے پہلے دو لغوی معنی امام راغب نے بھی مفردات میں لکھے ہیں۔ نبی کی چند خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے نبی غیر نبی سے ممتاز ہوتا ہے۔

خصوصیاتِ نبوّت ۱۔ انتخابِ الٰہی یعنی عہدۂ نبوت کے لئے انسانوں میں سے کسی فرد کو منتخب کرنا اللہ کا کام ہے اور نبوت عہدۂ وہبی ہے کسبی نہیں اور چونکہ اللہ تعالٰے ظاہر و باطن، حال و مستقبل کا پورا علم رکھتا ہے لہٰذا جس کو وہ نبی کا منصب عطا کرتا ہے اُس میں اُس منصب کی کامل قابلیت اور استعداد کا ہونا ضروری ہے۔

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ   اللہ خوب جانتا ہے کہ عہدہ رسالت کس کو دینا چاہیئے

۲۔ نبی کے علوم وہبی ہوتے ہیں کسبی نہیں۔ وہ زمین کے کسی اُستاد سے تعلیم حاصل کیا ہوا نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ آسمانی علوم کا آسمانی اُستاد سے استفادہ کرتا ہے۔ اور زمینی سلسلۂ تعلیم کے لحاظ سے وہ اُمّی کہلاتے ہیں۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم کی پہلی جلد میں تفاوت مراتب عقل کے تحت بیان کیا کہ لوگوں کے عقلی مراتب مختلف ہیں۔ بعض بلید ہوتے ہیں جو تعلیم سے بھی علم حاصل نہیں کر سکتے اور بعض ذکی اور تیز فہم ہوتے ہیں جو تعلیم سے علم حاصل کر سکتے ہیں اور بعض وہ حضرات کہ بغیر تعلیمِ انسانی کے اپنے نورِ قلب سے علوم حاصل کرتے ہیں یہ انبیاء علیہم السلام ہیں۔

۳۔ حُسنِ صورت و سیرت۔ یعنی ظاہری خوبصورتی اور باطنی خوبصورتی یعنی اخلاق میں اوروں سے ممتاز ہوتے ہیں۔ بخاری وغیرہ میں ہے:۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم   یعنی حضور علیہ السلام حسنِ صورت اور اخلاق
احسن الناس خَلقا وخُلقا۔   میں سب لوگوں سے برتر تھے۔

۴۔ علمی اور عملی کمال یعنی نبی کا علم اور عمل دونوں کامل ہوتے ہیں۔ کمالِ علم یہ ہے کہ نبی کے علم میں کوئی غلطی نہیں ہوتی اور عملی کمال یہ ہے کہ نبی کا عمل کامل ہوتا ہے اور گناہ یا طاعتِ الٰہی کے دائرہ سے تجاوز ان کے عمل میں نہیں پایا جاتا۔ وہ ہر گناہ سے پاک اور معصوم ہوتے ہیں۔ وہ چونکہ اُمّت کے لئے نمونۂ عمل ہوتے ہیں۔ وَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ انسان بھی جب کبھی درزی

کو اچکن کا نمونہ دیتا ہے تو غلط نمونہ نہیں دیتا۔ تو اللہ جل جلالہٗ نے جب نبی کو نمونۂ عمل بنایا، اُس میں غلطی و گناہ کا امکان کیونکر ہو سکتا ہے۔

۵۔ نبی کی پانچویں خصوصیت تکمیل علمی و عملی ہے یعنی جو حضرات نبی پر ایمان لا کر اُس کے دائرۂ تربیت میں داخل ہو جاتے ہیں تو وہ علم اور عمل کے اعتبار سے کامل بن جاتے ہیں۔ نہ اُن کے علم میں نقص ہوتا ہے اور نہ عمل میں۔ ان کی شان علم و عمل میں تمام دیگر اشخاص سے ممتاز ہوتی ہے۔

۶۔ نبی کی چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی تعلیم اور عملی زندگی سے مصالح عامہ کی مقصدیت نمایاں ہو۔ فرد اور شخص سے زیادہ عمومی فائدہ اُن کے پیش نظر ہو۔

۷۔ نبی کی ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ نبی کی معاشی زندگی اور اخلاقی کردار، امارت اور فقر دونوں صورتوں میں یکساں ہوتی ہے۔ نبی کی پوشاک، خوراک، مسکن میں جو سادگی فقر کی حالت میں ہوتی ہے، بادشاہی، امارت اور حکومت حاصل ہونے پر بھی وہی حالت ہوتی ہے، اور جو تواضع، خاکساری بوقتِ فقر ہوتی ہے، سلطنت پر بھی گفتار و کردار میں وہی عجز و نیاز اور تواضع نمایاں ہوتی ہے۔ حضور علیہ السلام اور تمام انبیاء علیہم السلام کی تاریخ اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے۔ گویا انبیاء علیہم السلام کے ایثار کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ مفادِ عوام پر ذاتی مفاد کو قربان کرتے ہیں اور غلبہ اور سلطنت حاصل ہونے پر بھی ان کے عجز، نیاز اور شانِ عبدیت اور تواضع پر کسی قسم کا اثر نہیں پڑتا۔ اور انبیاء علیہم السلام کے قلب و روح کی خداداد پاکیزگی کسی بھی ماحول سے متاثر نہیں ہوتی تاکہ یہ معلوم ہو کہ عام انسانوں سے اُن کی فطرت مختلف ہے۔

۸۔ نبوت کی آٹھویں خصوصیت یہ ہے کہ نبی کی زندگی میں بناوٹ، تکلف، نمائش، علوِ ذات، نمود شخصیت کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور اس کا حُبّ و بُغض اپنی ذات کے لئے نہیں، بلکہ ذات رب العالمین کے لئے ہوتا ہے۔ وہ حقِ نفس کو معاف کرتا ہے لیکن حق اللہ کو معاف نہیں کرتا۔

۹۔ نبی اطاعتِ الٰہی کا عملی نمونہ ہوتا ہے اور خلوت، جلوت، گھر میں، گھر سے باہر، دوستوں اور دشمنوں میں، غصہ اور خوشی الغرض کسی حالت میں بھی رضاء الٰہی کی راہ سے سرمو تجاوز نہیں کرتا۔ مجلس احوال اور نفسانی کیفیات اس کی استقامت میں خلل انداز نہیں ہوتے گویا رضاء حق و اطاعت شرع اُس کی فطرت کا جزء ہوتے ہیں۔

۱۰۔ نبی کی دسویں خصوصیت یہ ہے کہ اُس کے دعویٔ نبوت کی تائید میں خوارق اور معجزات کا ظہور ہو۔ شرح مواقف میں معجزہ کے لئے سات شرطیں لکھی ہیں۔

۱: خدا کا فعل ہو۔ ۲: خارقِ عادت ہو۔ ۳: اس کا معارضہ نا ممکن ہو۔ ۴: مدعیٔ نبوت سے ظاہر ہو۔ ۵: دعویٰ کے موافق ہو۔ ۶: نبی کا مکذب نہ ہو۔ ۷: دعویٰ پر مقدم ہو۔ (طبع نول کشور ص ۶۶۵ تا ص ۶۶۷)

معجزہ کی اُصولی قسمیں دو ہیں۔ معجزہ معنویہ جو خواص کے لئے ہے اور معجزہ حسیہ جو عوام کے لئے ہے۔ حضور کا معجزہ معنویہ قرآن ہے اور حسیہ شق القمر، تکثیر طعام و میاہ و تکلم حیوانات و جمادات۔

معجزہ، کرامت اور سحر میں فرق معجزہ و کرامت دونوں فعلِ خداوندی ہیں۔ اول کا مظہر نبی اور دوم کا ولی ہے اور دونوں غیر اختیاری ہیں اور کسب اور اکتساب اور تعلیم و تعلم کو اس میں دخل نہیں۔ دونوں کا سبب محض ارادۂ الٰہیہ ہے۔ بخلاف سحر کے جس کا معنی ائمہ لغت اور مفسرین نے یہ بیان کیا ہے۔ مادق ماخذہ ولطف یعنی جو فعل و عمل مخفی اسباب پر مبنی ہو وہ سحر ہے۔ موجودہ بعض مصنوعات سائنس بھی سحر کی تعریف میں داخل ہو سکتے ہیں جو کہ انسانی فعل ہے انسان کے اختیار میں ہے۔ تعلیم و تعلم اور کسب و اکتساب اور مشق اور تجربہ سے حاصل ہو سکتے ہیں جو شخص بھی حاصل کرنا چاہے۔ ان تینوں کے علاوہ امور عادۃ ہیں جن کے اسباب جلی اور ظاہر ہوتے ہیں جیسے عام صنائع و حرف کہ عام لوگ ان کے اسباب کو جانتے ہیں۔ اگر کسی متنبی سے کچھ خوارق کا ظہور ہو تو وہ معجزات نہیں بلکہ سحر و استدراج

میں داخل ہیں جن کے اسباب مخفیہ موجود ہوتے ہیں خواہ مادی ہوں یا غیر مادی، جن کو تعلیمیافتہ اور مشاق لوگ استعمال میں لاتے ہیں۔ عبداللہ بن المقنع یا زردشت سے اگر کچھ خوارق صادر ہوئے ہوں تو وہ اسی قسم میں داخل ہیں جیسے شیخ الاشراق اور سکاکی سے بلا دعوئ نبوت ایسے امور ظہور میں آئے ہیں اور تاریخ میں موجود ہیں یا ابوالطیب المتنبی و دیگر متنبیوں سے ایسے افعال کا ظہور ہوا ہے یہ سب سحر واستدراج کی مشقی و تجرباتی اور تعلیمی امور ہیں مثلاً شیخ الاشراق کا گڈریے کے ہاتھ ڈالنے سے ہاتھ کا مونڈھے سے اُکھڑنا اور گڈریے کے جانے کے بعد پھر مل جانا جو درحقیقت ہاتھ نہیں رومال تھا۔ سکاکی کا بغداد کی آگ بند کرنا اور کسی چولہے کا روشن نہ ہونا طاش کبری زادہ روحی سے منقول ہے (دیکھو مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت گیلانی جلد ۱ صفحہ ۱۶۲ حاشیہ) ابن سینا نے آخر اشارات کے ایک باب میں اگرچہ خوارق کے طبعی اسباب بھی بیان کئے اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے تفہیمات میں انما المعجزات والکرامات امور اسبابیہ غلب علیہا السبوغ فباینت سائر الاسبابیات کہہ کر ان خوارق کو ممتاز اسبابیات کا درجہ دیا ہے لیکن ان کا مقصد خوارق کو فہم کے قریب لانا ہے اور یہ مقصد نہیں کہ ان کا درجہ عام اسبابیات کی طرح کسبی اور مشقی ہے۔

حقیقتِ نبوّت ۱۔ حقیقتِ نبوت تو یہ اللہ ہی جانتا ہے یا خود نبی لیکن اس کی تصویر کو ذہن میں اتارنے کے لئے امام رازی نے مطالب عالیہ میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان میں دو قوتیں ہیں۔ ایک خیر و شر معلوم کرنے کی اور دوم خیر کے مطابق عمل کرنے اور شر سے بچنے کی۔ پہلی قوت کا نام قوۃِ نظری ہے اور دوم کا نام قوۃ عملی۔ ان دونوں قوتوں کے لحاظ سے انسان کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ ایک وہ لوگ جو ان اوصاف میں ناقص ہیں۔
۲۔ خود کامل ہیں لیکن ناقصوں کی تکمیل نہیں کر سکتے۔
۳۔ خود کامل ہیں اور ناقصوں کو کامل بنا سکتے ہیں۔

کمال کے پھر مختلف درجات ہیں۔ اس کی آخری حد یہ ہے کہ قوتِ نظری اس قدر کامل ہو کہ جس کا اس کو علم ہو وہ بالکل ٹھیک ہو اور اس میں غلطی کا امکان نہ ہو اور قوت عملی کے کمال کی آخری حد یہ ہے کہ اس کو ایسا قوی ملکہ حاصل ہو کہ اس سے خود بخود اچھے افعال صادر ہوں اور برائی کے صدور کا امکان نہ ہو۔ جس کو نظری و عملی کمال کے یہ انتہائی درجے حاصل ہوں وہ ہی نبی اور پیغمبر ہے۔

۲۔ امام غزالی معارج القدس اور المنقذ من الضلال میں نبوت کو قریب الفہم کرنے کے لئے جو تقریر کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان پیدائش کے وقت جاہل ہوتا ہے سب سے پہلے اس میں لمس کی قوت پیدا ہوتی ہے جس سے وہ گرم، سرد، سخت اور نرم کو پہچان لیتا ہے۔ پھر اس میں حاسہ، باصرہ پیدا ہوتا ہے جس سے وہ اور مقدار کو پہچان لیتا ہے۔ پھر سننے اور چکھنے کی قوت پیدا ہوتی ہے جس سے وہ آوازوں اور مزوں کو پہچان لیتا ہے۔ اس پر محسوسات کی حد ختم ہو جاتی ہے۔ پھر ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، اب اس کو تمیز دی جاتی ہے جس سے وہ ان چیزوں کا علم حاصل کرتا ہے جو حواس کی دسترس سے باہر ہیں یہ دور ساتویں برس شروع ہوتا ہے اور اس دور میں اس کو اقارب و اجانب اور جو چیزیں کھانے پینے کے قابل یا ناقابل ہوں وہ معلوم ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد عقل کا زمانہ آتا ہے جس سے انسان کو ممکن اور محال اور درست اور نادرست کا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ اب اس سے بڑھ کر ایک درجہ آگے ہے اور جس طرح حواس عقل کے مدرکات کے لئے بیکار ہیں اس طرح اس درجہ کے مدرکات اور معلومات کے لئے عقل بیکار ہے۔ اسی درجے کا نام نبوت ہے جس کی وجہ سے وحی کی روشنی میں وہ علوم اور ادراکات حاصل ہو جاتے ہیں جن کے ادراک سے عقل عاجز ہے۔

۳۔ اثبات نبوت کے لئے امام غزالی کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ یہ امر ظاہر ہے کہ تمام افعال قابل عمل نہیں، اور نہ سب قابلِ ترک ہیں بلکہ بعض قابلِ عمل اور بعض قابلِ ترک ہیں۔ اب

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قابلِ عمل اور قابلِ ترک کی تمیز ہر شخص کر سکتا ہے یا کوئی نہیں کر سکتا، یا بعض کر سکتے ہیں اور بعض نہیں۔ پہلے دونوں احتمال بداہتہً باطل ہیں اس لئے صرف تیسرا احتمال باقی رہا یعنی بعض انسان ایسے ہیں جو ان حدود کو متعین کر سکتے ہیں کہ فلاں اعمال عمل کے قابل ہیں اور فلاں نہیں۔ یہی حضرات پیغمبر اور صاحبِ شریعت ہیں۔

۴۔ احقر کے نزدیک بعض لطیف اشیاء مثلاً ایمان، کفر، طاعت و معصیت کی تاثیرات ماوراء عقول ہیں جیسے معقولات ماوراء حواس ہیں لہٰذا ان کی تاثیرات کا علم عقل کے ذریعہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان اشیاء کی تاثیرات کا علم بیحد ضروری ہے کیونکہ کثیف اشیاء کا نفع و ضرر مثلاً تریاق و زہر معمولی ہے لیکن لطیف اشیاء روح سے تعلق کی وجہ سے قوی الاثر ہیں۔ مادیات میں بھی جو چیز لطیف ہے مثلاً سٹیم وہ قوی الاثر ہے جس سے ریل گاڑی دوڑتی ہے اس لئے انسانی فلاح کے لئے ان اشیاء کی معرفتِ نفع و ضرر کا علم صرف ذاتِ رب العالمین سے جو لطیف و خبیر ہے ممکن ہے لیکن وہ ذات انتہائی مشرف و عظیم ہے اور انسان انتہائی پست و ذلیل ہے لہٰذا دونوں میں تباین اور بُعد کامل ہے لہٰذا ایسے واسطے کی ضرورت ہے جو انسان سے بھی بعید نہ ہو اور خدا سے بھی مناسبت رکھتا ہو تاکہ اس مناسبت کی وجہ سے اس کو فیضِ الٰہی پہنچائے ایسے واسطے کا نام نبوّت ہے اور یہ گروہ انبیاء علیہم السلام کے مقدس نام سے موسوم ہے مثلاً پانی اور آگ میں انتہائی بعد اور مباینت ہے لہٰذا آگ کے فیض یعنی گرمی کو پانی میں براہ راست منتقل نہیں کیا جا سکتا بلکہ انتقال فیض کے لئے ایک درمیانی چیز کی ضرورت ہوتی ہے جو آگ کی طرح گرم و لطیف بھی نہ ہو اور پانی کی طرح سرد و سیال بھی نہ ہو وہ دیگچی ہے جس کے ذریعہ پانی کو چولہے پر رکھ کر آگ کی گرمی پانی میں منتقل ہو جاتی ہے۔ یہی حال گرمیٔ محبتِ الٰہیہ و علومِ نبوّت کی ہے جو نبی کے ذریعہ اُمّت اور عام انسانوں کو منتقل کی جاتی ہے۔ نبی کی ذات روحانیت اور ملکیت کے اعتبار سے اللہ سے مناسبت رکھتی ہے اور بشریت اور انسانیت کے اعتبار سے انسانوں سے مناسبت رکھتی ہے لہٰذا اُس

کو اپنے مفیض یعنی اللہ اور مستفیض انسان دونوں سے مناسبت ہے۔

۵۔ شاہ ولی اللہ نور اللہ مرقدہ نے حجۃ اللہ میں اثباتِ نبوت پر جو کلام کیا ہے، اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ نباتات میں سے ہر نوع کے جُدا خواص ہیں۔ اسی طرح حیوانات کے ہر نوع کے بھی جُدا خواص ہیں۔ یہ سب خواص اُن کے صور نوعیہ کا فطری تقاضا ہے۔ حیوانات کو اُن کے صور نوعیہ کے تحت، اُن کی زندگی کے لئے جو علوم عطا ہوئے ہیں اُن کے اکثر وہبی اور الہامی ہیں۔ انسان کو ـــ جو بدن و رُوح کا مجموعہ ہے ـــ بدنی ضروریات کے لئے فطری اور طبعی علوم کے علاوہ ایک دوسری قسم کا ادراک بھی دیا گیا ہے جو علم اکتسابی اور نظری ہے۔ جو تجربہ، غور و فکر، ترتیب مقدمات سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی کے ذریعہ انسان تجارت، صنعت، حرفت اور ہر قسم کے علوم و فنون حاصل کرتا ہے لیکن یہ تمام علوم انسان کی جسمانی حالت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے سوا انسان کو ایک اور قسم کا ادراک بھی دیا گیا ہے، جو اُس کی روحانیت کا فطری خاصہ ہے اور جس سے قوتِ ملکیہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے اسی قوت کا اثر ہے۔ وہ کائنات میں غور کر کے یہ سوچتا ہے کہ یہ تمام کارخانہ کیوں قائم ہو گیا اور خود مجھ کو کس نے پیدا کیا، کون روزی دیتا ہے اور کس لئے پیدا کیا۔ ان سوالات کے جواب میں وہ ایک قوتِ اعظم کا قائل ہو جاتا ہے اور اس کے آگے خضوع، خشوع، اخبات اور انقیاد کے آداب بجا لاتا ہے لیکن ان امور کی تکمیل ایک الٰہی قانون پر موقوف ہے جو اس کی رضاء کے حدود کو متعین کرے اس لئے وہ مدتوں کے بعد ایک شخص ـــ جو اُس کا منظورِ نظر ہوتا ہے ـــ پیدا کرتا ہے جو اس فطری تقاضا، قانون اطاعت کے ظہور کا سبب بنتا ہے وہ نبی ہوتا ہے۔ اصل مضمون پر ہم نے کچھ تشریحی اضافے کئے تاکہ عام فہم بن سکے۔

۶۔ دلیل قانونی۔ اللہ جل جلالہ کی تین صفات سب اقوام و ملل میں تسلیم شدہ ہیں۔

۱۔ حاکمیت ۲۔ قدرت ۳۔ حکمت

تینوں صفات کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی رعیت اور مخلوقِ انسانی کو بلا قانون نہ چھوڑے۔

حکومت بلا قانون عیب ہے۔ اسی طرح قدرت اور حکمت بھی لاقانونیت کے خلاف ہے لہذا ضروری ہوا کہ حاکمِ اعلیٰ یا ذات رب العالمین کا قانون موجود ہو اور یہ ضروری ہے کہ انسان کو اس قانون سے مطلع بھی کیا جائے۔ کیونکہ وجود قانون بلا علم و اطلاع عبث ہے۔ اب اطلاع قانونِ الٰہی کی دو صورتیں ہیں۔ عمومی اور انتخابی و توسلی۔ عمومی یہ کہ حاکمِ اعلیٰ یعنی اللہ رب العالمین فرداً فرداً ہر شخص کو ہر زمانہ اور ہر ملک میں اطلاع دیتا رہے۔ یہ شکل شانِ خداوند اور اس کی عظمت کے خلاف ہے جبکہ ایک حقیر انسانی امیر یا بادشاہ ایسا نہیں کرتا کہ گھر گھر جا کر اطلاع دیتا ہے تو احکم الحاکمین ایسا کیسے کر سکتا ہے لہذا دوسری صورت متعین ہوتی کہ اللہ بالواسطہ اطلاع دے یعنی انسانی افراد میں کسی برگزیدہ ہستی کو چُن کر اُس کے ذریعہ قانونِ خداوندی سے لوگوں کو اطلاع دے تاکہ لوگوں کو دین و دنیا کی سعادت نصیب ہو اور عدل و انصاف قائم ہو سکے اور نتائجِ اعمالِ خیر و شر سے ان کو واقفیت ہو جائے۔ ایسی منتخب اور نمائندہ حاکمِ اعلیٰ ہستی کا نام شرع کی اصطلاح میں نبی اور رسول ہے۔

۷۔ دلیل حُبّی۔ انسان کی فطرت میں جس طرح جسمانی حیثیت سے ضروریات جسمانی، کھانے، پینے، نکاح کرنے کی محبت داخل ہے اسی طرح انسان کی روحانی فطرت میں اللہ تعالیٰ کی محبت داخل ہے، اور تمام اقوام وملل میں عبادت گاہوں کا وجود اسی فطری محبت کے صحیح یا غلط مظاہر ہیں۔ صحیح عبادت گاہ دینِ حق والوں کی ہے اور غلط عبادت گاہ دینِ باطل والوں کی ہے لیکن ان دونوں صورتوں سے تمام قوموں میں اللہ سے محبت کا ثبوت مل جاتا ہے۔ جب اللہ محبوبِ اقوام و تمام افراد انسانی قرار پایا، تو اس فطری جذبۂ محبت کا تقاضا تحصیلِ رضاء الٰہی ہے کیونکہ ہر محب کو محبوب کی رضامندی فطرۃً محبوب ہوتی ہے اور رضاء ایک مخفی چیز ہے جس کا اظہار کلام کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی انسان کو خوش کرنا چاہیں تو اس کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ کلام کے ذریعہ اپنی خوشی اور ناخوشی کی چیزیں بتلا دیں اور آپ اس پر عمل کریں۔ اسی طرح خداوند تعالےٰ جو ورار الورا۔ اور مخلوق سے ہر چیز میں ممتاز ہے، اس کی خوشی و ناخوشی قیاس سے متعین

نہیں کی جاسکتی جب تک وہ خود بذریعہ کلام خود اپنی مرضیات اور لامرضیات کے حدود متعین نہ کردے جس کو شریعت کی زبان میں عقائد حقہ و باطلہ، اخلاق محمودہ و مذمومہ، جائز و ناجائز سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہی کلام اللہ تعالےٰ جس کو وہ معتمد اور مقدس ہستی پر ظاہر کرتا ہے اس کو نبی اور رسول کہا جاتا ہے۔ جس کا وجود اور جس کی تعلیمات و ہدایات انسان کی محبت فطریہ کے مظاہر ہیں۔

۸۔ دلیل عدلی۔ افرادِ انسان بقار ذات کے لئے تین امور کے محتاج ہیں۔ ۱: کھانا ۲: پینا ۳: مکان، اور نوعی بقار کے لئے ان تین کے علاوہ نکاح اور بیوی کا محتاج۔ یہ چاروں ضروریات تمام افراد انسان کے مطلوب ہیں۔ جب ہر انسان قوۃ تزوعیہ یا شہویہ کے ذریعے ان ضروریات کو طلب کرے گا تو ضروری ہے کہ ان میں باہمی کشمکش اور منازعت پیدا ہو اور ہر ایک قوۃ غضبیہ کے ذریعے دوسرے کی مدافعت پر آمادہ ہو جائے لہذا ضروری ہوا کہ ان ضروریات حیات کے منازعات اور خصومات ختم کرنے کے لئے ایک قانون عدل موجود ہو جو ہر ایک کے حقوق کا تحفظ کرے وہ قانون یا انسان بنائے گا خواہ فرد ہو جماعت (پارلیمنٹ) یا خدا بنائیگا پہلی صورت میں مقصدِ عدل کی تکمیل نہیں ہوسکتی کیونکہ قانون عدل کی تدوین کے لئے امورِ ذیل ضروری ہیں۔

۱۔ علمِ کامل اور حکمتِ کاملہ تاکہ خیر و شر کے حدود متعین کرنے میں غلطی واقع نہ ہو۔

۲۔ رحمت و شفقت تاکہ بغض و عناد کی وجہ سے وضع قانون میں بے انصافی نہ ہو۔

۳۔ یکسانیت اور غیر جانب داری تاکہ وضع قانون میں اپنے ہم قوم اور ہم وطن افراد کی رعایت کرکے دوسروں کا حق تلف نہ کرے۔

انسان ان تینوں صفات سے خالی ہیں نہ ان کا علم تامہ ہے نہ شفقت اور نہ غیر جانبداری کیونکہ وہ ضرور کسی قوم کا فرد ہوگا اور کسی وطن کو منسوب ہوگا لہذا یقیناً ان کی طرفداری کرے گا لیکن خدا کی ذات میں یہ تینوں صفات جمع ہیں۔ نہ اس کے علمِ تامہ میں کسی غلطی کا امکان ہے،

اور نہ اس کی رحمت و شفقت میں اپنے بندوں پر شک و شُبہہ کی گنجائش ہے۔ نیز تمام اقوام اور تمام ملکوں کے رہنے والے اس کے یکساں بندے ہیں اور سب کو اللہ سے یکساں طور پر نسبت عبدیت و مخلوقیت ہے۔ اللہ کسی قوم کا فرد یا کسی وطن کا باشندہ نہیں کہ اس کے حق میں جانب داری برتے، بلکہ اقوام و اوطان اس کے یکساں مخلوق ہیں۔ لہٰذا قانون اُسی ذات کا حق ہے۔ اب اس قانون کو وہ جس اپنے معتمد اور منتخب نمائندہ کے ذریعے بھیجے گا وہ اللہ کا نبی اور رسول کہلاتا ہے۔

۹۔ دلیل توسطی: تمام مذاہب اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کو خداشناسی اور خداپرستی کے لئے خدا کی رہنمائی کی ضرورت ہے لیکن عام انسان اور خدا میں بلحاظ مراتب بے حد بُعد واقع ہے۔ عام انسان انتہائی پست اور خالق عالم انتہائی بلند ہے۔ ایسی حالت میں یہ ضروری ہے کہ انسانوں میں سے چند برگزیدہ ہستیوں کو بطور واسطۂ فیض انتخاب کیا جائے تاکہ وہ اللہ جل جلالہ سے فیض حاصل کر کے عام انسانوں کو پہنچا دے۔ یہ منتخب ہستیاں جسمانی لحاظ سے انسان اور بشر ہو کر اُن سے مناسبت رکھتی ہوں اور رُوحانی بلندی اور پاکیزگی کے لحاظ سے خدائے فیاض سے مناسبت رکھتی ہوں۔ وہ درحقیقت وسائط فیضانِ الٰہی ہوں، جن کے توسط سے عرفان الٰہی کا فیض خالقِ کائنات کی طرف سے انسان اور اولادِ آدم کو پہنچتا ہو۔ مثلاً ہم اگر چاہیں کہ آگ کا فیض یعنی گرمی پانی کو پہنچا دیں اور اس میں گرمی پہنچ کر چا، یا سالن کی کارآمد شکل اختیار کرے تو چونکہ پانی اور آگ میں مناسبت مفقود ہے اور گرمی اور سردی، خشکی و تری کے اعتبار سے دونوں میں بُعد اور دوری ہے لہٰذا ہمیں ایک ایسے واسطے کو تلاش کرنا پڑتا ہے جو آگ اور پانی کے درمیان انتقالِ فیض کے لئے ایک واسطہ کا کام دے، اور وہ دیگچی ہے جس میں پانی ڈال کر آگ پر اس کو رکھا جاتا ہے، اس کو دونوں سے مناسبت ہے یا بقول شاہ ولی اللہ نور اللہ مرقدہٗ روح انسانی جو کہ لطیفۂ ربانی ہے وہ غایت لطافت میں ہے اور بدن انسانی کثیف ہے لہٰذا روح طبی یعنی وہ بھاپ جو خون سے پیدا

ہوکر بدنِ انسانی میں پھیلتی ہے اس کو قدرت نے واسطہ بنایا کہ روح انسانی روح طبی سے براہ راست متعلق ہوکر بدنِ انسانی کو اپنا فیض پہنچادے اور اسی طرح اعضاء انسانیہ ، روحِ انسانی سے بواسطہ روح طبی مستفید ہو سکے۔ اسی طرح خدا اور اس کے بندوں میں انبیاء علیہم السلام کے توسط کو سمجھو۔ رشد و ہدایت کی یہی شکل اللہ کی عظمت کی شایانِ شان ہے اور اللہ تعالیٰ کا تجسّم بشکل مسیح علیہ السلام جیسے نصاریٰ کا خیال ہے یا بشکل رام لشن مہادیو جیسے ہندوؤں کا خیال ہے ، غلط اور خلافِ فطرت ہے۔

اولاً تو خدائے لامحدود کا محدود انسان میں متشکل ہونا خلافِ عقل ہے۔ انسانی شکل میں خدا کا تشکل خدا کی خدائی کو قائم نہیں رہنے دیتا اور خدا پھر ان تمام حاجات اور لوازماتِ بشریت سے ملوث ہو جاتا ہے جو خواصِ بشریت ہیں۔ سوم اس صورت میں ہادی خود خدا بنا گو انسانی صورت میں ہی۔ لہٰذا وہ جو فعل و عمل کرے گا وہ خدائی عمل سمجھا جائے گا جو انسانوں کے لئے نمونہ عمل نہیں بن سکتا۔ انسانوں کے لئے انسان کا عمل نمونہ بن سکتا ہے کیونکہ ایسی صورت میں انسان کہہ سکتا کہ ہم ہادی کی چال پر چلنے سے عاجز ہیں کیونکہ وہ خدا ہے اور ہم انسان لہٰذا ہم ویسا نہیں بن سکتے۔ چہارم یہ کہ خدا کا انسانی لباس میں آنا غیر مفید بھی ہے کیونکہ جس شکل میں مثلاً مسیح علیہ السلام یا نظریہ اوتار کے تحت رام چندر میں وہ آیا تو اسی شخصیت سے براہِ راست خدا کا تعلق رہا باقی انسانوں سے بالواسطہ۔ کیونکہ ہر ہر آدمی میں الوہیت کا متشکل ہونا تو کوئی بھی نہیں مانتا۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ خدا دیگر انسانوں کی راہ نمائی کے لئے انسانی تشکل کی ذلت اٹھا کر خود واسطۂ فیض بنے اس سے یہ زیادہ معقول ہے کہ کسی منتخب انسان کو واسطۂ فیض بنائے تاکہ اس کا عمل انسان ہونے کی وجہ سے اوروں کے لئے نمونۂ عمل ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیوی نظام میں انسانی بادشاہ خود در در نہیں پھرتا اور نہ کسی کے بھیس میں نمودار ہوتا ہے بلکہ احکامِ شاہی کے لئے اپنا نمائندہ منتخب کرتا ہے۔ اسلام نے نبوّت کا جو تصور پیش کیا ہے وہ سب سے زیادہ معقول ہے اور فطرتِ سلیمہ اور عالمی روش کے عین مطابق ہے۔ پنجم اگر

تجسم کا معنیٰ ظہور لیا جائے بایں معنیٰ کہ نصاریٰ کے نزدیک حضرت مسیح علیہ السلام اور ہندوؤں کے نزدیک رام چندر وغیرہ مظہر خدا ہے تو مظہریت ان حضرات میں مخصوص نہیں؛ تمام انسان بلکہ تمام مخلوقات علوی و سفلی جلوہ گاہ ظہورِ عشق ہے۔

۱۰۔ دلیلِ تقدیسی۔ احکامِ خداوندی کے لئے جاننا، ماننا اور کرنا تینوں ضروری ہیں۔ جاننے کے لیے معلّم، ماننے کے لئے تقدّس اور کرنے کے لئے مقدّس نمونے کا وجود ضروری ہے تاکہ تعلیم، تسلیم اور تعمیل کے ذریعہ دینِ الٰہی باقی رہ سکے۔ ورنہ عدمِ تسلسل کی وجہ سے دین کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا اور دوام اور استمرارِ دین کے لئے اس کا ارتباط ایک ایسی محسوس شخصیت کے ساتھ ضروری ہے جس کی عظمت، تقدّس، محبوبیت، قلوب میں اس قدر مستحکم ہو جو کبھی زائل نہ ہو اور ایسی شخصیت نبی کی شخصیت ہو سکتی۔ اس لئے نبی کا تصوّر بقاء دین کے لئے ضروری ہے تاکہ اس کی محبت اور تقدّس کا تسلسل شمعِ دین کی تابانی کے لئے تیل کا کام دے سکے۔

ختمِ نبوّت

ختمِ نبوّت کا مسئلہ اسلامی تاریخ کے کسی دور میں مشکوک و مشتبہ نہیں رہا اور نہ اُس پر بحث کی ضرورت سمجھی گئی لیکن برصغیر پاک و ہند میں انگریزی حکومت نے اپنے مفاد اور تاریخی اسلام دشمنی کی تکمیل کے لئے اسلام کے اس مرکزی عقیدہ پر ضرب لگانا ضروری سمجھا تاکہ مسلمانوں کی وحدت کو ختم کیا جائے۔ اس سازش کی تکمیل کے لئے انگریزوں کو پنجاب کے ضلع گورداسپور سے ایک ایسا شخص ہاتھ آیا جو اس مقصد کی تکمیل کے لئے موزوں تھا۔ اُس نے انگریزوں کی حمایت کے تحت اپنی اُمت بنائی اور نئی نبوّت کی بُنیاد ڈالی، اور بہت سی کتابیں لکھیں۔ ان کتابوں کے بنیادی مقصد تین ہیں۔

۱۔ اپنی شخصیت اور دعاوی پر زور دینا۔

۲۔ تحریفاتِ قرآن کو معارف بتلانا۔
۳۔ مسلمانوں کی دشمنی اور انگریزوں کی دوستی پر زور صرف کرنا۔
یہی اس کی ساری کارروائی کا خلاصہ ہے۔ بقول اقبال مرحوم ؏
سلطنتِ اغیار را رحمت شمرد — رقصہائے گردِ کلیسا کرد و مرد

اس لئے ناواقف مسلمانوں کے ایمان بچانے کے لئے ضروری ہوا کہ ختمِ نبوت پر کچھ عرض کریں۔ اسلام کو ایک عمارت سمجھو اور اہم عمارت کے تین نقشے ہوتے ہیں۔ جن کو انجینئر مرتب کرتا ہے۔

۱۔ ذہنی وفکری نقشہ ۲۔ تحریری وکتابی نقشہ ۳۔ خارجی نقشہ

اسلام عقائد اخلاق و عبادات کی ایک عمارت تھی جس کا پورا نقشہ علمِ الٰہی میں منضبط تھا۔ پھر اس نقشہ کو کتاب و سنت میں منضبط کیا گیا۔ جو عمارت اسلام کی گویا تحریری شکل تھی۔ پھر مسلمانوں کا تقریباً چودہ سو سال کا مسلسل عمل اس نقشہ اور عمارتِ اسلام کا خارجی وجود تھا۔ یہ تینوں وجود باہمی متفق ہوتے آئے ہیں۔ اللہ کے علم میں اسلام کی جو حقیقت تھی وہ ہی قرآن و حدیث میں نمودار ہوئی اور قرآن و حدیث میں اسلام کی جو حقیقت تھی وہی مسلمانوں کے ذہن و فکر میں متواتر نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی گئی۔ اسلام کے بنیادی اُمور میں مسلمانوں نے اختلاف نہیں کیا اگرچہ دیگر اُمور میں اختلاف رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں بہت فرقے پیدا ہوئے لیکن آج تک اُنہوں نے ختمِ نبوت کی بنیادی حقیقت میں کسی قسم کا اختلاف نہیں کیا۔ البتہ اسلام اور اسلام کے سرچشموں یعنی کتاب و سُنت سے الگ ہو کر انکار کیا جا سکتا تھا اور کیا گیا۔ اب ہم اس مسئلہ پر دو پہلوؤں سے بحث کریں گے۔ ۱: نقل۔ ۲: عقل

نقل میں تین اُمور زیر بحث آئیں گے۔ ۱: کتاب یعنی قرآن اور ختمِ نبوت۔
۲۔ حدیث اور ختمِ نبوت۔ ۳۔ اجماع اور ختمِ نبوت۔

اس کے بعد ختمِ نبوّت کے عقلی پہلو کو بیان کریں گے۔

۱۔ قرآن اور ختمِ نبوّت قرآن حکیم کی ایک سَو سے زائد آیات میں مسئلہ ختمِ نبوت بیان کیا گیا ہے۔ ہم نظر بہ اختصار چند آیات کا انتخاب کرتے ہیں۔ پہلی آیت ختم نبوت ہے جو سورۂ احزاب میں ہے۔ مَاکَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ط وَکَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا۔ یہ آیت بالخصوص ختمِ نبوّت پر دال ہے۔ ترجمہ یہ ہے۔ محمدؐ باپ نہیں کسی کا تمہارے مردوں میں سے لیکن رسُول ہے اللہ کا اور مُہر سب نبیوں پر۔ یعنی آپ کی تشریف آوری سے نبیوں کے سلسلے پر مُہر لگ گئی۔ اب کسی کو نبوّت نہیں دی جائے گی۔ بس جن کو ملنی تھی مل چکی۔ اِس لئے آپ کی نبوّت کا دور سب نبیوں کے بعد رکھا جو قیامت تک چلتا رہے گا۔ حضرت مسیح علیہ السّلام بھی آخری زمانے میں بحیثیت آپ کے ایک اُمّتی کے آئیں گے جیسے تمام انبیاء اپنے اپنے مقام پر موجود ہیں مگر شش جہت میں عمل صرف نبوّتِ محمّدیہ کا جاری و ساری ہے اور اللہ سب چیزوں کو جاننے والا ہے یعنی یہ بھی جانتا ہے کہ زمانۂ ختمِ نبوّت اور محلِ ختمِ نبوت کونسا ہے۔ خاتِم تاء کے کسرہ کے ساتھ اکثر قراء کی قراءت ہے اور فتح تاء کے ساتھ حسن و عاصم کی قراءت ہے۔ پہلی قراءت کے بموجب خاتم النبیین کا معنی سب نبیوں کو ختم کرنے والا اور فتح والی قراءت کا معنی سب نبیوں پر مُہر۔ دونوں قراءتوں کا مطلب ایک ہے وہ یہ کہ آپؐ آخری نبی ہیں اور آپ کے بعد عطاءِ نبوّت کا دروازہ بند ہے۔ کیونکہ مُہر کا معنی بندشِ نبوّت بیان کرنے کا ایک بلیغ پیرایہ ہے جس پر خود قرآن، سنت، لُغتِ عربیہ متفق ہیں۔ قرآن نے اُن کافروں کے متعلق جن کے نصیب میں ایمان نہیں تھا، اُن کے حق میں بندشِ ایمان کو بلفظ مہر بیان کیا۔ فرمایا:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْہِمْ	یقیناً کچھ خاص لوگ ایسے کافر ہیں کہ خواہ تو
ءَاَنْذَرْتَہُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْہُمْ	ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں

لَا يُؤْمِنُوْنَ ٥ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ط — لائیں گے۔ کیونکہ مُہر لگ چکی ہے اُن کے دِلوں اور کانوں پر۔ (البقرہ : ۶-۷)

اگر مُہر کی تعبیر سے یہاں ایمان کا دروازہ بند ہوا تو آیت خاتم النبیین میں نبوت کا دروازہ بند ہونا ضروری ہے۔ صاحبِ قرآن نے خود آیت کی تفسیر کی ہے۔ مسلم میں ابوہریرۃ اور ابوداؤد و ترمذی میں ثوبان سے مرفوعاً روایت ہے کہ قیامت سے قبل دجالون کذابون نبوت کا دعویٰ کریں گے وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ۔ حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کسی کو نبوت نہیں مِل سکتی۔ یہی الفاظ حذیفہ سے طبرانی واحمد نے مرفوعاً نقل کئے ہیں۔ بخاری و مسلم میں بروایۃ ابوہریرۃ نبوت کو ایک ایسے گھر سے تشبیہ دی ہے جس کی تعمیر میں ہر نبی کی نبوت بطور ایک خشت کے لگ گئی اور اور تکمیلِ عمارت میں صرف ایک خشت کی جگہ خالی تھی۔ حضور فرماتے ہیں فَاَنَا هٰذِهِ اللَّبِنَةُ وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ۔ ابوہریرۃ سے مرفوعاً حضور کی چھ خصوصیات ذکر ہیں۔ ان میں چھٹی خصوصیت وَخُتِمَ بِيَ النَّبِيُّوْنَ یعنی مجھ پر پیغمبری کا سلسلہ ختم ہوا (رواہ مسلم فی الفضائل) ابن ماجہ نے باب فتنۃ الدجال میں ابوامامۃ سے مرفوعاً روایت نقل کی ہے وَاَنَا اٰخِرُ الْاَنْبِيَآءِ وَاَنْتُمْ اٰخِرُ الْاُمَمِ۔ یعنی میں آخری نبی ہوں اور تم آخری اُمت ہو۔ اسی طرح صحیحین میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت علیؓ کو یہ فرمانا کہ اَنْتَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰى اِلَّا اِنَّهٗ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ۔ یعنی تیرا تعلق مجھ سے وہ ہے جو حضرت ہارون کو موسیٰ علیہ السلام سے تھا بجز اس کے کہ ہارون نبی تھے اور میرے بعد نبی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح صحیحین کی یہ روایت کہ لَمْ يَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ کہ نبوت میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہی بجز سچے خوابوں کے۔ آیت ختم کے متعلق خود مرزا کا ازالہ اوہام ص۶۱۴، ص۲۵۲ میں بیان ہے۔ لکھتے ہیں۔ مگر وہ رسول ختم کرنے والا ہے نبیوں کا۔ یہ آیت کہ بعد ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کوئی رسول دنیا میں نہیں آئے گا۔ حمامۃ البشریٰ ص۲۴ میں لکھتے ہیں اَلَمْ

تَعلمان الرّب الرّحیم المتفضل سمّی نَبِیّنا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَاتم الْاَنْبِیَاء بِغَیْرِ استثْنَاء وَفسّر نَبِیّنَا فِی قَوْلِہٖ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ بِبیَانٍ وَاضح للطالبین۔ ایام الصلح صـ۱۴۶ میں لکھتے ہیں۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خاتم النبیین کی تفسیر لانبی بعدی کے ساتھ فرمائی کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا اور طالبین حق کے لئے یہ بات واضح ہے۔ حدیث لانبی بعدی میں لا نفی عام ہے۔ کتاب البریت صـ۱۸۴ پر لکھتے ہیں آنحضرت نے بار بار فرمایا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور حدیث لانبی بعدی ایسی مشہور تھی کہ کسی کو اس کی صحت میں کلام نہ تھا اور قرآن شریف جس کا لفظ لفظ قطعی ہے اپنی آیت کریمہ ولکن رَسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖن سے بھی اس کی تصدیق کرتا ہے کہ فی الحقیقت ہمارے نبی کریم پر نبوت ختم ہو چکی ہے۔ تریاق القلوب صـ۳۷۹ میں لکھتے ہیں ؏

رہ ہست او خیر الرسل خیرُ الانام — ہر نبوت را برو شد اختتام

ان تصریحات کے بعد اس امر میں کیا کوئی شبہہ باقی رہ سکتا ہے کہ آیت مذکورہ ختم نبوت میں قطعی الثبوت ہونے کے علاوہ قطعی الدلالت بھی ہے۔

لفظ خاتم النّبیّین اور لغت عرب | روح المعانی میں ہے کہ خاتم ما یختم بہٖ کو کہا جاتا ہے جیسے طَابعُ مَا یَطْبعُ بِہٖ کو کہا جاتا ہے فَمَعْنٰی خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ الَّذِیْ خُتِمَ النَّبِیُّوْنَ بِہٖ وماله آخِرُ النَّبِیّٖنَ۔

۲۔ مفردات راغب میں ہے وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ لِاَنَّہٗ ختم النبوۃ ای

۳۔ وَفِی الْمُحْکَمِ لِابْنِ سیدۃ وَخَاتم کُلِّ شَیْءٍ وَخَاتِمَتُہٗ عَاقِبَتُہٗ وَاٰخِرُہٗ۔

۴۔ وَفِی التَّھْذِیْبِ لِلْاَزْھَرِیِّ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ اَیْ اٰخِرُھُمْ۔

۵۔ وَفِی لِسَانِ الْعَرَبِ وَخَاتِمُھُمْ وَخَاتَمُھُمْ اٰخِرُھُمْ۔

۶۔ وَفِی تَاجِ الْعُرُوْسِ اَلْخَاتَمُ بِالْفَتْحِ وَالْکَسْرِ مِنْ اَسْمَائِہٖ عَلَیْہِ السَّلَامُ وَھُوَ الَّذِیْ خَتَمَ النُّبُوَّۃَ بِمَجِیْئِہٖ۔

۷۔ وَفِی مَجْمَعِ الْبِحَارِ وَخَاتَمُ بِالْفَتْحِ بِمَعْنَى الطَّابِعِ اَیْ شَیْءٍ یَدُلُّ عَلٰی اِنَّہٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ۔

۸۔ وَفِی الْقَامُوْسِ اَلْخَاتِمُ اٰخِرُ الْقَوْمِ کَالْخَاتَمِ وَخَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ اَیْ اٰخِرُہُمْ۔

۹۔ وَفِی کُلِّیَاتِ اَبِی الْبَقَاءِ وَتَسْمِیَۃُ نَبِیِّنَا خَاتَمَ الْاَنْبِیَاءِ لِاَنَّ خَاتَمَ الْقَوْمِ اٰخِرُ الْقَوْمِ ثُمَّ قَالَ وَنَفْیُ الْاَعَمِّ یَسْتَلْزِمُ نَفْیَ الْاَخَصِّ۔

۱۰۔ وَفِی الصِّحَاحِ وَخَاتِمُ بِکَسْرِ التَّاءِ وَفَتْحِہَا کُلُّہٗ بِمَعْنًی وَالجمع الْخَوَاتِیْمُ وَخَاتِمَۃُ الشَّیْءِ اٰخِرُہٗ وَمُحَمَّدٌ صَلَّی اللہُ خَاتَمُ الْاَنْبِیَاءِ۔

لفظ خاتم النّبیّین و مفسّرین کرام | قرآن حکیم کی جس قدر تفاسیر عہدِ صحابہ سے لے کر عہدِ مرزا تک لکھی گئی ہیں یا بعد عہد مرزا یا قرآن کے جس قدر تراجم کئے گئے ہیں سب نے خاتم النّبیّین کی تفسیر و تشریح یہ کی ہے کہ حضور کے بعد کسی کو نبوّت نہیں مِل سکتی لیکن جس گورداسپوری کو نبی بننے کی سُوجھی، صرف اُس نے وہ بھی اوّل میں نہیں بلکہ آخر میں اپنا عقیدہ دربارۂ ختمِ نبوّت اور اپنی تشریحِ ختمِ نبوّت کو بدل ڈالا تاکہ نبی بننے کی گنجائش نکل آئے جس سے اس کو خلافِ اُمید کامیابی ہوئی۔ اس کا اپنا بیان ہے کہ مجھے یہ گمان نہ تھا کہ مسلمان اس چیز کو قبول کریں گے کہ نبوّت جاری ہے لیکن انگریزی تعلیم اور انگریزی حکومت کی حمایت اور زوالِ فہم و عظمتِ دین نے ناشدنی کو شدنی بنایا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ یہاں تک کہ اس مصنوعی نبوّت نے ایک کامیاب اور نفع بخش فیکٹری کی شکل اختیار کی اور مرتد سازی کا نام تبلیغ اسلام رکھ کر اس فیکٹری کی آمدنی میں خُوب اضافہ کیا گیا۔ دوسری طرف اس نبوّت کے ماننے والوں پر عُہدوں اور تنخواہوں کی بارش ہونے لگی جس نے انہیں یہ احساس دلایا کہ یہ سب کچھ اِسی خود ساختہ نبوّت پر ایمان لانے کی برکت ہے یا بالفاظ دیگر مرزا کا معجزہ ہے جس سے مسلمانوں کی اکثریت محروم ہے۔ اگر حالات اور ہماری غفلت کی رفتار یہی رہی تو عجب نہیں کہ مسلمانوں کو ایک اور اسرائیل سے دوچار ہونا پڑے گا لیکن اسوقت کوئی تدبیر کارگر نہ ہوگی۔

کشورے محکم اساسے بایدت — دیدۂ مردم شناسے بایدت
مرشدِ رومی حکیم پاک زاد — سرِ مرگ و زندگی بر ما کشاد
ہر ہلاک اُمت پیشیں کے بود — زانکہ بر جندل گماں بردند عود — اقبال

۱۔ امام المفسرین ابن جریر الطبری اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:۔

وَلٰكِنَّهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ	یعنی آپ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین
اَلَّذِیْ خَتَمَ النُّبُوَّةَ فَطَبَعَ عَلَيْهَا	جس نے نبوت کو ختم کیا اور اس پر مہر لگا
فَلَا تُفْتَحُ لِاَحَدٍ بَعْدَهٗ اِلٰى قِيَامِ	دی پس وہ آپ کے بعد کسی کے لئے نہ کھولی جائیگی
السَّاعَةِ وَنَحْوِ الَّذِیْ قُلْنَا قَالَ	قیامت کے قائم ہونے تک اور ایسا ہی آئمہ
اَهْلُ التَّاوِيْلِ۔ (ج ۲۲ ص ۱۱)	تفسیر، صحابہ و تابعین نے فرمایا۔

۲۔ حضرت علی بن حسین سے ابن جریر نقل فرماتے ہیں۔

بِكَسْرِ التَّاءِ مِنْ خَاتِمِ النَّبِيّٖنَ بِمَعْنٰى	خاتم النبیین بکسر التاء اس معنی میں کہ آپ
اِنَّهٗ خَتَمَ النَّبِيّٖنَ اِلٰى قَوْلِهٖ وَقَرَءَ	نے تمام انبیاء کو ختم کر دیا اور جیسا کہ منقول
ذَالِكَ فِيْمَا يَذْكُرُ الْحَسَنُ وَالْعَاصِمُ	ہے قرأت میں سے حسن اور عاصم نے اس کو
وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ بِفَتْحِ التَّاءِ بِمَعْنٰى	بفتح التاء پڑھا ہے اس معنی میں کہ آپ
اِنَّهٗ اٰخِرُ النَّبِيّٖنَ۔ (ج ۲۲ ص ۱۱)	آخر النبیین ہیں۔

۳۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے۔

فَهٰذِهِ الْاٰيَةُ نَصٌّ فِیْ اَنَّهٗ لَا نَبِیَّ	یہ آیت نص صریح ہے کہ آپ کے بعد کوئی
بَعْدَهٗ وَاِذَا كَانَ لَا نَبِیَّ بَعْدَهٗ	نبی نہیں ہو سکتا جب کوئی نبی نہ ہو تو رسول
فَلَا رَسُوْلَ بِالطَّرِيْقِ الْاَوْلٰى لِاَنَّ	بدرجہ اولیٰ نہ ہوگا کیونکہ رسالت نبوت سے
مَقَامَ الرِّسَالَةِ اَخَصُّ مِنْ مَقَامِ	خاص ہے۔ ہر رسول کا نبی ہونا ضروری
النُّبُوَّةِ فَاِنَّ كُلَّ رَسُوْلٍ نَبِیٌّ وَلَا	ہے اور ہر نبی کا رسول ہونا ضروری نہیں

يَنْعَكِسُ وَبِذَالِكَ وَرَدَتِ الْاَحَادِيْثُ الْمُتَوَاتِرَةُ مِنْ حَدِيْثِ جَمَاعَةٍ مِنَ الصَّحَابَةِ۔ (ابن کثیر ج ۸ ص ۸۹)

اس پر رسول اللہ کی احادیث متواترہ وارد ہوئی جو صحابہ کی بڑی جماعت نے آپ سے نقل کی ہے۔

آگے لکھتے ہیں :-

لِيَعْلَمُوْا اَنَّ مَنْ كُلَّ مَنِ ادَّعٰى هٰذَا الْمَقَامَ بَعْدَهٗ فَهُوَ كَذَّابٌ اَفَّاكٌ دَجَّالٌ۔ (ج : ۸ ص ۹۱)

تاکہ اُمت جان لے تاکہ آپ کے بعد ہر وہ شخص جو اس مقام کا (نبوت) کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا افترا۔ پرداز اور دجال ہے۔

۴۔ تفسیر کشاف میں ہے۔

خَاتَمُ بِفَتْحِ التَّاءِ بِمَعْنٰى الطَّابِعِ وَبِكَسْرِهَا بِمَعْنٰى الطَّابِعِ وَفَاعِلُ الْخَتْمِ وَتُقَوِّيْهِ قِرَاءَةُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ وَّلٰكِنْ نَّبِيًّا خَتَمَ النَّبِيِّيْنَ فَاِنْ قُلْتَ كَيْفَ يَكُوْنُ اٰخِرَ الْاَنْبِيَاءِ وَعِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ يَنْزِلُ اٰخِرَ الزَّمَانِ قُلْتُ مَعْنٰى كَوْنِهٖ اٰخِرَ الْاَنْبِيَاءِ اَنَّهٗ لَا يُنَبَّأُ اَحَدٌ بَعْدَهٗ وَعِيْسٰى مِمَّنْ نُبِّئَ قَبْلَهٗ۔

خاتم بالفتح التاء بمعنی الہُمہر و بکسر التاء بمعنی مُہر کرنے والا۔ اور اس معنی کی تقویت کرتی ہے۔ ابنِ مسعود کی قراءت ولکن نبیا ختم النبیین۔ اگر آپ یہ کہیں کہ آپ خاتم الانبیاء کس طرح ہو سکتے ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام آخر زمانہ میں آسمان سے اُتریں گے۔ جواب یہ ہے کہ آپ کے بعد کوئی شخص نبی نہ بنایا جائیگا اور عیسیٰؑ ان لوگوں میں سے ہیں جو آپ سے پہلے نبی بنا کر بھیجے گئے۔

۵۔ تفسیر روح المعانی میں ہے۔

وَالْمُرَادُ بِالنَّبِيِّ مَا هُوَ اَعَمُّ مِنَ الرَّسُوْلِ فَيَلْزَمُ مِنْ كَوْنِهٖ

آنحضرت کے خاتم النبیین ہونے سے مراد یہ ہے کہ آپ کے اس عالم میں وصف

خَاتَمَ النَّبِيّنَ كَوْنِهٖ خَاتَمَ الْمُرْسَلِيْنَ وَالْمُرَادُ بِكَوْنِهٖ خَاتَمَهُمْ اِنْقِطَاعُ حُدُوْثِ وَصْفِ النُّبُوَّةِ فِيْ اَحَدٍ مِنَ الثقلين بَعْدَ تَحَلِّيْهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِهَا فِيْ هٰذِهِ النَّشْاَةِ وَلَا يقدح فِيْ ذَالِكَ مَا اَجْمَعَتْ عَلَيْهِ الْاُمَّـة وَ اشْتَهَرَتْ فِيْهِ الْاَخْبَارُ وَلَعَلَّهَا بَلَغَتْ مَبْلَغَ التَّوَاتُرِ الْمَعْنَوِيِّ وَنَطَقَ بِهِ الْكِتَابُ عَلٰى قَوْلٍ وَّ وَجَبَ الْاِيْمَانُ وَاَكْفَرَ منكِرُهٗ كَا لْفَلَاسِفَةِ مِنْ نُزُوْلِ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ آخِرَ الزَّمَانِ لِاَنَّهٗ كَانَ نَبِيًّا قَبْلَ تَحَلِّيْ نَبِيِّنَا بِالنُّبُوَّةِ فِيْ هٰذِهِ النَّشْاَةِ ۔

نبوّت سے متصف ہونے کے بعد نبوّت کا پیدا ہونا منقطع ہوگیا اور ختمِ نبوّت اس عقیدہ سے معارض نہیں۔ جس پر اُمّت نے اجماع کیا اور جس میں احادیث شہرت کو پہونچی اور شاید درجۂ تواتر معنوی کو پہونچ جائیں اور جس پر قرآن نے تصریح کی ہے اور جس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے مُنکر فلاسفہ کو کافر سمجھا گیا۔ یعنی نزول عیسٰی علیہ السّلام کیونکہ آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصفِ نبوّت سے متصف ہونے سے پہلے وصفِ نبوت سے متصف ہوچکے تھے۔

۴۔ تفسیر مدارک میں ہے۔ (ج ۲۔ ص ۳۷)

خَاتَمَ النَّبِيّنَ بِفَتْحِ التَّاءِ عَاصِمٌ بِمَعْنَى الطَّابِعِ اَیْ آخِرُهُمْ اَیْ لَا يُنَبَّاءُ اَحَدٌ بَعْدَهٗ وَعِيْسٰى مِمَّنْ نُبِّئَ قَبْلَهٗ وَغَيْرُهٗ بِكَسْرِ التَّاءِ بِمَعْنَى الطَّابِعِ وَفَاعِلُ الْخَتْمِ

عاصم کی قرارت میں بفتح التاء بمعنی الطابع جس سے مراد آخر ہے اور عیسٰی علیہ السّلام آپ سے پہلے نبی بنائے گئے اور عاصم کے بغیر سب قراء کے نزدیک بکسر التاء بمعنی مُہر کرنیوالا اور ختم کرنیوالا

وَتَقْوِيَةُ قِرَاءَةُ ابْنِ مَسْعُوْدٍ۔ جس کی ابن مسعود کی قراءت تائید کرتی ہے

۷۔ زرقانی شرح مواہب میں ہے۔ خَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ اَیْ آخِرُهُمْ۔ خاتم النبیین کے معنی آخری نبی کے ہیں۔ (ج ۵: صـ۲۶۷) ۔ یہی معنی تفسیر بحر المحیط ج ۷ صـ۲۳۶ اور ابو السعود برحاشیہ تفسیر کبیر ج ۸ صـ۶۸۸ میں لکھا ہے۔

۸۔ شفاء قاضی عیاض تفسیر آیت خاتم النبیین میں لکھتے ہیں۔ (طبع بریلی صـ۳۶۲)

مَنِ ادَّعٰی مِنْهُمْ اَنَّهُ یُوْحٰی اِلَیْهِ وَاِنْ لَمْ یَدَّعِ النُّبُوَّةَ اِلٰی اَنْ قَالَ فَهٰؤُلَاءِ كُلُّهُمْ كُفَّارٌ مُّكَذِّبُوْنَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاَنَّهُ اَخْبَرَ اَنَّهُ خَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ وَلَا نَبِيَّ بَعْدَهُ وَاَخْبَرَ عَنِ اللّٰهِ اَنَّهُ خَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ وَاَنَّهُ اُرْسِلَ اِلٰی كَافَّةِ النَّاسِ وَاَجْمَعَتِ الْاُمَّةُ عَلٰی حَمْلِ هٰذَا الْكَلَامِ عَلٰی ظَاهِرِهٖ وَاَنَّ مَفْهُوْمَهُ الْمُرَادُ بِهٖ دُوْنَ تَاوِیْلٍ وَّلَا تَخْصِيْصٍ فَلَا شَكَّ فِیْ كُفْرِ هٰؤُلَاءِ الطَّوَائِفِ قَطْعًا اِجْمَاعًا وَّسَمْعًا۔

جو وحی کا دعوےٰ کرے اگرچہ نبوت کا دعوےٰ نہ کرے تو یہ سب گروہ کفار ہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانے والے، جس نے خبر دی کہ وہ آخری نبی ہیں اور اُن کے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا اور وہ سب لوگوں کی طرف بھیجے گئے ہیں اور آپ کے ظاہری معنی پر بلا تاویل و تخصیص محمول ہونے پر اُمت متفق ہے تو اِس کے خلاف معنی اختیار کرنے کے کفر میں کوئی شک نہیں۔

۹۔ غزالی لکھتے ہیں۔

اِنَّهُ لَيْسَ فِيْهِ تَاوِیْلٌ وَّلَا تَخْصِيْصٌ وَّمَنْ اَوَّلَهُ بِتَخْصِيْصٍ فَكَلَامُهُ من اَنْوَاعِ الْهَذَيَانِ

اس آیت میں تاویل و تخصیص نہیں۔ جو ایسا کرے وہ بکواس کرتا ہے، جو اِس کو حکمِ کفر

لَا یَمْنَعُ الْکُفْرَ بِتَکْفِیْرًا لِاَنَّهٗ مُکَذِّبٌ لِہٰذَا النَّصِّ الَّذِیْ اَجْمَعَتِ الْاُمَّةُ اَنَّهٗ غَیْرُ مُاَوَّلٍ وَلَا مَخْصُوْصٍ۔ (الاقتصاد)

سے روک نہیں سکتا۔ اُمت متفق ہے کہ اس میں تاویل و تخصیص نہیں۔

اسی طرح تمام کُتب تفاسیر میں یہی معنی خاتم النّبیّین کے بیان ہوئے ہیں اور چونسٹھ صحابہ سے یہی معنی ختم النُّبوّت فی الآثار میں منقول ہے۔

عمومی انداز میں یہ مسئلہ کہ حضور علیہ السّلام کے بعد نبوّت کسی کو نہیں دی جاسکتی ایک سَو سے زائد آیاتِ قرآن میں ثابت ہے، جن کو ہم آئندہ چند عنوانات کے تحت لائیں گے یہاں قادیانیوں کی چند تحریفات اور شیطانی وساوس کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں، جو آیت خاتم النبیین سے متعلق ہیں۔

پہلی تحریف | اگر آیت ختم النبیّین کا معنی آخری نبی ہے تو حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کا نزول اس کے خلاف ہے۔ اس کا جواب گزر گیا کہ ختم نبوّت کا معنی عطاء نبوت کی بندش ہے جس پر مُہر لگ گئی ہے لیکن پرانے نبی سے زوال نبوت مراد نہیں لہٰذا دورِ محمّدی میں حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی تشریف آوری ایسی ہے جیسے ایک گورنر کے صوبہ میں دُوسرا گورنر آجائے جو اس گورنر کے احکام کا تابع ہو کر آئے گا بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو نزول عیسیٰ علیہ السّلام دلیلِ ختمِ نبوّت ہے اگر آئندہ نبوّت کا سلسلہ جاری ہوتا تو سابق انبیاء میں سے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو لائے جانے کی ضرورت نہ تھی۔ انبیاء علیہم السّلام کے سابق تعداد میں سے ایک نبی کو واپس لانا اس امر کی دلیل ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کی تعداد حضور علیہ السّلام کی بعثت پر پوری ہوگئی۔ اس لئے دوبارہ لانے کے لئے سابق انبیاء علیہم السّلام میں سے ایک نبی یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کا انتخاب کیا گیا۔

تحریفِ دوم | خاتم النبیّین کے معنی مُہر کے ہیں یعنی آپ کے بعد آپ کی مُہرِ تصدیق سے

انبیاء بنیں گے۔ اس کے لئے اوّلاً ہم یہ پوچھتے ہیں کہ یہ معنی لغتِ عربی کی کس کتاب میں لکھا ہے یا کس حدیث میں بیان ہوا ہے یا کونسی تفسیر میں لکھا ہے جب کہ خود قرآن مثلاً خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ۔ اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ اور احادیثِ متواترہ اور اجماعِ اُمت میں مُہر کے معنی بندشِ نبوّت کے ہیں تو مُہر کے معنی اس کے خلاف نبوّت جاری کرنے کے کیسے ہو سکتے ہیں جب کہ خود مرزا صاحب نے بندش کے معنی کئے ہیں اور اگر مراد جاری کرنا ہوتا تو اس میں حضوؐر کی خصوصیت کیا رہی جبکہ اور پیغمبروں کے بعد بھی نبوّت جاری رہی اور آپ کے بعد بھی بلکہ اگر اس سے مراد اجراء نبوّت ہوتی تو کم از کم اس تیرہ سو سال میں کئی سَو نبی آجانے چاہیئے تھے کہ آپ کا یہ کمال خُوب ظاہر ہو جائے اور اگر نبوّت آپ کی اتباع سے ملتی تو نبوّت وہبی نہ رہی، کسبی ہو گئی۔ اس کے علاوہ اس صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ تیرہ سو سال میں پیغمبرِ اسلام کا کوئی متبع کامل پیدا نہ ہوا کہ اس کو اتباع کے ثمرہ میں نبی بنایا جاتا۔ تیرہ سو سال کے بعد صرف آریہ ورت میں انگریز کی عنایت سے صرف ایک ہی پیدا ہوا اور اس کو بھی آخر تک اپنی نبوّت میں شک رہا۔ کبھی اقرار کبھی انکار۔ یہاں تک کہ اس کے ماننے والے دو جماعتوں میں تقسیم ہوئے۔

تحریف سوم آیت خاتم النبیّین میں النبیّین میں الف لام عہد خارجی یا ذہنی ہے جس سے مراد صرف تشریعی انبیاء ہیں گویا آپ تشریعی انبیاء کے خاتم ہیں عہد خارجی کے لئے سابق کلام میں خاص تشریعی انبیاء علیہم السلام کا ذکر ضروری ہے جو یہاں نہیں، اور عہد ذہنی اُس وقت لیا جاتا ہے جب استغراق ممکن نہ ہو جیسے اَكَلَهُ الذِّئْبُ اور اِشْتَرِ اللحم عَنْدَ عَامَّةِ اَهْلِ الْاُصُوْلِ وَالْعَرَبِيَّةِ لَامُ التَّعْرِيْفِ سَوَاءٌ دَخَلَتْ عَلَى المفرد اَوْ الجمع تُفِيْدُ الْاِسْتِغْرَاقَ اِلَّا اِذَا كَانَ مَعْهُوْدًا۔ (کلیات ابی البقاء ص۵۶۳)۔

وفی الکشف ج ۱ ص۲۲۰ وان دخلت علی الجمع فلا ان کان واللہ

وفی الرضی ج ۲ ص۱۰۳ فَاِذَا لَمْ يَكُنْ لِلْبَعْضِيَّةِ لِعَدَمِ دَلِيْلِهَا يَجِبُ كَوْنُهَا

للاستغراق -

تحریف چہارم | خاتم النبیین میں الف لام استغراق حقیقی کے لئے نہیں بلکہ عرفی کے لئے ہے یعنی انبیاء تشریعی مراد ہیں نہ مطلق انبیاء جیسے وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ میں صرف بعض وہ انبیاء مراد ہیں جو بنی اسرائیل کے زمانے میں تھے۔ جواب یہ ہے کہ استغراقِ عرفی وہاں لیا جاتا ہے جہاں استغراقِ حقیقی ممکن نہ ہو جیسے جمع الامیر الصاغۃ کیونکہ تمام دنیا کے سناروں کا جمع کرنا ممکن نہیں بلحاظ عرف و عادت کے لیکن خاتم النبیین بلا تکلف استغراق درست ہے بخلاف یقتلون النبیین جہاں استغراق ممکن نہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ آیت ولکن البر من امن باللہ والیوم الاخر والکتاب والنبیین۔ اسی طرح ووضع الکتاب وجیٔ بالنّبیّٖن واذ اخذ اللہ میثاق النّبیّٖن کیا استغراق حقیقی مراد ہے یا عرفی۔

تحریف پنجم | خاتم کے معنی نگینہ انگشتری لے کر زینت مراد ہے یعنی آپ انبیاء کی زینت ہیں۔ جواب یہ ہے کہ حقیقی معنی لینا جب تک محال نہ ہو مجازی معنی مراد لینا درست نہیں اور یہاں حقیقی معنی درست ہے اور لغت احادیث اجماع نے اس کو متعین کیا ہے لہٰذا مجاز لینا غلط ہے ورنہ قرآن کے کسی لفظ سے معنی کا تعین نہ ہو سکے گا۔ اور ہر لفظ مجازات اور تاویلات کا اکھاڑہ بن کر اپنی حقیقت کھو دے گا اور صوم صلوٰۃ زکوٰۃ سب کے معنی بدل جائیں گے۔

آیت خاتم النبیین کے بعد اب ہم قرآن حکیم کی چند دیگر آیات کو پیش کرتے ہیں۔

دلیل کمالی | آیت دوم۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًاؕ (المائدہ آیۃ : ۳)۔ اس آیت میں کمال دین کا اعلان ہوا۔ وہ دن حدیث بخاری کے بموجب عرفہ کا دن تھا۔ مظہری میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بعد صرف اکیاسی [۸۱] دن زندہ رہے۔ ابن کثیر

اس آیت کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ آیت اُمت پر سب سے بڑی نعمت ہے ۔ حَیْثُ اَکْمَلَ لَهُمْ دِیْنَهُمْ فَلَا یَحْتَاجُوْنَ اِلٰی دِیْنٍ غَیْرِهٖ وَلَا اِلٰی نَبِیٍّ غَیْرِ نَبِیِّهِمْ وَلِهٰذَا جَعَلَهٗ خَاتَمَ الْاَنْبِیَاءِ وَبَعَثَهٗ اِلَی الْاِنْسِ وَالْجِنِّ۔

امام رازیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ اِنَّ الدِّیْنَ مَا کَانَ نَاقِصًا اَلْبَتَّةَ بَلْ کَانَ اَبَدًا کَامِلًا کَانَتِ الشَّرَائِعُ النَّازِلَةُ کَافِیَةً فِیْ ذَالِكَ الْوَقْتِ اِلَّا اَنَّهٗ تَعَالٰی کَانَ عَالِمًا فِیْ اَوَّلِ وَقْتِ الْبِعْثَةِ بِاَنَّ مَا هُوَ کَامِلٌ فِیْ هٰذَا الْیَوْمِ لَیْسَ بِکَامِلٍ فِی الْغَدِ وَلَا یُصَالِحُ فِیْهِ لَاجَرَمَ کَانَ یَنْسَخُ بَعْدَ الثُّبُوْتِ وَکَانَ یُزِیْلُ بَعْدَ التَّحَکُّمِ وَاَمَّا فِیْ اٰخِرِ زَمَانِ الْبِعْثَةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ شَرِیْعَةً کَامِلَةً وَّحَکَمَ بِبَقَائِهَا اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ فَالشَّرْعُ اَبَدًا کَانَ کَامِلًا اِلَّا اِنَّ الْاَوَّلَ کَمَالٌ اِلٰی یَوْمٍ مَخْصُوْصٍ وَالثَّانِیْ کَمَالٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ فَلِاَجْلِ هٰذَا الْمَعْنٰی قَالَ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ۔ یہ آیت ختمِ نبوّت پر دال ہے بوجوہاتِ ذیل۔

۱: ایک خود کمالِ دین اس امر کی دلیل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سب سے اخیر میں ہوئی کہ فہرست نبوّت میں کوئی نبی باقی نہ رہا۔

۲: نبی کی آمد دین میں نقص کو دُور کرنے کے لئے ہو، یا موقّت احکام میں تنسیخ کے لئے یا محرف کی تحریف کو دُور کرنے کے لئے لیکن قرآن اور دین اسلام کامل ہے اس میں ترمیم و تنسیخ ہو نہیں سکتی اور اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ میں قرآن کے الفاظ اور معانی بلکہ تلفظ تک کی حفاظت کا اعلان ہے لہذا ازالہ تحریف کی بھی ضرورت نہیں۔ باقی رہی تجدید و تبلیغ دین، اس کے لئے نبی کی ضرورت نہیں بلکہ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ یہ ساری اُمت کا اجتماعی وظیفہ اور فریضہ ہے۔

۴ : اگر نبوّت جاری ہو تو دین اسلام ناقص رہے گا اور اسلام کے تمام احکام فضول قرار پائیں گے کیونکہ جب تک اس نئے نبی پر مسلمان ایمان نہیں لائیں گے تو قرآن اور حدیث اور پوری اسلامی شریعت پر اوّل سے آخر تک عمل کرنے کے باوجود وہ کافر اور ابدی جہنمی ہوں گے تو کمال دین اس نبی پر ایمان لانے میں منحصر ہوا اور اس پر ایمان لائے بغیر پورا دین نامکمل بلکہ کالعدم رہا۔

دلیل میثاقی آیت وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَاۤ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ جب اللہ نے انبیاء سے عہد لیا کہ جب میں تم کو کتاب و حکمت دُوں اور اُس کے پیچھے ایسا رسول آئے جو تمہاری آسمانی کتابوں کی تصدیق کرے تو تم اُس پر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو۔ یہ تمام انبیاء علیہم السّلام سے عالم ارواح میں عہد لیا گیا۔ اس میں ثُمَّ جَآءَكُمْ رسول جس سے حضرت نبیٔ کریم علیہ السّلام مراد ہیں ان کا سب انبیاء کے بعد تشریف لانا ثابت ہوتا ہے جو دلیل ہے کہ مشیّتِ الٰہی میں جس قدر انبیاء مقدر تھے ان سب کو اللہ نے آپ سے پہلے مبعوث فرمایا اور آپ کو سب سے اخیر میں بھیجا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا، کہ آپ کی بعثت باعث بندش نہیں ہوئی بلکہ مقدر آپ کو سب سے آخر میں بھیجنا تھا۔

دلیل بعثتِ عمومی قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعَا ا۟لَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الاعراف آیۃ ۱۵۸) تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا۔ (الفرقان آیۃ ۱) وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ۔ (الانبیاء آیۃ ۱۰۷)۔ یہ آیات دال ہیں کہ نبیٔ کریم علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی بعثت تمام اقوام اور ازمان کو شامل ہے تو قیامت تک کے انسان آپ کی اُمّت ہیں اور آپ ان سب کی طرف مبعوث ہیں جو دلیل ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی مبعوث نہ ہوگا۔ آپ کی موجودگی میں جو اکمل الانبیاء ہیں کسی نبی کی ضرورت نہیں، جیسے سورج کے بعد کسی چراغ

اور دریا کے بعد شبنم کی حاجت نہیں اور آیت وَمَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ میں پہلے حضورؐ سے نسبی ابوت کی نفی کی گئی اور وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ میں روحانی اور دینی ابوت ثابت کی گئی جس سے معلوم ہوا کہ جیسے ابوت نسبیہ میں تشارک نہیں تو ابوت دینیہ میں بھی تشارک نہیں۔ اگر ایک آدمی کے دو باپ نہیں ہو سکتے تو اسی طرح اُمّت کے دو رُوحانی باپ نہیں ہو سکتے۔

دلیلِ وحی قبلی ۱: يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ۔ (البقرہ آیۃ ۴)

۲: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ۔ (الانبیاء آیۃ ۲۵)

۳: وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ۔ (الزمر ۶۵)

۴: وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ۔ (الفرقان آیۃ ۲۰)

۵: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ۔ (الانعام آیۃ ۴۲)

۶: قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ۔ (آل عمران آیۃ ۱۸۳)

۷: وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ۔ (فاطر آیۃ ۳۱)

ان آیات اور اسی قسم کی دوسری آیات میں وحی الٰہی کا تذکرہ کیا گیا ہے اور ان سب آیات میں قید قبلیت کے ساتھ مقید کیا گیا۔ حالانکہ اگر ما بعد میں بھی کوئی وحی یا نبوت ہوتی تو یہ قید سبب اضلال ہو سکتی ہے بلکہ وحی ما قبل کی طرح وحی ما بعد کا بھی ذکر کرنا ضروری تھا اور مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ کے ساتھ مِنْ خَلْفِهٖ کا ذکر بھی ضروری تھا اور کم از کم وحی کو مطلق چھوڑ دیا جاتا تاکہ وحی ما بعد کی گنجائش بھی باقی رہتی۔

دلیلِ وعدی فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (الاعراف آیۃ ۱۵۷) ایسی تمام آیات جن میں صرف اللہ اور رسول کی اطاعت پر جنت اور فلاح کا وعدہ کیا گیا ہے انقطاعِ نبوت

کی دلیل ہے کیونکہ اور نبی کا آنا اگر ہوتا خواہ بروزی یا ظلّی تو جنّت اور فلاح اس کے ماننے پر موقوف ہوتی، تو اس قسم کی تمام آیات کا مضمون کیونکر درست ہو سکتا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی اور نبوّت بند ہے۔

حدیث اور ختم النبوّۃ

عَنْ اَبُوْهُرَيْرَةَ مَرْفُوْعًا اَنَّ مَثَلِيْ وَ مَثَلَ الْاَنْبِيَاءِ مِنْ قَبْلِيْ كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰى بَيْتًا فَاَحْسَنَهٗ وَاَجْمَلَهٗ اِلَّا مَوْضِعَ لَبِنَةٍ مِنْ زَاوِيَتِهٖ فَجَعَلَ النَّاسُ يَطُوْفُوْنَ بِهٖ وَيَعْجَبُوْنَ لَهٗ وَيَقُوْلُوْنَ هَلَّا وُضِعَتْ هٰذِهِ اللَّبِنَةُ قَالَ فَاَنَا اللَّبِنَةُ وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِيّٖنَ۔

ابوہریرۃؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ میری اور مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال ایسی ہے، جیسے کسی شخص نے گھر بنایا اور اس کو آراستہ کیا مگر ایک اینٹ کی جگہ کونے میں چھوڑی لوگ اُس کے پاس گذرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں یہ ایک اینٹ بھی کیوں نہ رکھ دی فرمایا وہ آخری اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النّبیین ہوں۔

۲۔ اِنَّ لِیْ اَسْمَاءً اَنَا مُحَمَّدٌ وَاَنَا اَحْمَدُ اِلٰى قَوْلِهٖ وَاَنَا الْعَاقِبُ وَالْعَاقِبُ الَّذِیْ لَيْسَ بَعْدَهٗ نَبِیٌّ۔ (بخاری ومسلم)

میں محمد ہوں، احمد ہوں، عاقب ہوں۔ عاقب سے مراد یہ ہے کہ جس کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ (مشکوٰۃ باب ا

۳۔ لَوْ كَانَ بَعْدِیْ نَبِیٌّ لَكَانَ عُمَرُ ابْنُ الْخَطَّابِ۔

اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عُمر ہوتا۔ (مشکوٰۃ مناقب عمر۔ ازالہ اوہام ص ۹۸-۲۲۶)

۴۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ لِعَلِیٍّ اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰى اِلَّا اَنَّهٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ۔ (بخاری، مسلم مشکوٰۃ۔ باب مناقب علی)

۵۔ كَانَتْ بَنُوْ اِسْرَائِيْلَ تَسُوْسُهُمْ

بنی اسرائیل کی عنان سیاست انبیاء کے

اَلْاَنْبِيَاءُ كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ وَ اَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدُ وَ سَيَكُوْنُ خُلَفَاءَ فَيَكْثُرُوْنَ ۔ (بخاری ج ا صلـ۴۱۹ و مسلم کتاب الایمان)

ہاتھوں میں رہی جب ایک نبی فوت ہوتا تو اس کا جانشین نبی ہوتا مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ عنقریب خلفاء کا سلسلہ شروع ہوگا پس بکثرت ہوں گے۔

مرزا لکھتے ہیں۔ وحی و رسالت ختم ہوگی مگر ولایت و امامت و خلافت کبھی ختم نہ ہوگی۔ (مکتوب مرزا تشحیذ الاذہان ج ا صلـ)

۶۔ اِنَّ الرِّسَالَةَ وَالنُّبُوَّةَ قَدِ انْقَطَعَتْ فَلَا رَسُوْلَ بَعْدُ وَ لَا نَبِيَّ۔ (ترمذی وصححہ)

تحفہ بغداد مرزا صـ، مرزا ازالہ اوہام صـ۶۱۴ میں لکھتے ہیں۔ اب وحی و رسالت تا بقیامت منقطع ہے۔ آئینہ کمالات صـ۳۷۷ پر لکھتے ہیں۔ ہرگز نہ ہوگا کہ اللہ ہمارے نبی کے بعد کسی کو نبی کرکے بھیجے اور یہ نہ ہوگا کہ سلسلہ نبوت کو اس کے منقطع ہو جانے کے بعد جاری کر دے۔ حمامۃ البشریٰ صـ۳۴ پر لکھتے ہیں آپ کی وفات کے بعد وحی منقطع ہوگئی، اور اللہ نے آپ پر نبیوں کا خاتمہ کر دیا۔ حقیقۃ صـ۶۴ ضمیمہ عربی میں لکھتے ہیں۔ اِنَّ رَسُوْلَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ وَعَلَيْهِ انْقَطَعَتْ سِلْسِلَةُ الْمُرْسَلِيْنَ۔

۷۔ عَنْ اَبِيْ مُوْسٰى مَرْفُوْعًا اَنَا مُحَمَّدٌ وَّاَنَا اَحْمَدُ وَ اَنَا الْمُقَفِّيْ۔ (رواہ مسلم ج ۲ صـ۲۶۱) قَالَ النَّوَوِيُّ اَلْمُقَفِّي الْعَاقِبُ یعنی میں آخر الانبیاء ہوں۔

۸۔ اَبُوْنُعَيْمٍ فِي الْحِلْيَةِ عَنْ اَبِيْ ذَرٍّ مَرْفُوْعًا يَا اَبَا ذَرٍّ اَوَّلُ الْاَنْبِيَاءِ اٰدَمُ وَاٰخِرُهُمْ مُحَمَّدٌ۔ پہلا نبی آدم اور آخر محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ ابن حجر نے فتح الباری میں اس کو صحیح کہا۔ مرزا نے حقیقۃ الوحی صـ۱۴۱ پر لکھا۔ اور سب سے آخر محمد مصطفیٰ کو پیدا کیا جو خاتم الانبیاء اور ختم الرسل ہیں۔

۹۔ عَنْ اَبِی اُمَامَۃَ مَرْفُوْعًا اَنَا اٰخِرُ الْاَنْبِیَاءِ وَاَنْتُمْ اٰخِرُ الْاُمَمِ۔ میں آخرالانبیاء اور تم آخرالامم ہو۔ (ابن ماجۃ)

۱۰۔ عَنْ اَبِی ھُرَیْرَۃَ مَرْفُوْعًا لَیْسَ یَبْقٰی بَعْدِیْ مِنَ النُّبُوَّۃِ اِلَّا الرُّؤْیَا الصَّالِحَۃُ۔ (نسائی و ابو داؤد) میرے بعد سوائے رویا صالحہ کے کوئی جزء باقی نہیں رہا۔ اسی طرح اَنَا اٰخِرُ الْاَنْبِیَاءِ وَمَسْجِدِیْ اٰخِرُ الْمَسَاجِدِ۔ (مسلم ج ۱ ص ۴۴۶) وفی البزار۔ وَمَسْجِدِیْ اٰخِرُ مَسَاجِدِ الْاَنْبِیَاءِ۔ میں آخری نبی ہوں اور میری مسجد، مساجد انبیاء کی خاتم ہے۔ اسی طرح دو سو سے زائد احادیث ختم نبوت کے متعلق موجود ہیں اور اسی پر عقیدہ قائم ہوا ہے۔ قرآن کی کسی آیت اور احادیث میں سے کسی حدیث میں سلسلہ نبوت کے جاری کرنے کی خبر نہیں دی گئی اور نہ صحابہ تابعین اور تبع تابعین اور نہ مابعد زمانہ میں مرزا کے علاوہ کسی کا یہ عقیدہ رہا ہے۔ ایسی صورت میں محض قیاس آرائی اور نو تراشیدہ تاویلات سے اجراء نبوت کا عقیدہ پیدا کرنا کسی قدر عقل اور دین سے محرومی کی دلیل ہے۔ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا مِنْ ھٰذِہِ الشَّقَاوَۃِ۔

ختم نبوت اور اجماعِ اُمت ابن خلدون لکھتے ہیں کہ اس اُمت میں پہلا اجماع دعویٰ نبوت کی وجہ سے مسیلمہ کذاب کے کفر و قتل پر ہوا اور اس کی دیگر بُرائیاں صحابہ کو اس کے قتل کے بعد معلوم ہوئیں اور اسی طرح کا اجماع بلافصل قرناً بعد قرن مدعی نبوت کے کفر و ارتداد اور قتل پر جاری رہا اور تشریعی اور غیر تشریعی نبوت کی کوئی تفصیل نہیں پوچھی گئی۔ خاتم النبیین للشیخ الانور ص ۲۳ و ص ۲۴ علامہ قاری شرح فقہ اکبر مجتبائی ص ۲۰۲ میں لکھتے ہیں۔ دَعْوَی النُّبُوَّۃِ بَعْدَ نَبِیِّنَا کُفْرٌ بِالْاِجْمَاعِ۔ اسی طرح عام کتب تفسیر و شروح حدیث اور کتب کلام میں اجماع مدعی نبوت کے کفر پر اجماعِ اُمت کی تصریح کی گئی ہے۔

ختم نبوت اور درایت اللہ کے سوا ہر چیز کے لئے ابتداء اور انتہا ہوتی ہے۔ نبوت کے لئے بھی ابتداء اور انتہا کا ہونا ضروری ہے۔ انسانی زندگی کا ابتدائی زمانہ طفولیت کا تھا

بہ تدریج انسانی عقل میں ترقی ہوتی گئی، توجس طرح عہدِ طفولیت کا لباس طفل کی بدنی ترقی کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے اسی طرح عقل و شعورِ انسانی کی ترقی کے ساتھ ساتھ رُوحانی لباس یعنی شریعت کا بدل جانا بھی ضروری تھا۔ اس لئے مختلف نبوتیں اور شریعتیں آتی رہیں۔ حضرت خاتم الانبیاء علیہ السّلام کے زمانے تک عقل و شعورِ انسانی کی نشوونما مکمل ہوئی تو ضرورت تھی کہ اس وقت انسان کو کامل شریعت اور نبوّت کی نعمت عطا کی جاتی جس کا قرآن نے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کا اعلان کر کے شریعتِ کاملہ کی عطا کردگی کا اعلان کیا اور اِنَّا نَحْنُ الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ میں حفاظتِ دین و شریعت کا بھی اعلان ہوا تاکہ مستقبل میں نوعِ انسانی کسی جدید نبی کی آمد سے بے نیاز ہو کر اُس کے انتظار میں نہ رہے کہ نبی کے آنے کا مقصد یا تکمیلِ دین ہے یا حفاظتِ دین، وہ دونوں مکمل ہو چکے۔ باقی تبلیغ، تو یہ اُمّت اور علماء کا کام ہے جس کے لئے نبی کی ضرورت نہیں جیسے قرآن میں ہے کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ اور وَلْتَکُنْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ اور یہی فریضۂ تبلیغ اُمّت نے۔ صرف شیخ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ نے بقول ڈاکٹر اسمتھ نوّے لاکھ ہندوؤں کو مسلمان کیا۔ ملاحظہ ہو نقشِ حیات۔ اور تاریخِ اسلام بھی اس کی شاہد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وصال کے بعد تقریباً لاکھ سوا لاکھ مسلمان چھوڑے۔ لیکن آج ستّر کروڑ مسلمان ہیں جو اُمّت کی تبلیغ سے مسلمان ہوئے۔ یہ کس قدر نامعقول امر ہے کہ اُمّت کی کوششوں سے جو ستّر کروڑ مسلمان پیدا ہوئے ہیں، اس کے بعد ایک ایسے نبی کی آمد ضروری ہے جو ان ستّر کروڑ مسلمانوں کی تکفیر کر کے صرف اپنے چند مریدوں میں اسلام کی وسعت کو منحصر کر دے گویا اُس کی آمد کفار کو مسلمان بنانے کے بجائے مسلمانوں کو کافر بنانے کے لئے تھی۔

مرزائی وساوس کا جواب | نبوّت جیسا بنیادی مسئلہ جو کفر و ایمان کے درمیان ایک

حد فاصل کی حیثیت رکھتا ہے، مرزائیوں نے جب اجراء نبوّت کو قرآن، احادیث، اجماعِ امّت، صحابہ، تابعین، فقہاء، متکلمین، محدثین کے خلاف پایا تو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے تحت چند مصنّفین کی مبہم عبارات کا سہارا لینا شروع کیا۔ اگرچہ دوسری جگہ ان حضرات کی صریح عبارات نے قادیانی استدلال کا بھانڈا پھوڑ دیا تاہم مرتا کیا نہ کرتا کے تحت جو کچھ اسی قسم کے دلائل یا وساوس اُن کے ہیں ہم اُن کا جواب بھی دینا چاہتے ہیں۔

حضرت عائشہؓ پر مرزائی افترا۔ مرزائی کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا ہے۔ قُوْلُوْا اِنَّہٗ خَاتَمُ الْاَنْبِیَاءِ وَلَا تَقُوْلُوْا لَا نَبِیَّ بَعْدَہٗ۔ یہ درمنثور تحت آیت خاتم النّبیین اور تکملہ مجمع البحار ص۸۵ پر ہے۔ یہاں تلبیس کرکے باقی عبارت کو انہوں نے کاٹ دیا۔ یہ لفظ صدیقہؓ نے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا۔ اَصْلُھَا فِیْ حَدِیْثِ عِیْسٰی اَنَّہٗ یَقْتُلُ الْخِنْزِیْرَ وَیُکْسِرُ الصَّلِیْبَ وَیَزِیْدُ فِی الْحَلَالِ اَیْ یَزِیْدُ فِیْ حَلَالِ نَفْسِہٖ بِاَنْ یَتَزَوَّجَ وَیُوْلَدَ لَہٗ وَکَانَ لَمْ یَتَزَوَّجْ قَبْلَ رَفْعِہٖ اِلَی السَّمَاءِ فَزَادَ فِی الْھُبُوْطِ فِی الْحَلَالِ فَحِیْنَئِذٍ یُؤْمِنُ کُلُّ اَحَدٍ مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ وَیَتَیَقَّنُ اَنَّہٗ بَشَرٌ وَّ عَنْ عَائِشَۃَ قُوْلُوْا اِنَّہٗ خَاتَمُ الْاَنْبِیَاءِ وَلَا تَقُوْلُوْا لَا نَبِیَّ بَعْدَہٗ۔ اس پوری عبارت سے معلوم ہوا کہ صدیقہؓ نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آسمان پر اُٹھائے جانے سے قبل نکاح نہیں کیا تھا۔ آسمان سے اُترنے کے بعد نکاح کریں گے اور اولاد بھی ہوگی۔ یہی حلال میں اضافہ ہے۔ خنزیر خوری اور صلیب پرستی کا خاتمہ کریں گے، اور سب اہلِ کتاب اُن پر ایمان لائیں گے اس لئے حضور علیہ السّلام کو خاتم الانبیاء کہو، لیکن لا نبیّ بعدہٗ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے نزول سے انکار کی بنیاد پر نہ کہو۔ آپ کا مقصد لا نبی بعدہٗ کی نفی سے فقط یہ ہے کہ اس لفظ کو نزول عیسیٰ کی نفی کے معنی میں استعمال کرکے مت کہو باقی جدید نبوّت کی نفی میں حضرت صدیقہؓ خود نفی کی قائلہ ہیں کہ مسند احمد جلد۶ ص۱۲۹ میں آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً روایت کی ہے۔ لَا یَبْقٰی بَعْدِیْ مِنَ النُّبُوَّۃِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ قَای

اَلرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ۔ نیز روایت عائشہؓ مجہول الاسناد بھی ہے۔

حضرت علیؓ پر افترا۔ کہ آپ نے ابو عبد الرحمان السلمی استاذ حسنین کو کہا کہ اُن کو خاتم بالفتح پڑھاؤ۔ جواب ظاہر ہے کہ آپ کے ہاں یہی قرارت راجح تھی اور ہم نے مدلل بیان کیا ہے کہ معنی کے لحاظ سے قرارت فتح وکسرہ میں فرق نہیں۔ خود حضرت علی بندش نبوت کی حدیث کے راوی ہیں۔ بخاری ومسلم میں اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی اِلَّا اَنَّهٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ۔

شیخ اکبر پر افترا۔ شیخ اکبر نے ولی کے لئے نبوّت ثابت کی ہے۔ الجواب۔ صوفیہ کی اصطلاح میں نبوّت بمعنی لغوی یعنی انبار عن الغیب مطلقا وحیا او الہاما مراد ہے۔ وحی کو وہ شرع اور الہام کو غیر شرع کہتے ہیں ورنہ شیخ نبوّت شرعی کے دروازہ کو بند تسلیم کرتے ہیں۔ شیخ فتوحات مکیہ ج ۲ ص۴۹۵ میں لکھتے ہیں اِنَّ الرُّؤْیَا جُزْءٌ مِنْ اَجْزَاءِ النُّبُوَّةِ فَبَقِیَ لِلنَّاسِ فِی النُّبُوَّةِ هٰذَا وَغَیْرُهٗ وَمَعَ هٰذَا لَا یُطْلَقُ اِسْمُ النُّبُوَّةِ وَلَا النَّبِیِّ اِلَّا عَلَی الْمُشَرِّعِ (اَیْ صَاحِبِ الْوَحْیِ) خَاصَةً۔ اور ص۵۶۸ میں لکھتے ہیں۔ فَمَا تُطْلَقُ النُّبُوَّةُ اِلَّا لِمَنْ اتَّصَفَ بِالْمَجْمُوْعِ فَذَالِكَ النَّبِیُّ وَتِلْكَ النُّبُوَّةُ حُجِرَتْ عَلَیْنَا وَانْقَطَعَتْ ونقل عنہ فی الیواقیت ج ۲ ص۳۷ طبع معہ هذا باب اغلق بعد موت محمد لا یفتح لاحد الی یوم القیامة لکن بقی للاولیا وحی الالهام الذی لا تشریع فیه۔

امام راغب پر افترا۔ بحر المحیط ج ۳ ص۲۸۷ پر امام راغب کی طرف منسوب ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ارباب اطاعت میں نبی نبیوں کے ساتھ شامل ہوں گے۔ مراد انبیار سابقین ہیں کیونکہ امام موصوف نے ختمِ نبوّت کی تصریح کی ہے چنانچہ معنی ختمِ نبوّت کے تحت لکھتے ہیں اَنَّهٗ خَاتِمُ النَّبِیِّیْنَ لِاَنَّهٗ خَتَمَ النُّبُوَّةَ اَیْ تَمَّمَهَا بِمَجِیْئِهٖ۔

جلال الدین رُومی پر افترا۔ ؎ فکر کن در راہ نیکو خدمتے۔ تا نبوّت یابی اندر اُمّتے۔

اس سے مقصود وہ قربِ الٰہی ہے جو فیضِ نبوت سے حاصل ہوتا ہے۔ خود نبوت مراد نہیں کیونکہ رومی خود ختمِ نبوت کے قائل ہیں، دفتر پنجم میں ہے۔

یا رسول اللہ رسالت را تمام ۔ تو نمودی ہمچو شمس بے غمام

دفتر چہارم میں ہے۔

ایں ہمہ افکار کفران زاد شان ۔ چوں در آمد سیدِ آخر زمان

علامہ قاری پر افترا: موضوعاتِ کبیر ص۵۸ میں حدیث لَوْ عَاشَ اِبْرَاهِيْمُ لَكَانَ نبیا قُلْتُ مَعَ هٰذَا اَیِ الضُّعْفِ لَوْ عَاشَ اِبْرَاهِيْمُ وَصَارَ نَبِيًّا وَكَذَا لَوْصَارَ عُمَرُ نَبِيًّا لَكَانَ مِنْ اَتْبَاعِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَعِيْسٰى وَخِضَرٍ وَاِلْيَاسَ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ فَلَا يُنَاقِضُ قَوْلَهٗ وَخَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ اِذِ الْمَعْنٰى لَوْ يَاتِيْ نَبِيٌّ بَعْدَهٗ يَنْسَخُ مِلَّتَهٗ وَلَمْ يَكُنْ مِنْ اُمَّتِهٖ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ابراہیم اور عمر کی نبوت اگر ہوتی تو عہدِ نبوت میں ہوتی نہ بعد زمانے میں اور عیسیٰ، خضر و الیاس علیہم السلام اگر آئیں تو وہ پرانے ہیں نئے نہیں لہٰذا وہ بحیثیت اُمتی آئیں گے۔ خود علامہ قاری نے شرح شمائل باب اوّل ص۳۳ میں یہی فرمایا ہے۔ اَنَّهٗ خَتَمَهُمْ اَیْ جَاءَ اٰخِرَهُمْ فَلَا نَبِيَّ بَعْدَهٗ اَیْ لَا يُنَبَّاءُ اَحَدٌ بَعْدُ فَلَا يُنَافِيْ نُزُوْلَ عِيْسٰى مُتَابِعًا شَرِيْعَتَهٗ مُسْتَمِدًّا مِنَ الْقُرْاٰنِ وَالسُّنَّةِ وَقَالَ فِي الْمِرْقَاتِ (ج ۵ ص۳۷۶) اَلْمُقَفِّیْ اِمن قَفَا اَثَرَهٗ اِذَا تَبِعَهٗ يَعْنِيْ اَنَّهٗ اٰخِرُ الْاَنْبِيَاءِ الْاٰتِيْ عَلٰى اٰخِرِهِمْ لَا نَبِيَّ بَعْدَهٗ وَقَالَ فِيْ شَرْحِ الْفِقْهِ الْاَكْبَرِ (المجتبائی ص۲۰۲) وَدَعْوَى النُّبُوَّةِ بَعْدَ نَبِيِّنَا كُفْرٌ بِالْاِجْمَاعِ۔ نیز لَوْ عَاشَ اِبْرَاهِيْمُ صِدِّيْقًا نَبِيًّا ابن ماجہ کی روایت ہے اس میں ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان ساقط راوی ہے (تہذیب التہذیب)۔ صحیح حدیث بخاری کی یہ ہے۔ لَوْ قُضِیَ اَنْ يَكُوْنَ بَعْدَ مُحَمَّدٍ نَبِيٌّ عَاشَ ابْنُهٗ وَلٰكِنْ لَا نَبِيَّ بَعْدَهٗ۔

امام ربانی مجدد الف ثانی پر افترا: امام ربانی کے مکتوبات ج ۱ مکتوب ۲۷۱ میں

حصول کمالات نبوّت مرتابعان را بطریق تبعیت و وراثت بعد از بعثت خاتم الرّسل علیہ وعلی جمیع الانبیاء والرسل الصلوٰۃ والتحیات منافی خاتمیت او نیست فلاتکن من الممترین ۔ اس عبارت سے مرزائیوں نے امام ربّانی کی طرف اجراء نبوت کو منسوب کیا حالانکہ آپ کا مقصد حصول کمالات بعض اجزاء نبوّت ہے ۔ اور بعض کا حصُول کُل کے حصول کو مستلزم نہیں ۔ امام موصوف خود دفتر دوم ص۴۴ حصہ ہفتم مکتوب ع۶۷ میں عقائد اہل السُّنت کے متعلق لکھتے ہیں ۔ وخاتم الانبیاء محمد رسول است وعیسیٰ علیہ السّلام کہ نزول خواہد نمود عمل بشریعت او خواہد کرد و بعنوان اُمّت او خواہد بود ۔ اور دفتر سوم حصہ ہشتم ص۳۴ و ص۳۵ مطبوعہ امرتسر تختی کلاں میں لکھتے ہیں ۔ اوّل انبیاء آدم علیہ السّلام و آخر ایشاں خاتم نبوت شان حضرت محمدؐ رسول اللہ است وعیسیٰ علیہ السّلام کہ از اسمان نزول خواہد فرمود متابعت شریعت خاتم الرسل خواہد نمود ۔ یہ تمام بیان مرزائیت کے خلاف ہے ختم نبوّت کے علاوہ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کا نزول من السماء مذکور ہے اور مجدّد کے متعلق مرزا شہادت القرآن پر لکھتے ہیں " یہ کہنا کہ مجدّد پر ایمان لانا فرض نہیں انحراف ہے کیونکہ اللہ فرماتا ہے ۔ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَالِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ ؁

شاہ ولی اللہ پر افتراء | تفہیمات الٰہیہ ج ۲ ص۷۲ تفہیم ۵۵ پر شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں

ختم به النّبيون اى لا يوجد من يامره الله سبحانه بالتشريع على النّاس ۔ جس سے مرزائیوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ حضور علیہ السّلام کے بعد صرف شرعی نبوّت بند ہے ۔ حالانکہ اس کی تشریح خود شاہ صاحب نے تفہیمات ج ۲ ص۷۲ میں کی ہے ۔ فرماتے ہیں، وَصَارَ خَاتَمَ هٰذِهِ الدَّوْرَةِ لَا يُمْكِنُ اَنْ يُّوْجَدَ بَعْدَهٗ نَبِيٌّ اور پھر ج تفہیم ۶۵ ص۱۳۷ میں فرماتے ہیں مُحَمَّدٌ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ لَا نَبِيَّ بَعْدَهٗ وَ دَعْوَتُهٗ عَامَّةٌ لِجَمِيْعِ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ وَهُوَ اَفْضَلُ الْاَنْبِيَاءِ بِهٰذِهِ الْخَاصَةِ وَ بِخَوَاصَ اُخْرٰى وَقَالَ فِي حُجَّةِ اللهِ فِي حَدِيْث بدء هٰذَا الْاَمْرِ نُبُوَّةٌ اَقُوْلُ

فَا لنُّبُوَّۃُ اِنْقَضَتْ بِوَفَاۃِ النَّبِیِّ عَلَیْہِ السَّلَامُ وَالْخِلَافَۃُ لَا سَیْفَ فِیْھَا بِمَقْتَلِ عُثْمَانَ وَالْخِلَافَۃُ بِشَھَادَۃِ عَلِیٍّ کَرَّمَ اللّٰہُ وَجْھَہٗ وَ خلع الْحَسَنُ ۔ اور فارسی ترجمہ میں لکھتے ہیں آیت خاتم النبیین کے متعلق نیست محمدؐ پدر ہیچ کس از مردمان شما ولیکن پیغمبر خدا و مُہر پیغمبران یعنے بعد ازوے ہیچ پیغمبر نباشد۔

مولانا محمد قاسمؒ پر افترا۔ ان کی طرف ختم زمانی کا انکار منسوب کیا گیا حالانکہ آپ فرماتے ہیں۔ اگر اطلاق اور عموم ہے تو خاتمیت زمانی ثابت ہے ورنہ تسلیم لزوم خاتمیت زمانی بدلالت التزامی ضرور ثابت ہے۔ ادھر تصریحات نبویؐ اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ ھَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی اِلَّا اَنَّہٗ لَا نَبِیَّ بَعْدَہٗ۔ جو بطرز مذکور لفظ خاتم النبیین سے ماخوذ ہے، اس باب میں کافی ہے کیونکہ یہ مضمون تواتر کو پہونچا۔ پھر اس پر اجماع بھی منعقد ہے گو الفاظ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ بسندِ تواتر منقول نہ ہو۔ پس یہ عدمِ تواتر الفاظ باوجود تواتر معنوی ایسا ہوگا، جیسے تواتر عدد رکعات فرائض وغیرہ۔ جیسے اس کا منکر کافر ہے ویسا اِس کا (لانبی بعدی) منکر بھی کافر ہے۔ تحذیر الناس ص۹ کتب خانہ امدادیہ، مناظر عجیبہ ص۳۹ میں لکھتے ہیں۔ خاتمیت زمانی اپنا دین ایمان ہے، ناحق کی تہمت کا البتہ کوئی علاج نہیں۔

مولانا عبدالحیؒ پر افترا۔ مولانا موصوف نے دافع الوساس فی اثر ابن عباس ص۲۹ پر لکھا ہے علماء اہل السنت بھی اس امر کی تصریح کرتے ہیں کہ آنحضرت کے عہد میں کوئی نبی صاحب شرع جدید نہیں ہو سکتا۔ جو نبی آپ کا ہم عصر ہوگا وہ متبع شریعتِ محمدیہ ہوگا پس بہ تقدیر بعثتِ محمدیہ عام ہے حالانکہ یہ مضمون زمین کے دیگر طبقات اور اُن کے انبیاء کے متعلق ہے جس کی وضاحت زجر الناس ص۸۴ پر آپ نے کی ہے۔ خَتْمُ نَبِیِّنَا حَقِیْقِیٌّ بِالنِّسْبَۃِ اِلٰی اَنْبِیَاءِ جَمِیْعِ الطَّبَقَاتِ بِمَعْنٰی اَنَّہٗ لَمْ یُعْطَی النُّبُوَّۃُ لِاَحَدٍ فِیْ طَبَقَۃٍ۔ اور مجموع الفتاوی ج ا ص۹۹ میں مولانا موصوف لکھتے ہیں۔ قَالَ اَبُوْشَکُوْرَ فِی التَّمْھِیْدِ اِعْلَمْ اَنَّ الْوَاجِبَ عَلٰی کُلِّ عَاقِلٍ اَنْ یَّعْتَقِدَ اَنَّ مُحَمَّدًا کَانَ رَسُوْلَ اللّٰہِ وَ الْاٰنَ

هُوَ رَسُوْلُ اللهِ وَكَانَ خَاتِمَ الْاَنْبِيَاءِ وَلَا يَجُوْزُ بَعْدَهٗ اَنْ يَّكُوْنَ اَحَدٌ نَبِيًّا وَمَنْ اَدَّعٰى النُّبُوَّةِ فِی زَمَانِنَا يَكُوْنُ كَافِرًا - اِن تصریحات سے کوئی کہہ سکتا ہے کہ آپ ختمِ نبوت کے منکر تھے۔

ختمِ نبوّت علاّمہ اقبال کی نظر میں | قادیانیت یہودی مذہب کا چربہ ہے۔ میرے نزدیک بہائیت قادیانیت سے زیادہ مخلص ہے کیونکہ وہ کھُلے طور پر اسلام سے باغی ہے لیکن مؤخر الذکر (قادیانیت) اسلام کے چند نہایت اہم اصولوں کو ظاہری طور پر قائم رکھتی ہے لیکن باطنی طور پر اسلام کی رُوح اور مقاصد کے لئے مُہلک ہے۔ اِس کا (قادیانی فرقے) حاسد خدا کا تصوّر کہ جس کے پاس دشمنوں کے لئے لاتعداد زلزلے اور بیماریاں ہوں اس کا (قادیانی فرقہ کا) نبی کے متعلق نجومی کا تخیّل اور اس کا روحِ مسیح کے تسلسل کا عقیدہ وغیرہ یہ تمام چیزیں اپنے اندر یہودیت کے اتنے عناصر رکھتی ہیں گویا یہ تحریک یہودیت کی طرف رجوع ہے۔ (حرفِ اقبال ص۱۲۳ مرتبہ لطیف احمد شروانی)

۲۔ اسلامی ایران میں موبدانہ اثر کے ماتحت ملحدانہ تحریکیں اُٹھیں اور اُنہوں نے بروز، حلول، ظل وغیرہ اصطلاحات وضع کیں تاکہ تناسخ کو اس تصوّر میں چھپا سکیں۔
ان اصطلاحات کا وضع کرنا اس لئے لازم تھا کہ وہ مسلم کے قلوب کو ناگوار نہ گذریں۔ حتیٰ کہ مسیح موعود کی اصطلاح بھی اسلامی نہیں بلکہ اجنبی ہے اور اس کا آغاز بھی اسی موبدانہ تصوّر میں ملتا ہے۔ یہ اصطلاح ہمیں اسلام کے دور اوّل کی تاریخی اور مذہبی ادب میں نہیں ملتی۔ (حرفِ اقبال ص۱۲۳، ص۱۲۴)

۳۔ قادیانی گروہ اسلامی وحدت کا دشمن ہے۔ مسلمان ان تحریکوں کے معاملہ میں زیادہ حسّاس ہیں جو اُن کی وحدت کے لئے خطرناک ہے۔ چنانچہ ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہو لیکن اپنی بناء نئی نبوّت پر رکھے اور بزعمِ خود اپنے الہامات پر اعتقاد نہ رکھنے والے تمام مسلمانوں کو کافر سمجھے، مسلمان اُسے اسلام کی وحدت کے لئے

ایک خطرہ تصور کرے گا اور یہ اس لئے کہ اسلامی وحدت ختمِ نبوّت سے استوار ہوتی ہے۔ (حرفِ اقبال ص۱۲۲) ——— مرزا محمود خلیفہ دوم آئینہ صداقت ص۳۵ پر لکھتے ہیں "کُل مسلمان جو حضرت مسیح موعود کی بیعت میں شامل نہیں خواہ انہوں نے مسیح موعود کا نام بھی نہیں سُنا وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں"۔

۴۔ میں اس باب میں کوئی شک اور شُبہ نہیں رکھتا کہ یہ احمدی اسلام اور مُلک دونوں کے غدّار ہیں۔ خط اقبال بنام جواہر لال مندرجہ بنام "کچھ پُرانے خطوط" حصہ اوّل ص۲۹۲ مرتبہ جواہر لال مطبوعہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی انڈیا۔

۵۔ میری رائے میں قادیانیوں کے لئے صرف دو راہیں ہیں یا وہ بہائیوں کی تقلید کریں یا پھر ختمِ نبوّت کی تاویلوں کو چھوڑ کر، اس کو اپنے پورے مفہوم کے ساتھ قبول کریں۔ ان کی جدید تاویلیں محض اس غرض سے ہیں کہ اُن کا شمار حلقۂ اسلام میں ہو تاکہ اُن کو سیاسی فوائد پہنچ سکیں۔ (حرفِ اقبال ص۱۳۶، ص۱۳۷)

۶۔ میری رائے میں حکومت کے لئے بہترین طریق کار یہ ہوگا کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کرے یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہوگا اور مسلمان ان سے رواداری سے کام لے گا جیسے وہ باقی مذاہب کے معاملہ میں اختیار کرتا ہے۔ یہ قادیانیوں کی پالیسی کے مطابق اس لئے ہے کہ مرزا البشیر الدین خلیفہ دوم کا خطبہ مندرجہ الفضل ۲۱ اگست ۱۹۱۷ء میں حضرت مسیح موعود فرماتے ہیں۔ اُن کا (مسلمانوں کا) اسلام اور ہے ہمارا اسلام اور، ان کا خدا اور ہے ہمارا خدا اور ہے، ان کا حج اور ہے ہمارا حج اور ہے، اسی طرح ان سے ہر بات میں اختلاف ہے۔

۷۔ علامہ اقبال کا انگریزی حکومت کو مشورہ۔ نئے دستور میں اقلیتوں کے تحفظ کا خیال رکھا گیا ہے۔ میرے خیال میں قادیانی حکومت سے کبھی علیحدگی کا مطالبہ کرنے میں پہل نہیں کریں گے۔ ملتِ اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے

اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہیں کیا تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیٰحدگی میں دیر کر رہی ہے۔ حکومت نے ۱۹۱۹ء میں سکھوں کی طرف سے علیٰحدگی کے مطالبہ کا انتظار نہ کیا اب وہ قادیانیوں سے ایسے مطالبہ کا کیوں انتظار کر رہی ہے۔ حرفِ اقبال ص۱۳۸ پر علامہ لکھتے ہیں۔ نماز میں قطع تعلق، نکاح وغیرہ کے معاملات میں مسلمانوں سے بائیکاٹ اور سب سے بڑھ کر یہ اعلان کہ دُنیائے اسلام کافر ہے وہ اسلام سے کہیں اِس سے دُور ہیں جتنے سکھ ہندوؤں سے کیونکہ سکھ ہندوؤں سے باہمی شادیاں کرتے۔ پھر جب قادیانی مذہبی معاشرتی معاملات میں علیٰحدگی اختیار کرتے ہیں۔ پھر وہ سیاسی طور پر مسلمانوں میں شامل رہنے کے لئے کیوں مضطرب ہیں (حرفِ اقبال ص۱۳۸)

۸۔ پابندی باغی جماعت پر لگانی چاہیئے۔ علامہ اقبال انگریزی حکومت کو لکھتے ہیں۔ اگر کسی قوم کی وحدت خطرے میں ہو تو اس کے لئے اِس کے سوا چارہ کار نہیں کہ وہ معاندانہ قوتوں کے خلاف مدافعت کرے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مدافعت کا کیا طریقہ ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ اصل جماعت کو رواداری کی تلقین کی جائے حالانکہ اس کی وحدت خطرہ میں ہو اور باغی گروہ کو تبلیغ کی پوری اجازت ہو۔ اگرچہ وہ تبلیغ جھوٹ اور دشنام سے لبریز ہو۔ (حرفِ اقبال ص۱۲۶) میں کہتا ہوں کہ مرزا کی یہ ایک گالی کروڑوں گالیوں سے زیادہ ہے۔ وہ آئینہ کمالات ص۵۴۸ میں لکھتے ہیں۔ جو لوگ مجھے نہیں مانتے اور میرے دعویٰ پر ایمان اور تصدیق نہیں رکھتے۔ وہ سب زنا کی اولاد ہے۔

قیامت، معاد اور مجازاتِ اعمال

اسمار القیامۃ

جس چیز کے نام کثیر التعداد ہوں تو یہ اس کی عظمت کی دلیل ہے۔ اللہ جل جلالہ کے نام بہت ہیں جو مسمی کے معظم ہونے کی دلیل ہیں۔ امام سیوطیؒ نے بدور السافرۃ فی امور الآخرۃ میں روز قیامت کے اسّی ۸۰ اسمار ذکر کئے ہیں۔ (صفحہ ۲۸۴ مطبوعہ کانشی رام لاہور) ہم اُن میں سے صریح مشہور اسمار کو ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ السّاعۃ | یہ قیامت کا نام ہے دو ۲ وجہ سے۔ ایک اس وجہ سے کہ قیامت اچانک آئیگی۔ جیسے ایک گھنٹہ گذر جانے کے بعد اچانک دوسرا گھنٹہ آجاتا ہے۔ دوم اس وجہ سے کہ قیامت میں اوّلین آخرین کا حساب تھوڑے وقت مثلاً ایک گھنٹہ میں ختم ہو جائے گا۔ یہی سریع الحساب ہونے کا معنی ہے۔ یہی معنی حضرت علیؓ سے منقول ہے۔ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا (الحج آیۃ ۷)

۲۔ القیامۃ | كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ۔ (آل عمران آیۃ ۱۸۴)۔ اس نام کی وجہ یہ ہے کہ قیامت کھڑے ہونے کا نام ہے اور اس دن میں تمام لوگ اور ملائکہ اور روح، اللہ کے آگے کھڑے ہوں گے جب تک اللہ چاہے۔

۳۔ القارعۃ | قرعہ دل کو لرزانے اور کھٹکھٹانے کا نام ہے۔ یہ دن اپنی ہیبت ناکیوں سے دلوں کو خوف زدہ کر دے گا۔ اَلْقَارِعَةُ مَا الْقَارِعَةُ۔

۴۔ الحاقۃ | یہ حق سے ماخوذ ہے۔ اس نام میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ یہ دن حق ہے اور اس میں شک و شبہہ کی گنجائش نہیں۔

۵۔ الواقعہ | وقوع سے ماخوذ یعنی اس دن کے واقع ہونے میں شُبہہ نہیں، بلکہ حقیقتِ واقعیہ ہے۔ یہ دونوں نام بالترتیب اَلْحَآقَّةُ مَا الْحَآقَّةُ ۔ اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ میں مذکور ہے۔

۶۔ الغاشیۃ | هَلْ اَتٰكَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَةِ ؕ غشی کے معنی چھپانے کے ہیں۔ یہ دن اپنی ہیبت ناکیوں سے دلوں کو چھپالے گا اور لوگ حواس باختہ ہو جائیں گے۔

۷۔ آزفۃ | ازفة الازفة لیس لها من دون الله کاشفه ۔ آزف قریب ہونے کو کہتے ہیں۔ ازف الشئ قرب اور یہ دن حقیقت کے اعتبار سے قریب ہے کہ آنے والی چیز قریب ہوتی ہے اور جانے والی چیز بعید ہوتی ہے۔ نیز موت قیامت کا دروازہ ہے اور موت قریب ہے۔

۸۔ یوم التغابن | غبن دھوکہ کو کہتے ہیں۔ اس دن یہ امر ظاہر ہوگا کہ حیات دنیا میں کونسے لوگ دھوکہ میں مبتلا رہے۔ جنہوں نے عمر عزیز کا قیمتی حصّہ کن مضر چیزوں میں گنوایا اور کن قیمتی اعمال سے محروم رہے۔ ذٰلِكَ یَوْمُ التَّغَابُن ۔

۹۔ خافضۃ | یعنی پست کرنے والا دن کہ دین سے برگشتہ افراد جہنّم کی پست ترین ذلّت میں اُس دن پہنچیں گے۔

۱۰۔ رافعہ | بلند کرنے والا دن ۔ جن لوگوں نے دنیا کی زندگی میں دین کا اہتمام کیا ہے وہ اس دن جنت کے بلند مقام کی شہنشاہیت سے نوازیں جائیں گے۔ خافضة رافعة، طامة الکبریٰ - فاذا جاءت الطامة الکبریٰ ۔ طامۃ الکبریٰ بڑے ہنگامے کا نام ہے قیامت سے بڑا ہنگامہ ممکن نہیں جس میں تمام انسانوں کی قسمت کا ابدی فیصلہ ہوگا۔

قیامت اور حشر و نشر انسانی زندگی کا اہم شعبہ ہے جس پر دائمی تباہی یا خوش حالی کا مدار ہے۔ قیامت کے متعلق تین امور قابلِ غور ہیں۔

۱۔ قیامت کا وجود جس کو ہم صورتِ قیامت سے تعبیر کرتے ہیں۔

۲۔ مقصد قیامت یعنی مجازاۃ اعمال جس کو ہم روح قیامت سے تعبیر کرتے ہیں۔

۳۔ تفصیلات قیامت مثلاً کیفیت قیامت، وزن اعمال حوض، عبور صراط و نور دوزخ و جنت وغیرہ۔

سب سے پہلے ہم صورتِ قیامت و معاد کا ذکر کرتے ہیں اور اُن کے عقلی و نقلی دلائل پیش کرتے ہیں۔

معاد اور قیامت کا ثبوت نقلی

۱۔ تمام سماوی ادیان قیامت اور مُردوں کے دوبارہ زندہ کئے جانے پر متفق ہیں اور تمام ملل سماوی اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ شرح مواقف ج ۸ صفحہ ۲۹۴ میں یہ نقل موجود ہے۔ اَجْمَعَ اَهْلُ الْمِلَلِ وَالشَّرَائِعِ عَنْ آخِرِهِمْ عَلٰی جَوَازِهٖ وَوُقُوْعِهٖ یعنی تمام اہل ملت و شریعت حشر اجساد کے جواز اور وقوع پر متفق ہیں۔

۲۔ خود تمام آسمانی کتابوں میں قیامت کا تذکرہ موجود ہے۔

۳۔ تمام انبیاء علیہم السلام جن سے بڑھ کر صادق اور راست باز اولاد آدم میں نہیں، وہ سب قیامت کی خبر دیتے رہے ہیں۔ قرآن نے قیامت کا بیان نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے پھر مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ فرمایا یعنی قرآن گذشتہ آسمانی کتابوں کے اصول و عقائد کی تصدیق کرتا ہے۔ جس سے ثابت ہوا کہ قرآن نبوت و قیامت و مجازات اعمال وغیرہ امور میں سابق تعلیمات کتب سماویہ کا مصدّق ہے۔ قیامت کے بعد آخرت کی زندگی دنیا کی زندگی سے بڑھ کر اور پائیدار ہے۔ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى۔ اُخروی زندگی بہتر اور پائیدار ہے۔ پھر فرمایا۔ اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۙ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى۔ یہ مضمون حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں میں موجود ہے۔

تردیدِ انکارِ فلاسفہ فلاسفہ نے حشر اجساد کا انکار کیا ہے لیکن مجازاۃ اعمال کو وہ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ بعض بہ شکل سعادت و شقاوت رُوحانی اور بعض بشکل تناسخ ارواح جس کی ہم آگے چل کر تردید کریں گے۔ فلاسفہ کا انکار خود اُن کے قواعد فلسفہ کے تحت بھی مردود ہے کیونکہ وہ ہر ممکن کو تحت القدرت تسلیم کرتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ حشر اجساد کے ممکنات سے ہے۔

حشر میں ایک جز روح انسانی ہے دوم ذرات بدن سوم تالیف اور ہیئت ترکیبیہ اور یہ تینوں اشیاء از قسم ممکن داخل قدرت الہیہ ہیں۔ کیونکہ یہ تینوں چیزیں موت سے قبل اللہ کے ایجاد سے موجود ہوئی تھیں۔ اگر غیر ممکن اور ممتنع ہوتیں تو پہلی مرتبہ بھی وجود میں نہ آتیں۔ اب دوبارہ موجود ہونا تو زیادہ عقل کو قریب ہے۔ اسی کو قرآن نے بیان کیا۔ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ؕ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ۔ (الروم - ۳) یعنی دوبارہ پیدا کرنا انسانی قدرت کے قاعدہ سے زیادہ آسان ہے پہلی بار سے۔ اگرچہ اللہ بہت بلند ہے لہٰذا اس کے اعتبار سے دونوں تخلیقوں میں کچھ فرق نہیں۔

شبہہ اعادہ معدوم | فلاسفہ کا انکار اس شبہہ پر مبنی ہے کہ وجود اوّل و دوم ایک ہے اور عدم دو مغائر چیزوں میں آتا ہے لہٰذا معدوم کا بعینہٖ اعادہ نہیں ہوتا اور قیامت میں سابق معدوم کا بعینہٖ اعادہ ہے۔ یہ شبہہ بالکل باطل ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ اوّل وجود کا زمانہ اور ہے اور دوم وجود کا اور۔ لہٰذا زمان اوّل کا وجود ختم ہوا اور دوسرے زمانے میں اُس نے وجود پایا جو بعینہٖ پہلی چیز کا وجود ہے۔ جو وجود پہلے زمانہ میں آسکتا ہے وہ معدوم ہو کر دوسرے زمانے میں کیوں نہیں آسکتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ زمانہ بدل جانے سے بعینہٖ پہلی چیز کا اعادہ نہیں ہوا کیونکہ پہلی چیز کی شخصیت کا جزو وہ زمانہ تھا جو نہیں لوٹایا گیا، تو یہ غلط ہے کیونکہ زمانہ مشخص نہیں اس لئے اس کی تبدیلی سے شخصیت نہیں بدلتی ورنہ کل کا آدمی آج کے دن میں پہلا شخص نہیں کہلائے گا کیونکہ کل اور آج کے زمانہ میں فرق ہے۔ باقی اعادہ معدوم کے استحالہ اور زمانے سے شخصیت کی تبدیلی کی غلطی ہم ایک مثال سے سمجھاتے ہیں۔ ایک انسان کا وجود اوّل زمانہ میں ہونا اور پھر موت کے ذریعہ معدوم ہو کر قیامت کے دوسرے زمانہ میں موجود ہونا، اس کو ایسا سمجھو کہ ایک آدمی لاہور سے کراچی چلا جائے گویا اس کا پہلا مکان لاہور تھا، اس سے گم ہو کر دوسرے مکان میں موجود ہوا، اور درمیانی وقت میں لاہور سے چلا ہے اور کراچی نہیں پہنچا۔ یہ اُس کے لئے دونوں شہروں میں معدوم ہونے کا زمانہ ہے۔ تو ایسا ہونے

میں کیا محال لازم آتا ہے۔ انسان مر کر پہلے زمانہ میں معدوم ہؤا اور آخرت نہ پہنچنے کی حالت میں آخرت سے بھی معدوم ہے اور آخرت آنے پر وہاں دوبارہ موجود ہؤا کیوں کہ زمان سے عدم اور مکان سے عدم میں کوئی فرق نہیں۔ گویا لاہور کو وجودِ انسان کے لئے مانند دنیوی وجود سمجھو اور قیامت اور آخرت کے وجود کو بمثل وجود در کراچی اور درمیان میں قطع مسافت کے وقت اس کی جو حالت ہے کہ اس وقت وہ نہ لاہور میں ہے اور نہ کراچی میں، اُس کو عالمِ برزخ اور قبر کی حالت کی طرح سمجھیں کہ مُردگان نہ دنیا میں ہیں نہ آخرت میں۔ اسی طرح اگر زمانے کی تبدیلی سے دنیا کا شخص وہ نہیں رہا ہے جو قیامت میں زندہ کیا گیا کیونکہ زمانے کا فرق ہے تو یہ دوؔ وجہ سے غلط ہے۔ ایک اس وجہ سے کہ زمانے سے اگر شخصیت بدلتی ہے تو مکان کی تبدیلی سے بھی شخصیت بدل جائے گی۔ لہٰذا جو شخص لاہور میں ہے اگر وہ مُلتان آجائے تو وہ دوسرا آدمی ہوگا پہلا نہ ہوگا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وحدت کا مدار اجزاء اصلیہ اور روح کی وحدت پر ہے۔ اس کے علاوہ اگر کچھ فرق ہو تو اس سے عرفاً شخصیت نہیں بدلتی۔ مثلاً اگر کسی آدمی کا رنگ پہلے سفید ہو پھر گرم ملک میں دھوپ میں کام کرنے کی وجہ سے اس کا رنگ سیاہ ہو جائے تو سفیدی و سیاہی کے فرق کے باوجود شخص ایک ہی رہے گا اُس کو کوئی قانون دو قرار نہیں دے سکتا۔ اسی طرح اگر ایک آدمی جس کی عمر پندرہ [15] سال ہو وہ تیس [30] سال کا ہو جائے تو رنگ و رُوپ اور طول و عرض کا فرق ناگزیر ہے لیکن پھر بھی وہ یک ہی شخص قانوناً کہلائے گا۔ کوئی حکومت اُس کی تنخواہ کی ادائیگی سے یہ کہہ کر انکار نہیں کریگی کہ جس عمر میں تیرا تقرر ہؤا اب کُچھ تبدیلی ہوئی لہٰذا تم دوسرے شخص ہونے کیوجہ سے تنخواہ کے حق دار نہیں اور نہ لمبے مقدمہ میں کوئی عدالت یہ کہہ کر اُس کا مقدمہ خارج کریگی کہ تم بدل گئے ہو اب تم سابق مدعی نہیں رہے۔ اسی طرح اعمال نیک و بد کی وجہ سے اجزاء اصلیہ کی وحدت کے باوجود اگر رنگ و رُوپ کا قیامت میں کچھ فرق ہو تو آدمی بعینہ وہی کہلائے گا۔

المذاہب فی المعاد

رُوح کے متعلق دو رائے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ جسمِ لطیف ہے دوم یہ کہ وہ مجرد اور غیر مادی ہے۔ اب اِسی اختلاف کے تحت معاد کے سلسلے میں شرح مواقف مصری ج ۸ ص ۲۹۷ کی نقل کے مطابق پانچ اقوال ہیں۔

۱۔ معاد صرف جسمانی ہے کیونکہ بدن کی طرح رُوح انسانی بھی جسم ہے لہٰذا صرف جسم ہی کا اعادہ ہے۔ کثیف جسم بدن اور لطیف جسم روح کا اعادہ ہے یہ اکثر متکلمینِ اسلام کا قول ہے۔ جو روح کو مجرّد نہیں مانتے۔

۲۔ معاد صرف رُوحانی ہے یعنی جسم کا اعادہ نہیں۔ صرف رُوح مجرد ہی مدار سعادت و شقاوت ہے۔ یہ یونان کے فلاسفہ الٰہیین کا قول ہے۔

۳۔ معاد جسمانی و روحانی دونوں ہیں۔ بدن کا اعادہ جسمانی اعادہ ہے اور روح مجرّد کا اعادہ رُوحانی اعادہ ہے۔ تو معاد جسمانی بھی ہوا اور رُوحانی بھی۔ یہ حلیمیؔ، غزالیؔ، ابوزیدؔ، دلوسیؔ راغبؔ معمر اور متاخرین امامیہ اور اکثر صوفیاء کا قول ہے۔ یعنی یہ سب حضرات رُوح کو مجرّد مانتے ہیں۔

۴۔ معاد نہ جسمانی ہوگا نہ رُوحانی۔ یہ یونان کے حکماء الٰہیین کا قول ہے۔

۵۔ نفی اور اثبات معاد دونوں میں توقف ہے۔ یہ جالینوس کا قول ہے۔ ان کو اس میں شبہہ ہے کہ روح مزاج منعدم بالموت کا نام ہے یا جوہر باقی بعد الموت کا۔

ان پانچ اقوال کا تعلق صرف بدنِ انسانی اور روحِ انسانی کے ساتھ ہے لیکن یہاں ایک چھٹا قول مجازاۃ کے سلسلے میں تناسخِ ارواح کا ہے۔ جو حکماء ہند اور بعض حکماء یونان اور بعض منسوب الی الاسلام حضرات کا قول ہے۔ مثلاً احمد بن حابط جو ابراہیم نظام کا شاگرد ہے ابومسلم خراسانی، محمد بن زکریا طبیب رازی اور قرامطہ کا ہے۔

مجازاۃ کی تین شکلیں | دیکھو اخیر کے لئے ملل نحل ابن حزم ج۱ صن۹۰ ۔ اب مجازاۃ اعمال کی شکلیں تین ہوئیں ۔ ۱۔ اہلِ اسلام اور مللِ سماویہ کی رائے ہے کہ حشر اجساد اور بعث بعد الموت کی شکل میں مجازاۃ بہ شکل جنت و دوزخ ہوگی ۔

۲۔ بغیر حشر اجساد کے روح کا نیکی و بدی کے اثر، لذّت والم کو محسوس کرنا مجازاۃ ہے۔ جو حکماء الہیین کا قول ہے ۔

۳۔ اعمال گذشتہ نیک و بد کے مطابق ارواح کا انسان اور حیوان کے قالب میں بغرض مجازاۃ منتقل ہونا مجازاۃ ہے ۔ یہ بعض حکماء یونان اور اکثر حکماء ہند کا قول ہے ۔

تنقید | اخیر کے دو قول اجماع انبیاء علیہم السّلام اور کتبِ سماویہ کے خلاف ہیں اور عقل و فلسفہ کی بنیاد پر بھی غلط ہے ۔ روحانی مجازاۃ تو اس لئے غلط ہے کہ اعمال میں بدن اور روح دونوں شریک ہیں اور مجازاۃِ روحانی کا تعلق تو صرف روح سے ہے ، نہ بدن سے ۔ کوئی نیکی ہو ، مثلاً نماز یا بدی ہو مثلاً قتل ، نہ اس کو صرف روح کر سکتی ہے اور نہ صرف بدن کر سکتا ہے ، بلکہ دونوں کی شرکت سے ہوتی ہے ۔ لہٰذا نیکی و بدی کے نتائج میں بھی دونوں کی شمولیت ضروری ہے جیسی اسلامی مجازاۃ اعمال میں ہے کہ روح اور بدن کو مِلا کر زندہ کرنا ہے ، اِس کے بعد جنت و دوزخ کی شکل میں دونوں کو جزاء دینا ہے لیکن صرف روح پر مدار جزاء رکھنا جیسے قولِ دوم یا سوم کا مفہوم ہے غلط ہے ۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی انار کے باغ میں چوری کی غرض سے دو آدمی جا کر انار توڑ کر جمع کر لیں ۔ ان میں سے ایک اندھا ہو اور دوسرا لنگڑا ہو ۔ اندھا انار کو پہونچ تو سکتا ہے لیکن پکے اور کچے انار کا فرق نہیں کر سکتا ہے کہ بینائی سے محروم ہے اور لنگڑا فرق تو کر سکتا ہے لیکن لنگڑاہٹ کی وجہ سے پہونچ نہیں سکتا ۔ اب یہ دونوں طے کرتے ہیں کہ اندھا لنگڑے کو کندھے پر سوار کر کے اُس سے انار پر پہونچا کر پکا انار تڑواتا ہے کہ اچانک مالک باغ دونوں کو پکڑ عدالت میں پیش کرتا ہے ۔ عدالت میں ہر ایک اپنی برأت کے لئے دلیل پیش کرتا ہے ۔ اندھا کہتا ہے کہ میں نے چوری نہیں کی کہ میں تو دیکھتا نہیں اور لنگڑا کہتا ہے کہ

میں نے چوری نہیں کی کہ میں تو پہونچ نہیں سکتا۔ ایسی صورت میں یقیناً عدالت کا فیصلہ یہ ہوگا کہ یہ چوری دونوں نے مُشترک طور پر کی ہے لہٰذا سزا بھی دونوں کو دینا چاہیئے۔ یہی حال اعمالِ نیک و بد کے بارہ میں جسم و رُوح کا ہے کہ صرف ایک کافی نہیں جب تک دونوں نہ ہوں۔ لہٰذا جزار بھی دونوں کی شرکت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ روحانی مجازاۃ کی حقیقت ایک خوابیدہ شخص کے اچھے یا بُرے خواب کی طرح ہے کہ اچھے خواب میں احساسِ مسرت اور بُرے خواب میں احساسِ دُکھ ہوتا ہے اور اسی درجے کی دکھ یا سُکھ کا احساس اصلاح بشری کے لئے کافی نہیں۔ جزار کے لئے یہ ضروری ہے کہ فوت شدہ فائدہ کے مقابلہ میں قوی تر فائدہ ہو مثلاً ایک آدمی کے پاس کسی یتیم کے باپ نے دس ہزار کی رقم امانت رکھی ہے جس کا یتیم کو علم نہیں اور نہ تحریری یا شہادتی ثبوت ہے۔ ایسی صورت میں اس شخص کو جزار امانت کی امید پر یتیم کو اُس کے والد کی دس ہزار کی رقم کو حوالہ کرنا دس ہزار کا فائدہ کھو دیتا ہے اور اس رقم سے جو جو لذتیں وہ حاصل کر سکتا تھا اس سے دستبردار ہوتا ہے اور ایسی قربانی کے لئے تیار ہونے کا محرک وہی جزاء ہو سکتا ہے جو دس ہزار روپے سے لاکھ گنا زائد قیمتی اور کروڑ گنا سے زیادہ پائیدار ہو مثلاً جنّت۔ نہ یہ کہ دس ہزار کی امانت ادا کرنے میں بعد از موت صرف اس کو اچھا تصوّر نصیب ہو۔

ردِ تناسخ | مجازاۃ بشکلِ تناسخ بھی بوجوہات ذیل عقلاً درست نہیں۔

۱۔ تناسخ انصاف کے خلاف ہے کیونکہ تناسخی مجازاۃ کا تعلق صرف روح سے ہے، بدن اس میں شریک نہیں۔ مثلاً ایک مجرم انسان کی رُوح اگر مرنے کے بعد کسی بھنگی کے بچے کی قالب میں ڈال کر اُس کو بھنگی کے گھر میں یا کسی ذلیل جانور میں ڈال کر اُس کو جرم کی سزا دی جائے تو اس سزا میں اُس مجرم انسان کا بدن شریک نہیں بلکہ سزا صرف روح کو دی گئی کہ اس کو انسان ذلیل یا حیوان کے حقیر قالبوں میں ڈال کر زحمت دی گئی حالانکہ جرم میں رُوح کے ساتھ مجرم کا بدن بھی شریک رہا ہے یہ خیال نہ کیا جاتے کہ بدن روح کے لئے صرف جرم کرنے کا آلہ ہے اس لئے

جزاء میں شریک کرنا ضروری نہیں۔ مثلاً جیسے تلوار یا بندوق قاتل کے لئے آلہ ہے اس لئے اُس کو جزاء سے خارج سمجھا گیا جیسے قاتل کو سزا دی جاتی ہے لیکن اُس کے تلوار اور بندوق کو سزا نہیں دی جاتی ہے یہ غلط ہے کیونکہ بدن آلہ جرم کی حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ آلہ فعل نہیں خود فاعل ہے۔ آلہ مثلاً تلوار فاعل یعنی قاتل سے بالکل جُدا اور منفصل وجود رکھتا ہے۔ لیکن رُوح و بدن میں مکمل اتصال اور بدن کے ہر حصّہ میں روح سرایت کی ہوئی ہے۔ دوم یہ کہ تلوار قاتل میں تاثر باہمی نہیں قاتل کے غم یا خوشی سے تلوار پر کوئی اثر نہیں پڑتا لیکن رُوح کے غم اور خوشی سے بدن متاثر ہوتا ہے۔

۲۔ یہ تصوّر تناسخ کی صحت کی دلیل نہیں کہ انسان حیوانات سے کام لیتا ہے اِس لئے حیوانات کے اندر جو روحیں ہیں اُنہوں نے انسانی قالبوں میں رہ کر کوئی جُرم کیا ہے جس کی سزا میں اُن کو حیوانی ذِلّت نصیب ہوئی ہے یا کم درجے اور غریب انسانوں کی رُوحوں نے اس سے پہلے انسانی قالب میں کوئی جُرم کیا تھا جس کی سزا میں اُن کو غریب گھرانے میں لوٹا کر اس جرم کی سزا میں مبتلاء مصائب کیا۔ کیونکہ حیوانات کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ان سے کام لے جس کے لئے جرم سابق کا وجود ضروری نہیں کیونکہ اس کے بغیر نظامِ عالم چل نہیں سکتا اور نہ حیوانات کے وجود کی حکمت نمایاں ہوسکتی ہے بلکہ اگر انسان اس سے کام نہ لے، تو حیوانات کا وجود لغو اور بے کار ٹھہرے گا جو خدائے حکیم کی شان کے خلاف ہے۔ اِسی طرح انسانوں کی خوش حالی اور بدحالی تقاضاء فطرت ہے کہ غنی فقیر سے کام لے اور غنی اُس کو اُجرت دے۔ غنی فقیر اور غریب کے عمل کا محتاج ہے اور غریب امیر کی اُجرت کا، اور اِسی احتیاجِ باہمی سے انسانی تمدّن کا ربط قائم ہے۔ ورنہ انسانی تمدّن کا شیرازہ بکھر جائیگا اِسی طرح امراض اور مصائبِ دنیا بھی حکمت سے خالی نہیں تاکہ صحت کی حالت میں شُکر کا جذبہ اور مصیبت اور مرض کی حالت میں صبر کا جذبہ ظہور میں آکر انسانی کمالات کے ظہور کا موجب بنے۔

۲۔ **تناسخی مجازاۃ میں جرم کا علم نہیں** اگر تناسخی مجازات کو تسلیم کیا جاتے تو سزا لہ مجرم کے لئے تحقیق جرم اور مجرم کے لئے اپنے جرم اور اُسکی سزا کا علم ضروری ہے جیسے دُنیا کی عدالتوں میں مروّج ہے۔ لیکن کسی حیوانی رُوح کو یہ پتہ نہیں کہ اُس نے سابق کونسا جرم کیا ہے اور اُس کو کس جُرم کی سزا میں حیوان کی قالب میں ڈالا گیا ہے لہذا تناسخ نامعقول ہے۔

۳۔ **تعداد موت و ولادت کا تفاوت تردید تناسخ ہے** اگر حیوانات کی پیدائش انسانی رُوحوں کو بسبب جرائم کے حیوانی قالبوں میں ڈالنے کا نتیجہ ہے جیسے تناسخ والوں کا خیال ہے تو چاہیئے کہ جتنے مجرم اور گناہ گار انسان مرجائیں بعینہٖ اتنی تعداد میں حیوانات کی پیدائش ہو کیونکہ ابھی فوت شدہ مجرم انسانوں کی رُوحوں کی حیوانات کی قالب میں پڑنے سے اُن کی تعداد کے موافق حیوانات کی حیات و پیدائش کا حاصل ہونا ضروری ہے لیکن اگر کسی دِن ایک لاکھ انسان مرتے ہیں جن میں نصف یا کچھ زیادہ مجرم ہوتے ہیں تو اُسی تعداد کے مطابق کیڑے مکوڑے اور دیگر حیوانات پیدا نہیں ہوتے بلکہ کروڑوں، اربوں حیوانات ایک دن میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حیوانات کی پیدائش مجرم روحوں کی تناسخی چکر اور گردش کا نتیجہ نہیں بلکہ ابتدائی تخلیق کے طور پر حیوانات پیدا ہوتے ہیں اس لئے نظریہ تناسخ غلط ٹھہرا۔

۴۔ تناسخ کی تردید کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اگر تناسخ مان لیا جائے تو انسان اور حیوانات کی روحوں کی وحدت کا قائل ہونا پڑیگا کہ درحقیقت حیوانات کی رُوحیں بھی انسانی رُوحیں ہیں جو جُرم کے سبب سے حیوانات کی قالب میں آئی ہیں لیکن دونوں رُوحوں کا مختلف ہونا ظاہر ہے، کہ انسانی روحیں عاقل و ناطق ہیں لیکن حیوانی رُوحیں ایسی نہیں۔ دوّم یہ کہ اگر بلی میں مثلاً انسانی رُوح ہے تو انسانی قالب میں اُس کو چوہا کھانے سے نفرت تھی تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ بلی کی قالب میں وہی چوہا کھانے سے نفرت کرنے والی رُوح یکدم اپنی فطری نفرت چھوڑ کر چوہے کے پیچھے دوڑنے پر آمادہ ہوگئی۔ یہ فوری انقلاب فطرت نامعقول ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ حیوان کی روح جداگانہ فطرت رکھتی ہے جو انسانی رُوح سے مختلف ہے۔ اِس لئے تناسخ

غلط ہے۔

جب مجازاۃ اعمال کی دو شکلیں صرف رُوحانی معاد اور تناسخی ہوکر باطل اور نامعقول قرار پاگئیں تو حق شکل مجازاۃ کی ایک باقی رہ گئی۔ وہ یہ کہ مُردوں کے ذرّاتِ بدن کو مجتمع کرکے بدن تیار ہو اور ان میں اُن کی رُوحوں کو ڈال کر زندہ کرکے مجازاۃ اعمال کے لئے عدالت الٰہیہ میں پیش کرکے دوزخ و جنت کی شکل میں اُن پر قانون مجازاۃ کو نافذ کیا جائے جو نہ صرف بلحاظ نقل تمام شرائع سماویہ اور انبیاء کرام کے تواتر سے ثابت ہے بلکہ عقل و فلسفہ کے لحاظ سے بھی موزون و معقول ہے اور اس میں کوئی استبعاد نہیں۔ بظاہر اسلامی مجازاۃ کی یہ صورت اگرچہ ظاہر بین حضرات کی نگاہ میں دشوار یا مستبعد نظر آتی ہے لیکن حقیقت پر نگاہ ڈالنے کے بعد اس میں کوئی استبعاد نہیں۔ معاد جسمانی کی حقیقت دو امر سے مرکب ہے ایک یہ کہ معاد کا اصل واقعہ بلحاظ عقل ممکن ہے محال نہیں کیونکہ محال کا ایک عرفی معنی ہے یعنی کسی امر کا دشوار ہونا جیسے ایک آدمی کو دوسرا آدمی کہے کہ میرے ساتھ لاہور جاؤ وہ کہے کہ مجھے عذر ہے گھر میں بیمار ہے، نہیں جاسکتا۔ پھر بھی وہ اصرار کرتا ہے کہ تم کو میرے ساتھ جانا پڑے گا۔ جس کے

معادِ جسمانی کی پہلی دلیل

جواب میں وہ کہتا ہے کہ یہ ممکن نہیں کہ میں جاؤں یعنی محال ہے۔ ظاہراً یہ ناممکن دشوار کے معنی میں ہے نہ یہ کہ لاہور جانا اس کے لئے عقلاً ناممکن ہے۔ کیونکہ اس کہنے کے بعد اگر وہ لاہور جانے کا ارادہ کرکے ریل کا ٹکٹ لے لے تو جاسکتا ہے۔ دوسرا معنی ناممکن اور محال کا یہ ہے جس کو فلسفہ میں ناممکن کہا جاتا ہے۔ جیسے دو دُونے پانچ یا نفی اور اثبات کا ایک وقت میں ایک محل میں جمع ہونا ایسا محال اور ناممکن، واقعی طور پر موجود نہیں ہوسکتا مثلاً یہ کہ زید ایک خاص کمرے میں ایک وقت میں موجود بھی ہے اور موجود نہیں بھی ہے۔ قیامت اور معاد اس معنی میں محال نہیں کیونکہ بہ یک وقت نفی اور اثبات کا ایک محل میں جمع ہونا ممکن نہیں۔ اس وقت دنیا میں قیامت موجود نہیں اور وقت مقرر میں موجود ہوگی۔ موجود ہونا اور نہ ہونا دونوں کسی وقت بھی مجتمع نہیں تاکہ نفی اور اثبات بہ یک

مجتمع ہونے سے محال لازم آتے۔ تمام عقلی اور فلسفی ناممکنات یا محالات کی بنیاد یہی ہے
کہ اس میں بہ یک وقت نفی اور اثبات کا اجتماع ہو۔ دو دُونے پانچ بھی اس حقیقت
کے پائے جانے کی وجہ سے محال ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں اور چار ایسا عدد ہے جو
پانچ نہ ہو اور جب ہم دو دُونے پانچ کہتے ہیں تو اُس کو پانچ تسلیم کرتے ہیں تو گویا ہم نے
ایک ہی عدد کے متعلق نفی اور اثبات کو جمع کر دیا کہ پانچ نہیں اور پانچ ہے جو محال ہے۔
لیکن قیامت جب ممکن ہے اور متواتر خبر صادق نے اس کی تصدیق کر دی ہے تو پھر اس کے
صحیح ہونے میں شک نہیں کیونکہ ہر ممکن امر کی جب تواتر کے ساتھ اس کی تصدیق ہو ہو جائے
یا قابل اعتماد ذرائع سے اس کا ثبوت مل جائے تو پھر اس کے واقع ہونے میں کوئی شُبہہ
باقی نہیں رہتا۔ مثلاً گذشتہ زمانے میں یہ خبر کہ جاپان کا ہیروشیما ایٹم بم سے تباہ ہُوا ایک
ممکن معاملہ تھا۔ جب قابلِ اعتماد اطلاع سے اس کی تصدیق ہوئی تو تمام دنیا نے اس کو
درست تسلیم کیا۔ اِسی طرح موجودہ دنیا کا نفخۂ اسرافیلی سے برباد ہو جانا جو کہ اربوں درجہ
ایٹم سے قوی چیز ہے ممکن امر ہے جب آسمانی کتابوں اور انبیاء علیہم السلام جیسے استبازوں
کی متواتر شہادت اس کی تصدیق کر چکے ہیں تو پھر اس کے واقع ہو جانے میں کیا شُبہہ
کیا جا سکتا ہے۔

معادِ جسمانی کی دوسری دلیل معادِ جسمانی کی دوسری دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ معادِ جسمانی
کی حقیقت تخریب اور تعمیر ہے یعنی موجودہ نظامِ دنیا کو درہم برہم کرنا یہ تخریبِ دُنیا ہے
اور اس کے بدلے میں جہان آخرت کی تعمیر، یہ دونوں کام معادِ جسمانی کی حقیقت ہے اور
یہ دونوں کام فعلِ الٰہی ہے فعلِ انسانی نہیں۔ اب اگر کوئی انسان اس کو دشوار سمجھے تو اپنی
محدود اور ناقص قوت و قدرت کے پیشِ نظر اس کو دشوار سمجھے گا لیکن خالقِ کائنات
کی قدرت کے اعتبار سے اس میں کوئی دشواری نہیں کیونکہ کسی کام کا آسان اور مُشکل
ہونا فاعل کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ مثلاً بیس من بوجھ اُٹھانا چیونٹی کے لئے دشوار ہے لیکن

ہاتھی کے لئے آسان ہے حالانکہ چیونٹی اور ہاتھی دونوں مخلوق ہونے اور حیوان ہونے میں برابر ہیں لیکن خالق اور مخلوق میں تو کوئی برابری نہیں تو اگر انسان مخلوق کے لئے دنیا کی تخریب و تعمیر دشوار ہو تو اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ خالقِ کائنات کی قدرت کے لحاظ سے بھی دشوار ہو حالانکہ دُنیا کی موجودہ عمارت اسی خالقِ کائنات کی بنائی ہوئی ہے اور بگاڑنا بنانے سے آسان ہے تو اگر ہم انسان اور مخلوق ہونے کے باوجود جب کوئی بڑی سے بڑی عمارت بنا دیتے ہیں تو ہم اُس کو گرا کر اُس کی جگہ دوسری عمارت بنا دینے کی قدرت رکھتے ہیں تو کیا خالقِ کائنات کو یہ قدرت نہیں کہ اپنی بنائی ہوئی عمارتِ دُنیا درہم برہم کر کے اس کی جگہ آخرت کی عمارت کھڑی کر دے یقیناً وہ ایسا کر سکتے ہیں اور یہی معاد جسمانی اور قیامت ہے جس کی صحت و صداقت عقلاً ثابت ہو گئی۔

ثبوتِ قیامت اور معاد جسمانی کی تیسری دلیل | قیامت میں مجازاۃِ اعمال کے لئے انسان کو دوبارہ زندہ کرنا ہے چونکہ خالقِ کائنات نے انسان کو پہلی مرتبہ زندگی عطا فرمائی جو مشاہدہ میں آتی ہے اور اس وقت انسان کا نام و نشان نہ تھا۔ هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ؕ (سورۃ الدہر آیۃ ۱)۔ انسان پر ابتدائی وجود سے قبل ایسا وقت آیا ہے کہ معدوم ہونے کی وجہ سے قابلِ ذکر بھی نہ تھا۔ اب دوبارہ زندہ کرنا عقلاً زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ اگر ایک معمار پہلی مرتبہ ایک مکان بنا چکا ہو تو دوبارہ ویسا مکان یا اس سے بھی عمدہ مکان بنانا اس کے لئے کوئی دشوار نہیں ہوتا۔ اس کی طرف قرآن نے انسان کو توجہ دلائی ہے۔

كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ	ہم نے انسان کو پہلی بار بنایا۔ دوبارہ بھی
وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ؕ	ایسا ہی بنائیں گے۔ یہ ہمارا پختہ وعدہ
(سورۃ الانبیاء آیۃ ۱۰۴)	ہے۔ ہم ضرور ایسا کریں گے۔
وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ؕ	انسان ہم پر مثال بٹھلاتا ہے کہ بوسیدہ

قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ (یٰس ۷۸-۷۹)

ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا۔ وہ اپنی پیدائش بھول گیا۔ کہہ وہ جس نے پہلی بار بنایا وہی دوبارہ زندہ کرے گا۔

بلکہ دوسری آیت میں ہے :۔

وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ۭ

بلکہ دوبارہ پیدا کرنا پہلے کی نسبت زیادہ آسان ہے

اِس سے قیامت کا ہونا عقلی رنگ میں ثابت ہوا۔ یہ آسانی بھی قدرت انسان کے انداز پر ہے۔ ورنہ قادرِ مطلق کے لئے سب صورتیں یکساں آسان ہیں۔

وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ۔ اُس کے لئے اعلیٰ کمال ہے۔

معاد کی چوتھی دلیل عام قانون ہے کہ اگر دو کام ایک ہی نوعیت کے ہوں تو اگر کوئی فاعل اسی نوعیت کا مشکل کام کر سکتا ہو تو آسان کام ضرور کر سکتا ہوگا۔ مثلاً ایک درزی جب کوٹ اور شیروانی سی سکتا ہے تو چادر سینا جو کوٹ شیروانی سے آسان ہے اُسکو یقیناً سی سکتا ہوگا کیونکہ دونوں ایک نوعیت کی چیزیں ہیں یعنی خیاطت کی قسم سے ہے۔ اسی طرح دیڑھ دو من، انسان کی نسبت آسمان و زمین کی تخلیق جو کروڑوں من کی مخلوق ہے جب خدا نے ان کی تخلیق کی ہے تو انسان جو چھوٹی مخلوق ہے اس کی دوبارہ تخلیق اس کے لئے کیا مشکل ہے کہ دونوں کام ایک نوعیت کے ہیں۔ یعنی از قسم تخلیق جو مخلوقِ اکبر کی تخلیق کر سکتا ہے تو مخلوق اصغر کی تخلیق کیوں نہیں کر سکے گا۔ قرآن نے

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۭ بَنٰىهَا ۝ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ۝ (النّٰزعٰت : ۲۸)

کیا تمہارا بنانا مشکل ہے یا آسمان کا جس کو اللہ نے بنایا اور بہت بلند جگہ پر رکھا اس کو۔

یعنی آسمان عظیم کی تخلیق کی قدرت سے سمجھ لو کہ تم انسانوں کی دوبارہ تخلیق یقیناً خدا کی قدرت میں داخل ہے لہٰذا عقلاً انسان کی دوبارہ زندگی معقول ہے۔

مجازاۃ اعمال اور معاد کی پانچویں دلیل کل کائنات جو انسان کے علاوہ ہے وہ انسان کی خدمت اور فائدہ رسانی کے لئے بنائی گئی ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۔ اے انسان تمہارے کام اور خدمت میں اللہ نے لگا دیا تمام آسمانی اور زمینی کائنات کو اور انسان کو اللہ نے طاعت اور عبادتِ خداوندی کے لئے بنایا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ۔ ہم نے جن اور انسان کو خدا کی عبادت کے لئے بنایا ہے، اور عبادت کا نتیجہ اس کے ثمرات ہیں۔ اب اگر قیامت یا دوبارہ زندگی اور مجازاۃ اعمال اور جنت و دوزخ کچھ نہیں تو عبادت کا نتیجہ کچھ نہ نکلا اور جب عبادت بے نتیجہ اور لغو ثابت ہوئی تو انسان کی تخلیق بھی عبث اور لغو ثابت ہوئی اور جب انسان کی تخلیق بھی عبث ہوئی تو پورے کارخانۂ کائنات کی تخلیق کا وجود بھی عبث ہوا تو خالقِ کائنات کا پورا تخلیقی عمل عبث اور بیکار ثابت ہوا جو اس کی شانِ حکمت کے خلاف ہے۔ لہٰذا نتائج اعمال انسان کا ظہور بہ شکلِ قیامت و آخرت ضروری ہے کہ دنیا میں اس کا ظہور نہیں تاکہ خداوند تعالیٰ کا کل کارخانۂ عمل عبث نہ ہونے پائے اور کارخانۂ عالم میں اور انسان کی تخلیق میں جو اس کی حکمت ہے وہ ظہور پذیر ہو۔ جس سے عقلاً قیامت کا ثبوت ضروری ہوا۔

مجازاۃِ اعمال اور قیامت کی چھٹی دلیل قرآن نے اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى[1] (کیا انسان گمان کرتا ہے کہ اس کو بے کار چھوڑے گا؟) میں اسی مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اسی طرح اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ[2]۔ کیا تم گمان کرتے ہو کہ ہم نے تم کو عبث پیدا کیا ہے اور تم نتائجِ اعمال پانے کے لئے قیامت میں ہمارے پاس لوٹ کر نہ آؤ گے؟ دنیا میں نیک و بد ہر طرح کے انسان موجود ہیں۔ کوئی فیض رساں ہے کوئی ظالم، کوئی اللہ کا تابعدار کوئی اللہ سے باغی، کوئی عادل کوئی مفسد کوئی متقی کوئی فاجر۔ لہٰذا اللہ کے وصفِ عدل کے لئے جس پر اقوامِ عالم کا اتفاق ہے یہ ضروری ہے کہ دونوں کے ساتھ سلوک اور خدا کا طرزِ عمل یکساں نہ ہو ورنہ اللہ کا عدل ظاہر نہ

[1] ... [2] المؤمنون آیۃ ۱۱۴

ہوگا۔ خود انسانی بادشاہ بھی اپنے وفادار اور باغی کے ساتھ برابر سلوک نہیں کرتا۔ وفادار کو انعام دیتا ہے اور باغی کو سزا اور اس کے خلاف کاروائی کو عدل وحکمت کے خلاف سمجھتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیوی زندگی میں نیک و بد انسانوں کے ساتھ یکساں سلوک نظر آرہا ہے بلکہ بسا اوقات باغی ظالم اور بدعمل انسان عیش اُڑا رہے ہیں اور بہت سے زاہد ین عادل بے ضرر اور نیک افراد تنگی اور سختی میں مبتلا ہیں تو اگر اس زندگی کے بعد آخرت کی کوئی دوسری زندگی نہیں تو خالق کائنات کا نہ عدل ظاہر ہوگا نہ حکمت۔ اس لئے ضروری ہوا کہ اس زندگی کے بعد دوسری اُخروی زندگی موجود ہو تاکہ اس میں عادل و باغی، نیک اور بدانسانوں کے ساتھ اُن کے اعمال کے مطابق سلوک ہو اور اللہ کی حکمت اور عدل نمایاں ہوسکے۔ وہی قیامت اور روز مجازاۃ اعمال ہے جو عقلاً ضروری ثابت ہوا۔ قرآن نے اسی کی طرف اس آیت میں توجہ دلائی ہے۔

ام نجعل الذین امنوا و عملوا الصالحات کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار۔	کیا اگر آخرت نہیں تو ہم اللہ پر یقین کرنے والوں اور نیکوں کاروں کو مفسدوں کے برابر رکھینگے اور خدا ترسوں کیساتھ بدکرداروں کی طرح سلوک کرینگے؟ ہرگز نہیں۔

قیامۃ اور مجازاۃ کی ساتویں دلیل

یہ ایک قانونی ضابطہ ہے کہ ہر مرکب چیز کیلئے بسائط اور مفردات کا ہونا ضروری ہے۔ مثلاً اگر اصلی مرکب ہو، جیسے انسان جو چار عناصر پانی مٹی ہوا آگ سے مرکب ہے تو اس مرکب کے لئے خالص مفردات بھی موجود ہیں۔ مثلاً خالص پانی، خالص مٹی، خالص ہوا، خالص آگ کہ یہی مفردات بدن انسان کے اندر جو پانی مٹی، ہوا، آگ موجود ہے۔ ان کا خزانہ اور مرکز ہے۔ اسی طرح مصنوعی مرکب مثلاً شربت سکنجبین ایک مرکب ہے جس کے اجزاء ہیں پانی، سرکہ، چینی ہے تو تینوں اجزاء خالص صورت میں سکنجبین سے باہر موجود ہیں۔ یہ قانون اور ضابطہ اعیان و اعراض، جواہر و اوصاف دونوں

پر حاوی ہے مثلاً اگر کسی کپڑے میں ایسا رنگ ہو جو سیاہ اور سرخ رنگ سے مرکب ہو تو اس کپڑے سے باہر اس مرکب رنگ کے خالص مفردات موجود ہیں یعنی خالص سیاہ رنگ اور خالص سُرخ رنگ۔ اب ہم اس ضابطہ کے تحت دیکھتے ہیں کہ دنیا کی زندگی غم اور خوشی سے مرکب ہے۔ نہ خالص خوشی موجود ہے نہ خالص غم۔ بڑا خوش حال شخص بھی صرف خوشی سے بہرہ یاب نہیں بلکہ غم بھی اُس کو لاحق ہے کیونکہ وہ بوڑھا ہوتا ہے، بیمار ہوتا ہے، مرتا ہے اس کے اقارب و احباب مرتے ہیں۔ مال اور اقتدار اور عزت میں فرق آتا ہے۔ یہ سب غم ہے اور بڑے سے بڑا مغموم تنگدست آدمی بھی کوئی نہ کوئی خوشی رکھتا ہے۔ ہوا میں سانس لیتا ہے، پانی پیتا ہے، روٹی کھاتا ہے۔ یہ سب خوشی ہے۔ اب انسانی حیات جو غم و خوشی کا ایک مرکب ہے۔ اس مرکب کے ہر دو جزء کے لئے خالص مفرد کا ہونا بھی ضروری ہے کہ وہ اس مرکب کے اجزاء کا مخزن ہو۔ یعنی ایک مرکز خالص غم کا ہونا ضروری ہے جس میں خوشی نہ ہو اور ایک مرکز خوشی و مسرت کا ہونا ضروری ہے جس میں غم کا نام و نشان نہ ہو یہ دو مرکز اس دنیا میں ناپید ہیں۔ بناء براں قیامت اور آخرت کا وجود ضروری ہے جس میں صرف دو مرکز ہوں۔ ایک صرف غم کا یعنی دوزخ اور دوم صرف خوشی کا یعنی جنت تاکہ مخلوط مرکب کے لئے جو دنیاوی زندگی ہے خالص مفردات کا وجود متحقق ہو سکے لہذا اس سے قیامت، دوزخ اور جنت کا ثبوت ثابت ہوا۔

قیامۃ اور مجازاۃ اعمال کی آٹھویں دلیل انسانی افراد میں کچھ صالح ہیں اور کچھ مفسد اس لئے تمام انسانی افراد ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں قیمتی، اور اعلیٰ اجزاء بھی ہیں اور خسیس اور کم درجے کے اجزاء بھی ہیں۔ جس طرح گندم کے پودے میں خوشے کے اندر جو گندم کے دانے ہیں وہ قیمتی ہے اور باقی گندم کا پودہ انسان کے کھانے کے لائق نہیں۔ بلکہ مویشیوں کی خوراک ہے اس لئے گندم کے پودوں کو کھلیان میں روندنا پڑتا ہے تاکہ اعلیٰ اور ادنیٰ اجزاء یعنی دانے اور بھوسہ الگ ہو جائے اور ہر ایک کو اُس کے مناسب ٹھکانے

پر پہنچا دیا جائے چنانچہ روندنے اور رگڑا رگڑی کے بعد ہوا کے ذریعہ بھوسہ اور غلہ کو الگ الگ کر کے بھوسہ مویشیوں کے معدہ میں اور غلہ انسان کے معدہ میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ اس طرح قیامت میں ابرار و فجار، اخیار و اشرار کا میدان حشر کے کھلیان میں امتیاز ضروری ہے وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ؕ (یٰس آیۃ ۵۹) اے مجرمو نیکوکاروں سے الگ ہو جاؤ۔ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا ؕ (النبا آیۃ ۱۷)۔ نیک و بد انسانوں کی جدائی اور الگ الگ کرنے کے دن کی تاریخ مقرر ہے تاکہ اخیار اور صالح اجزاء کو اس کے مناسب ٹھکانے یعنی جنت میں پہنچا دیا جائے گا کہ یہ اسی کا فطری مقام ہے اور اشرار کو ان کے ٹھکانے یعنی دوزخ میں پہنچا دیا جائے گا کہ ان کا فطری مقام یہی ہے جس سے نہ صرف قیامت ثابت ہوتی بلکہ جنت اور دوزخ کا بھی ثبوت ہوا۔ گویا جنت کو انسانی معدہ اور دوزخ کو حیوانی معدہ کی طرح سمجھو اور ابرار و اشرار کو غلہ اور بھوسے کی طرح سمجھ لو۔

قیامۃ اور مجازاۃ کی نویں دلیل انسان کی فطرت میں راحتِ خالصہ کی تڑپ اور مسرت کا ولولہ فطرتاً موجود ہے اور ہر فرد انسانی کی یہ تمنا اور آرزو ہے کہ اس کو خوشی نصیب ہو اور غم و الم سے محفوظ رہے۔ یہ تمنا تمام افراد اور سب اقوام کو ہے اور کوئی فرد اور قوم ایسی نہیں جو اس تمنا اور خواہش سے خالی ہو جس سے معلوم ہوا کہ یہ انسان کی فطری تمنا ہے جو فطرتِ انسانی کے لوازمات میں سے ہے۔ اب اس تمنا کا پورا ہونا یا ممکن ہوگا یا ناممکن۔ ناممکن تو ہو نہیں سکتا کہ ناممکن امر کی خواہش پر تمام افرادِ انسانی متفق نہیں ہو سکتے۔ مثلاً انسان کے لئے اس دنیا میں سانس لئے بغیر زندہ رہنا ناممکن ہے۔ تو ایک انسان بھی ایسا دستیاب نہیں ہو سکتا کہ اس کی یہ تمنا ہو کہ وہ سانس کا محتاج نہ ہے اور زندگی گذارے۔ اس لئے راحتِ خالصہ کی تمنا امر ممکن ہے ورنہ اس کی خواہش پر تمام انسان کیونکر متفق ہوتے اب جب ممکن ہوئی تو اب یہ دیکھنا ہے کہ کیا یہ تمنا اس دنیا کی زندگی میں پوری ہو سکتی ہے؟ قطعاً پوری نہیں ہو سکتی۔ اب اگر دنیا کے سوا کوئی اور جہاں یا دورِ زندگی ایسا نہ ہو جس میں یہ

تمنا پوری ہو سکے تو یہ خلافِ فطرت اور خلافِ عقل ہے کہ قدرت کی طرف سے ایک ایسے اعلیٰ فطری جذبے کی تکمیل کا کوئی انتظام نہ ہو اور پھر بھی اسی جذبہ کو قدرت نے فطرتِ انسانی میں گاڑ دیا ہو جس کے تمام دیگر فطری جذبات خوراک، پینا، سانس لینا، نکاح کرنا سب کے لئے قدرت نے انتظام مہیا کیا ہے۔ اِس لئے تسلیم کرنا پڑے گا کہ جذبۂ راحتِ خالصہ اور غم سے نجات کا انتظام بھی اُس نے کیا ہے لیکن دنیا میں نہیں کسی اور دورِ زندگی میں۔ دُنیا میں ایسا انتظام ممکن نہیں۔ زمین کا دائرہ تنگ ہے اور دُنیا عالمِ کون و فساد و تغیّرات ہے۔ اس میں ایک بادشاہ کے لئے بھی خالص خوشی اور غم سے نجات ناممکن ہے۔ بادشاہ بوڑھا ہوتا ہے جو جوانی کی نسبت غم ہے اور ضرر ہے۔ بیمار ہوتا ہے جو صحت کی نسبت غم اور ضرر ہے۔ دشمن کا خطرہ اور رعیت کی بغاوت کا اندیشہ بھی ہوتا ہے جو غم ہے اور سب سے بڑھ کر خویش واقارب اُس کے مرتے ہیں جو غم ہیں اور مزید برآں خود بھی اُس کو موت پیش آتی ہے جو تمام غموں سے بڑھ کر ہے۔ یہ سب تغیّرات اس دارالفنا کے لئے امورِ لازمہ ہیں اور اس جہان کی زندگی کے ضروری اجزاء ہیں جو اس سے جُدا نہیں ہو سکتے جیسے گرمی آگ سے جُدا نہیں ہو سکتی۔ دُنیا تنگ ہے اگر موجود لوگ زندہ رہیں اور نئے بھی پیدا ہوں تو زمین میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہے گی اور نقل وحرکت اور غذا کے لئے زراعت کا نظام معطل ہو جائے گا۔ اِس لئے اِس جہان کا ختم ہونا اور ایک وسیع جہان کا موجود کرنا ضروری ہے تاکہ یہ فطری تمنا پوری ہو سکے۔ اِس جہانِ فانی کا ختم کرنا اور جہانِ بقاء کو موجود کرنے کا نام قیامت ہے۔ جس میں ابدی اعمال کے بدلے اور جزاء میں جنت کی زندگی نصیب ہو کر اس فطری تمناءِ انسان کی تکمیل ہوگی کیونکہ جنّت میں قرآنی بیان کے مطابق لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (البقرۃ آیۃ ۳۸) نہ کسی کو غم ہوگا اور نہ کسی ڈر کا اندیشہ۔ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ۔ (حٰمٓ السجدہ آیۃ ۳۱) تم کامل انسانوں کے لئے جنت میں وہ سب کچھ ملے گا جو تمہارا جی چاہے اور جس کو تم طلب کرو گے۔ وہاں جوانی ہوگی بڑھاپا نہ ہوگا۔ صحت ہوگی مرض نہ ہوگا۔ غناء ہوگا محتاجی نہ ہوگی

زندگی ہوگی موت نہ ہوگی۔ جس سے آخرت قیامت اور جنت کا ثبوت عقلاً ثابت ہوا اور اور جب جنت مرکز مسرت و خوش حالی موجود ہوگی تو جنت کی ضد دوزخ بھی خدا اور آخرت فراموشوں کے لئے ہوگی جس میں راحت کا نام ونشان نہ ہوگا اور مصائب و آلام کا مرکز دائمی ہوگا کیونکہ ضد کے ساتھ دوسری ضد نظام قدرت و عدالت کے تحت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو قوم جنت کی قائل ہے وہ دوزخ کو بھی مانتی ہے۔ سردی کے مقابلے میں گرمی ، رات کی تاریکی کے مقابلے میں روشنی کا وجود ضروری ہے کہ یہ جنت و دوزخ اعمال دنیا کے نتائج ہیں۔ دنیا عالم اضداد تھی تو نتائج کا بھی متضاد ہونا لازمی ہے۔ اعمال میں ایمان اور اُس کے مقابلے میں کفر، طاعت کے مقابلے میں گناہ اور معصیت ، عدل کے مقابلے میں ظلم موجود تھا۔ جو باہم متضاد تھے تو اُن کے نتائج میں بھی بشکل دوزخ و جنت ، غم وخوشی کا تضاد ضروری ہے۔

قیامت اور مجازاۃ اعمال کی دسویں دلیل | اصلاحِ بشری تمام اقوام عالم کو محبوب ہے کہ کوئی انسان نہ خدا کا حق تلف کرے اور نہ انسانوں کا حق تلف کرے تاکہ انسانی زندگی ، امن و اطمینان اور خوشحالی کے ساتھ گذرے اس لئے مختلف اقوام نے بشری اصلاح کے لئے مختلف انتظامات ہر دور میں کئے ہیں اور مختلف ادارے بنائے ہیں لیکن اصلاح وجود میں نہ آئی۔ اصلاح کے عقلی اسباب تین ہیں۔ ۱۔ تعلیم ۔ ۲۔ قانون حکومت ۔ ۳۔ عقیدہ مجازاۃ اعمال ۔

پہلا سبب یعنی تعلیم سے انسان نیک و بد سے واقف تو ہو جاتا ہے لیکن تعلیم انسان کو آمادہ عمل نہیں بنا سکتی ۔ نیک اور بد جاننا اور چیز ہے اور نیکی کرنا اور بدی چھوڑنا اور چیز ہے۔ تعلیم سے پہلی چیز حاصل ہوتی ہے دوسری نہیں ۔

دوسرا سبب قانون بھی اصلاح بشری کے سلسلے میں سو فیصدی کامیاب نہیں کیونکہ جرائم کا ارتکاب رُوح کرتی ہے اور جب تک روح میں پاکیزگی اور انقلاب پیدا نہ ہو تو جرائم بدستور صادر ہوتے رہیں گے۔ قانون مجرم کو سزا دلانے میں پوری طرح کامیاب نہیں بوجوہات ذیل:-

۱۔ ہر جگہ قانون کی حکومت نہیں ہوتی۔ آزاد علاقوں میں نہ قانون ہے نہ حکومت۔

۱۔ اگر کہیں حکومت اور قانون موجود ہو تو بسا اوقات مجرم جرائم کا ارتکاب ایسی جگہ اور ایسے وقت میں کرتا ہے کہ کوئی گواہ اور شاہد موجود نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں وہ قانونی سزا سے بچ جاتا ہے اور اصلاح کا کام نا تمام رہ جاتا ہے۔

۲۔ اگر گواہ موجود ہوں تو ایسے مواقع بھی پیش آجاتے ہیں کہ گواہ سچی گواہی دینے کے لئے آمادہ بھی نہیں ہوتا۔

۳۔ اگر کسی وقت شہادت کے لئے آمادہ بھی ہو جائے تو مدعی علیہ کی طرف سے ترغیب یا ترہیب یعنی مالی لالچ یا ضرر رسانی کی دھمکی اس کو سچی شہادت سے روک دیتی ہے۔

۵۔ اگر سچی شہادت دینے کی نوبت آبھی جائے تو فریقِ مخالف کے وکیل گواہوں پر جرح کر کے گواہی کو مشکوک بنا کر شہادت کو بے اثر کر دیتے ہیں جس سے مجرم سزا سے بچ جاتا ہے۔

۶۔ اگر بالفرض جرح کے بعد بھی شہادت درست ثابت ہوئی تو فیصلہ جج کے ہاتھ میں ہے وہ غلطی بھی کر سکتا ہے خاص کر جب روح میں تقویٰ نہ ہو۔ اور رشوت اور سفارش کے تاثر سے متاثر بھی ہو سکتا ہے جس سے مجرم سزا یابی سے بری ہو سکتا ہے۔

۷۔ اگر بالفرض سزا ہوتی بھی تو ضروری نہیں کہ وہ سزا جرم کی نوعیت کی سنگین انداز پر ہو۔

ان سب احتمالات کے ہوتے ہوئے قانون کس طرح جرائم کو روک سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قانون اور سزاؤں کے باوجود جرائم اور قیدیوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اسی لئے اصلاحِ بشری کا کام قلب و ضمیر سے شروع کرنا ضروری ہے تاکہ جرائم صادر نہ ہونے پائیں اور صدور کی صورت میں اس کو ہر حال میں سزا دی جائے۔

اصلاح کی بنیاد قلب و ضمیر میں عقیدہ مجازاۃ اعمال کی پختگی اور یقین قیامت ہے جس سے یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ ہر جرم اور حق تلفی درحقیقت اپنی تباہی آخرت کا سامان کرنا ہے اور چند روزہ فانی فوائد کے بدلے دوامی مصیبت میں مبتلا ہونا ہے جو کسی عقل مند کا کام نہیں یہی عقیدہ مجازاۃ تھا جس نے ڈاکوؤں اور لٹیروں کو فرشتہ خصلت بنایا اور اسی عقیدے کی پختگی

سے جن کے دل و دماغ روشن ہوئے وہاں سے جرائم، ظلم اور حق تلفی کا نام ونشان مٹ گیا اصلاحِ بشری کا یہی واحد مجرّب نسخہ ہے جس نے تجربات اور مشاہدات کے ذریعے اپنے اصلاحی اثرات سے دُنیا کو رُوشناس کیا ہے۔ اس لئے اصلاح بشری کے زاویہ نگاہ سے قیامت اور مجازاۃِ اعمال کا وجود یقینی ہے ورنہ اس یقین نہ ہونے کی صورت میں انسانیت اغراض اور مفادات اور جلب منفعت اور خون ریزی کا مجسمہ بن کر دنیا کو جہنم کدہ بنا دے گی اور بنا چکی ہے۔

قیامۃ اور مجازاۃ کی گیارھویں دلیل انسان کائنات کا قیمتی جز ہے لیکن اس کی عمر اور حیات مختصر ہے۔ آسمان، زمین، پہاڑ طویل اور دراز مدت سے قائم ہیں لیکن انسان کی زندگی ایک مختصر شعلہ ہے جو موت کے ایک جھٹکے سے بجھ جاتا ہے حالانکہ اگر کسی آدمی کے گھر ایک برتن مٹی کا ہو اور دوسرا سونے کا۔ تو سونے کا برتن دیرپا ہوگا کہ کوئی مالک اپنے سے قیمتی چیز جلد جُدا نہیں کرتا جس سے معلوم ہوا کہ انسان کی پوری زندگی یہی مختصر دنیوی زندگی نہیں بلکہ یہ انسان کی اس ابدی زندگی کی تمہید ہے جو اُس کو جہان آخرت میں بعد از قیامت بطور جزاء اعمال کے نصیب ہوگی ﴿وان الدار الآخرۃ لھی الحیوان﴾ - وہی اخروی زندگی انسان کی حقیقی زندگی ہے جس کو زوال نہیں اور جس کی عمر لا محدود ہے تاکہ قیمتی انسان کی درازیٔ عمر دیگر کائنات کی نسبت زیادہ ثابت ہو سکے اور قیمتی اشیاء کی دراز عمر کا ضابطہ خسیس اشیاء کے مقابلے میں پورا ہو سکے۔

مجازاۃ و قیامۃ کی بارھویں دلیل — جدید سائنس کے تحت — ڈاکٹر فرائڈ لکھتا ہے کہ جدید روشنی میں انسان کی شخصیت کا ظہور تین چیزوں سے ہوتا ہے۔ نیّت[۱]، قول[۲]، فعل[۳]۔ نیت انسانی نفس کے تحت شعور میں محفوظ ہے۔ جب وہ کسی خیال کو بھولتا ہے اور پھر نیند میں دیکھتا ہے تو اُس کو یاد آجاتا ہے اور قول ہوائی تموّجات میں محفوظ ہے، جو ریڈیائی نظام کے ذریعہ منتقل ہو سکتا ہے جس کی رفتار فی سیکنڈ ایک لاکھ چھیاسی

ہزار میل ہے۔ تمام اقوال فضا میں محفوظ ہیں۔ لیکن وہ باہم مخلوط ہیں لیکن تا ہنوز آلہ امتیاز ایجاد نہیں ہوا۔ ممکن ہے کہ آئندہ ایجاد ہو سکے۔ برخلاف ریڈیائی نظام کے کہ وہ طول میں مختلف لائنوں پر سوئی منطبق کر دینے سے مختلف جگہوں سے آوازوں کو منتقل کرتا ہے اور اختلاط نہیں ہوتا کیونکہ ہوائی لہریں طول میں جدا ہیں۔ اسی طرح ہر فعل فضا میں ایک حرارت چھوڑ جاتا ہے جو قریب زمانہ میں جدید علم میں معلوم ہو سکتا ہے لیکن دراز زمانہ گذرنے کے بعد ایسا آلہ اس وقت نہیں کہ ان افعال کو فضا سے لیا جا سکے۔ ممکن ہے کہ مستقبل میں ایسا ہو سکے۔ اِس سے آخرت کا وجود درست ثابت ہوتا ہے۔ جس میں نیت، قول اور فعل پر جو محفوظ ہیں ان کے نتائج مرتب ہو سکیں۔ اس کے علاوہ ماہرین ارضیات کی تحقیق کے مطابق بطن زمین میں تیرہ سو ۱۳۰۰ درجہ گرمی موجود ہے حالانکہ پانی ابالنے کے لئے سو ۱۰۰ درجہ گرمی کافی ہے۔ اس کے علاوہ سالانہ زمین سے ہزاروں زلزلے پیدا ہوتے ہیں۔ بعض محسوس بعض نامحسوس۔ یہ بھی اِس اندرونِ زمین کی گرمی سے پیدا ہوتے ہیں۔ سمندروں کا کھارا پن وغیرہ یہ سب اس امر کی دلیل ہے کہ جہنم زمین اور سمندر کے نیچے ہیں اور یہ سب جہنمی اثرات ہیں۔

تفصیلاتِ قیامت

کیفیتِ قیامت

قیامت کی حقیقت دو امر ہیں۔ ایک تخریب عالمِ موجود، دوم تعمیر عالمِ آخرت، اور دونوں کو اللہ نے دو نفخوں سے وابستہ کیا ہے۔ اوّل نفخہ تخریب کے لئے ہے دوم نفخہ تعمیر کے لئے۔ تخریب درحقیقت دنیا کی موت ہے۔ عام عادت کے مطابق موت سے قبل مرض ہی پیش آتا ہے اور جب وہ مرض علاج سے درست نہ ہو تو مریض کا مرض اطباء اور ڈاکٹروں کی نگاہ میں لاعلاج صورت اختیار کرکے مرضِ مُہلک بن جاتا ہے اور پھر وہ شخص مرکر ہلاک ہوجاتا ہے اسی ضابطہ کے تحت انسان کا اجتماعی وجود بھی جب وہ مریض ہوجاتا ہے اور کسی علاج سے انسان کی ہیئتِ اجتماعیہ صحت پذیر نہیں ہوتی تو اُس کا مرض لاعلاج ہوکر اس کا اجتماعی وجود قریب الہلاک ہوجاتا ہے اور پھر اُس پر ہلاک کا قانونِ الٰہی نافذ ہوجاتا ہے۔ اور ماسوا انسان کائنات چوں کہ انسان کی خدمت کے لئے ہے جب انسان نہ ہو تو اس کی بھی ضرورت نہیں، اِس لئے پوری کائناتِ آسمان و زمین کی ہلاکت و موت بھی انسان کی ہلاکت سے وابستہ ہو جاتی ہے اور انسان کی موت سے پوری دنیا اور کائنات پر بھی قانونِ ہلاکت و موت نافذ کردیا ہے اور اس کا نام قیامت ہے اور قیامت سے قبل کی حالت دُنیا کے لئے مرض الموت کی حالت ہے۔ جس کو شریعت کی اصطلاح میں اشراط الساعۃ یا علاماتِ قیامت کہا جاتا ہے۔ جیسے شخص موت سے پہلے مریض میں موت کے علامات نمایاں ہوجاتے ہیں اور ماہر ڈاکٹر و طبیب موت کا حکم لگا دیتے ہیں۔ علامات کے بعد شخص موت میں کچھ وقفہ ہوتا ہے لیکن عالمی موت میں اس کی وسعت کے پیشِ نظر علاماتِ کبریٰ کے متحقق ہونے کے بعد کافی وقفہ ہوتا ہے۔

عالمی مرض الموت یا علاماتِ قیامت

ایمان اور اس کے لوازمات اگر انسانوں کے مجموعی وجود میں متحقق ہوں تو یہ چیز عالم کے لئے بمنزلہ روح حیات کے ہے۔ اور جوں جوں اس میں کمی ہوگی تو اُس قدر عالمی صحت کے لئے مرض ہے پھر اگر یہ مرض عالمگیر صورت اختیار کرلے تو یہ عالمی ہلاکت یا قیامت کے لئے علاماتِ کبری اور مرض مہلک کی طرح ہے جس پر حسب ذیل احادیثِ نبویہ دال ہیں۔

۱۔ ابن مسعودؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ قیامت شریر انسانوں پر قائم ہوگی۔ مسلم

۲۔ انسؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ جب تک اللہ اللہ کہنے والے مومن ہوں گے تو قیامت قائم نہ ہوگی۔

۳۔ حذیفہؓ حدیث نقل کرتے ہیں کہ قیامت قائم نہ ہوگی جب تک دنیا کا اقتدار بدترین لوگوں کے ہاتھوں میں نہ آئے گا۔ ترمذی

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ بدی کی عالمگیر قیامت یا ہلاکتِ عالم کی نشانی ہے۔ اگر کچھ ایمان دار لوگ تھوڑے رہ جائیں گے تو مسلم میں حضرت عائشہؓ سے حدیث منقول ہے کہ اللہ ایک عمدہ ہوا بھیجے گا جس سے ان قلیل التعداد مؤمنوں کی روحیں قبض کی جائیں گی اور صرف بُرے لوگ رہ جائیں گے تو قیامت قائم کی جائے گی۔ ان حالات کے پیش نظر قیامت قائم کرنے میں یورپ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کے علوم و فنون نے ایمانی عقائد اور ایمانی اعمال کو ختم کیا جس کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

۱۔ امریکہ کے ہم جنسیت پرستوں یعنی لواطت کے حامیوں کی انجمن کی ایک رپورٹ مندرجہ روزنامہ جنگ ۲۰ اپریل ۱۹۹۲ء میں درج ہے کہ امریکہ کی فوج میں ایک کروڑ سترلاکھ ہم جنسیت پرست یعنی لواطت کرنے والے ہیں اور امریکہ کے عام آدمیوں میں ہر چوتھا آدمی لواطت میں مبتلا ہے۔ صرف برطانیہ میں چودہ لاکھ وہ حرامی بچے ہیں جن کی عمر ۱۶-۱۷ سال ہے۔ ہر سال

حرامی بچوں کی پیدائش ستر ہزار ہے یہ اسقاط حمل اور برتھ کنٹرول کے علاوہ ہے۔ اوسطاً ہر چودھواں شخص حرامی ہے۔ ۱۹۴۸ء کی رپورٹ کے مطابق نوّے فی صدی امریکی زنا اور ستر فیصد لواطت میں مبتلا ہیں۔ ان کا اندازہ ہے کہ امریکہ میں ۱۹۷۵ء تک ہر پانچواں بچہ حرامی ہوگا۔ (رپورٹ ترجمان اسلام ۲۴ مئی ۱۹۶۸ء) خون ریزی کا جو مظاہرہ مغربی تہذیب نے کیا، وہ سابق جنگِ عظیم اور موجودہ جنگوں اور ایٹمی ہتھیاروں سے نمایاں ہے۔ خدا اور اخلاق کا انکار عام ہے۔ سود و شراب جزو زندگی ہے۔ جھوٹ ریڈیو اسٹیشنوں اور اخبارات سے شائع ہونا کامیاب سیاست کی نشانی ہے۔ کیا یہ علامات عالمی موت کی دلیل نہیں۔ پھر تعجب یہ کہ اِن کو گناہ بھی نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ انگلستان اور کینیڈا نے تالیوں کی گونج میں جوازِ لواطت کا قانون پاس کیا۔

نفخ الصور

نفخۂ اولیٰ جمعہ کے دن اسرافیل فرشتے کے ذریعہ صور پھونکا جائے گا۔ اس میں تجلّی جلالی کی ایسی پُرزور قوت ہوگی کہ اس کے خدائی اثر سے موجودہ نظامِ عالم درہم برہم ہوجائے گا یہ نفخہ درحقیقت خدا کے وصفِ ممیت کا مظہر ہوگا جس سے ہر چیز علوی و سفلی پر موت و فنا طاری ہوگا۔ قرآن کا بیان ہے۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ط۔ (سورۃ الزمر آیۃ ۶۸)	صور پھونکا جائے گا تو آسمان اور زمین کی کائنات ہلاک ہوجائے گی بجز ان کے جن کو اللہ ہلاک ہونا نہ چاہے۔

استثناء۔ میں ہلاک سے مندرجہ ذیل چیزیں مستثنیٰ ہونگی۔ دوزخ کے کارندے اور جنت اور اس کے حور و ولدان کہ ان کی تخلیق بقاء کے لئے ہے نہ فناء کے لئے۔ اور چار ملائکہ مقربین

اور مدبرات الامر کر ان سے کام لینا ہے اور شہداء کے ارواح کہ اُن کے ساتھ حیات کا وعدہ ہے بدور السافرۃ فی امور الاخرۃ میں مستثنیات کے دلائل حدیث مذکور ہیں۔ بدور السافرۃ فی امور الاخرۃ میں بیہقی سے بروایت مقاتل منقول ہے کہ صور کے دائرہ کی وسعت آسمانوں اور زمین کی وسعت کے برابر ہے۔

نفخۂ ثانیہ | قرآن میں ہے۔ ثُمَّ نُفِخَ فِيهِ أُخْرَىٰ فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنظُرُونَ ط (الزمر آیۃ ۶۸) صور کے دوبارہ پھونک سے فوت شدہ انسان اور حیوانات سب زندہ ہوں گے یہی ابنِ عباس سے بدور السافرہ میں منقول ہے۔ طبرانی نے مقدام سے حسن سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ چھوٹے بچے سے بوڑھے تک زندہ ہو جائیں گے۔ باقی جو بچہ قبل از وقت گر گیا ہو تو اگر اُس کے اعضاء تام ہوں اور رُوح پھونکی گئی ہو تو زندہ کیا جائے گا ورنہ نہیں۔ سب کی عمر ۳۳ سال کی ہوگی۔ یہ نفخہ مظہر ہوگا اللہ کی صفتِ محی کا۔ قرآن کی مذکورہ آیت کا معنی یہ ہے کہ پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو سارے مردگان کھڑے ہو کر دیکھتے ہوں گے۔ دونوں پھونکوں میں چالیس سال کا وقفہ ہوگا۔ (بخاری)۔ اس عرصۂ درمیانی میں چالیس دن عرش سے جمے ہوئے سفید پانی کی بارش ہوگی جو مردوں کی خاکی قالب پر برسے گی جس سے وہ انسانی صورتوں میں تبدیل ہوگی۔ بدور السافرہ میں ابوالشیخ کی روایت کے مطابق صور میں تمام ارواح کی تعداد پر سوراخ ہیں جن میں روحیں ہوں گی اور نفخے سے اُڑ کر اپنی اپنی قالبوں میں داخل ہونگی۔ ذرّاتِ ابدان کا اجتماع زلزلے کے ذریعہ ہوگا۔ جیسے قرآن میں ہے۔ ان زلزلة الساعة شَيْءٌ عَظِيمٌ۔ (   ) ذرات جب خاکی قالب کی شکل میں خود یا بذریعہ مدبرات الامر متشکل ہوں گے۔ عرش سے وہ ماء الحیات یعنی آبِ حیات چالیس دن تک برستا رہے گا جس سے خاکی قالب لحمی قالب کی شکل اختیار کرے گی جس کو کبھی تغیر اور فنا نہ ہوگا۔ انسان کا پہلا وجود ماء الفنا اور زمینی پانی سے تھا اور یہ ماء الحیات اور عرشی آب سے ہے۔ ماء الحیات کا اطلاق ابوہریرہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے۔ پھر دوسرے نفخے سے تیار شدہ

قالبوں میں روحیں منتقل ہو کر مُردے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔

بیانِ حکمتِ نفخ

دنیا کا نظام چونکہ مادی اسباب پر مبنی ہے اس لئے دنیا میں پیدا ہونا بھی تدریجاً ہے اور مرنا بھی تدریجاً۔ سب لوگ یکدم پیدا نہیں ہوتے اور نہ سب یکدم مرتے ہیں۔ بلکہ ولادت اور فوتیدگی دونوں تدریج اور آہستگی سے ہوتی ہے۔ لیکن عالمِ آخرت عالمِ معنویات اور عالمِ جلال و قدرت ہے اور عالمِ دفعیات ہے اس لئے دنیا کی پوری الٰہی اور انسانی عمارت کو ایک نفخہ سے ختم کیا جائے گا اور تمام اموات اور مردگان کو دوسرے نفخے سے یکدم زندہ کر دیا جائے گا۔ جیسے لشکر ایک سیٹی بجنے سے جمع ہوتی اور دوسری سے منتشر ہوتی ہے۔ انسان کی پہلی حیات میں قدرت نے رحمِ مادر میں انسانوں کی قالب سے مدبرات الامر فرشتوں سے کام لیا اور جان قبض کرنے اور موت میں بھی۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ ( )	فرشتے جان قبض کرنے کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔
قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ۚ (السجدۃ آیۃ ۱۱)	اور کہہ دو کہ جان لیتے ہیں فرشتۂ موت جو تم پر مقرر ہے۔

اس آیت کے تحت ملائکہ سے کام لیا۔ اگرچہ خالقِ کائنات کو کسی کام کے لئے کسی کی ضرورت نہیں لیکن شاہی نظام کے تحت ایسا کیا گیا تاکہ اللہ تعالیٰ کے شاہی نظام کا ظہور ہو۔ ان دونوں نفخوں کو حضرت اسرافیل پھونکیں گے تاکہ اسجدوا لآدم کے تحت انسانیت کے تمام امورات میں ملکی قوتوں کی خادمانہ حیثیت نمایاں ہو۔ یہاں تک کہ داخلہ جنت و دوزخ تک یہی ملکی خادمانہ نظام اور کارپردازانہ منصب قائم رہے گا۔ خزنہ جہنم اور سلام اہلِ جنت کے فرائض بھی ملائکہ کے سپرد ہوں گے جو قرآن میں مذکور ہیں۔ نفخۂ اولے میں تجلی امانت کا اثر بذریعہ نفخہ اسرافیلی

کائنات پر ڈالا جائے گا اور نفخۂ ثانیہ سے تجلی احیاء کا اثر اموات پر ڈالا جائے گا۔ نفخۂ تخریب میں بھی نظم اور باقاعدگی ہوگی کہ شروع علویات و سماویات سے ہوگا۔ جیسے اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ[1]، وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ[2] کے تحت آسمان جو دنیا کی چھت ہے پھٹ جائیگا۔ اسی طرح وَاِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ[3] کے تحت آسمانی کائنات کے روشن ستاروں اور سیاروں کا نظام ختم کیا جائے گا۔ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ[4]۔ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ[5] کے تحت تمام میٹھا اور کھارا پانی یک جا کرکے اس کو گرمی سے تحلیل کرکے ختم کر دیا جائے گا۔ اس گرمی سے پانی میں آگ لگ جائے گی۔ پھر پہاڑوں کو گرد و غبار میں تبدیل کر کے زمین پھیلائی جائے گی۔ جیسے کہ قرآن میں ہے وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ[6]۔ وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۝ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا[7] پہاڑ اڑائے جائیں گے اور ریزہ ریزہ کئے جائینگے اور بن جائیں گے گرد و غبار پھیلے ہوئے۔ پھر نفخۂ دوم سے تعمیر منظم ہوگی اور حشر اموات ہو کر اللہ کے آگے صف بستہ کھڑے ہوں گے۔

زمین محشر

زمین محشر بھی زمین دنیا سے مختلف ہوگی۔ قرآن میں

یوم تبدل الارض غیر الارض ط — جس دن زمین تبدیل کی جائے گی۔ پہلی زمین سے مختلف۔ (   )

یہ تبدیلی ذاتی ہوگی یا صفاتی۔ ایک قول یہ ہے کہ ذاتی ہوگی دوم یہ کہ صرف صفاتی ہوگی۔ سوم یہ کہ ایک بار صرف صفاتی ہوگی اور دوسری مرتبہ ذاتی۔ مختار میں یہی ہے کہ صرف صفاتی ہوگی۔ بخاری و مسلم میں سہل بن سعد سے مرفوع حدیث آئی ہے۔ يُحْشَرُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

---

[1] الانشقاق آیۃ ۱ [2] [3] التکویر آیۃ ۱-۲ [4] الانفطار آیۃ ۳ [5] التکویر آیۃ ۶ [6] [7] الواقعہ آیۃ ۵-۶

عَلٰی اَرْضٍ بَیْضَآءَ عَفْرَاءَ کَقُرْصَۃِ النَّقِیِّ لَیْسَ فِیْھَا عَلَمٌ لِاَحَدٍ۔ اور صحیحین میں ابوسعید خدری سے مرفوع حدیث آئی ہے۔ تَکُوْنُ الْاَرْضُ خُبْزَۃً وَّاحِدَۃً جس کا معنی یہ ہے کہ لوگ ایسی زمین پر اٹھائے جائیں گے جو سفید گندم گونی کی طرف مائل ہوگی۔ جیسے میدے کی روٹی اس پر کسی قسم کا نشان نہ ہوگا۔ ابوسعید کی حدیث میں ہے کہ ہو جائے گی یہ زمین ایک روٹی۔ اور بعض روایات میں جو چاندی کا ذکر آیا ہے اس کا مطلب سفیدی میں چاندی سے مشابہت ہے نہ یہ کہ زمین درحقیقت چاندی کی ہوگی۔ بیہقی میں ابن مسعود سے بسند صحیح یہ الفاظ آئے ہیں۔ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ اَرْضًا کَاَنَّھَا فِضَّۃٌ۔ یعنی دنیا کی زمین ایسی زمین کی صورت میں تبدیل ہوگی کہ وہ چاندی کی طرح سفید ہوگی۔ ابن جریر نے زید بن ثابت سے مرفوعًا حدیث نقل کی ہے۔

اِنَّھَا تَکُوْنُ یَوْمَئِذٍ بَیْضَاءَ مِثْلَ الْفِضَّۃِ۔	یہ زمین اُس دن چاندی کی طرح سفید ہو جائے گی۔

راجح صفات کی تبدیلی ہے۔

اکل و شربِ مؤمن

مؤمن کا میدانِ حشر میں کھانا پینا۔ زمینِ محشر بمنزلہ کیک کی ہوگی۔ مؤمن اُس میں سے کھائیں گے۔ بدور السافرہ صـ۲۲ میں منقول ہے کہ مؤمن اپنے قدموں کی طرف اس سے کھائیگا اور کوثر کا پانی جو دُودھ سے سفید، برف سے ٹھنڈا اور شہد سے میٹھا ہوگا پیئے گا۔ حافظ ابنِ حجر فرماتے ہیں۔ تاکہ مؤمن کو حشر کے دراز عرصہ میں بھوک پیاس کی تکلیف نہ ہو۔ بدور السافرہ صـ۱۰۹ میں طبرانی کے معجم اوسط سے مرفوعًا حدیث منقول ہے کہ عرش کے نیچے دسترخوان اللہ کی طرف سے بچھ جائے گا جس پر ایسی نعمتیں اور کھانے پینے کی چیزیں اور پھل ہوں گے جو کسی نے نہ دیکھے ہوں گے نہ تصوّر میں آئے ہوں گے۔ ان پر روزہ دار مسلمان بیٹھ کر کھائیں گے اور اُن کی

پہچان یہ ہوگی کہ اُن کے منہ سے مشک و کستوری کی خوشبو کی لہریں پھیلیں گی۔

حوضِ کوثر

قرآن میں ہے اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ۔ ابنِ عباس فرماتے ہیں اس سے حوضِ کوثر مراد ہے۔ میدانِ حشر میں ہر پیغمبر کے لئے اُن کی اُمّت کے انداز پر حوض ہوں گے۔ حضور علیہ السلام کا حوض سب سے بڑا ہوگا۔ یہی مضمون ترمذی میں سمرہ سے مرفوع حدیث میں آیا ہے۔ حضور کوثر نبوی کا میدان حشر میں ہونا حضور علیہ السلام سے چھپن صحابہ نے نقل کیا ہے جن میں خلفاء اربعہ و عشرہ و مبشرہ بھی ہیں۔ بظاہر وہ حوض مربع متساوی الاضلاع شکل میں ہوگا۔ اور ہر ضلع ایک ماہ کی مسافت کی مقدار لمبا ہوگا اس کے آبخورے اور گلاس آسمان کے تاروں سے زیادہ تعداد میں ہوں گے وہ ستارے جو ہم کو اور عوام کو نظر آتے ہیں۔ پانی کا رنگ دُودھ کی طرح سفید، شہد سے میٹھا اور برف سے ٹھنڈا ہوگا۔ اس میں سے وہ لوگ پئیں گے، جو ایمان کے علاوہ متبع سُنت ہوں گے۔ مبتدعین کو دھکے دے کر دُور کیا جائے گا خواہ بدعت اعتقادی ہو جیسے خوارج، روافض، معتزلہ یا بدعتِ عملی ہو اور ظالموں کو بھی ہٹایا جائے گا۔ روایات حدیث بدور السافرہ ص۹۷ سے ص۱۰۳ تک ملاحظہ ہوں۔ حوضِ کوثر درحقیقت سنتِ نبوی یا کتاب و سنت کی جسمانی صورت ہے جس سے کتاب و سنت پر عامل حضرات مستفید ہوں گے کیونکہ آخرت میں اعمال جسمانی صورت اختیار کریں گے۔ بڑے اعمال مضر صورت اور نیک اعمال فائدہ مند اشیاء کی صورتیں۔

نامہائے اعمال

قرآن میں ان کا ذکر ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ	جن کو دائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال ملے گا،
فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا	وہ آسان حساب دے گا اور خوش ہو کر

وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا	جنت میں اہل وعیال کے ساتھ پہنچے گا اور
وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ	جس کو پشت کی طرف نامۂ اعمال ملے گا،
ظَهْرِهٖ ۙ فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا	وہ ہلاکت ہلاکت پکارے گا اور دوزخ
وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ۭ (الانشقاق: ۷-۱۲)	میں جا پڑے گا۔
فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ	جس کو دائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال ملے گا
فَيَقُوْلُ هَاۗؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ	وہ خوشی سے اوروں کو دکھائیگا کہ پڑھ لو
اِنِّىْ ظَنَنْتُ اَنِّىْ مُلٰقٍ	میرا نامۂ اعمال مجھے دنیا میں یقین تھا کہ
حِسَابِيَهْ ۚ (الحاقۃ: ۱۹-۲۰)	اس دن اللہ سے ملنا ضروری ہوگا۔
وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۥ	اور جس کو بائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال
فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ	ملے گا۔ وہ افسوس کرے گا کہ یہ نامۂ
كِتٰبِيَهْ ۚ (الحاقۃ: ۲۵)	اعمال مجھے نہ ملتا۔
اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ	خدا کا ہر ایک کو حکم ہوگا۔ پڑھ ڈال اپنا
الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۭ	نامۂ عمل اور تم خود اپنے حساب کے
(بنی اسرائیل: ۱۴)	لئے کافی ہو۔

بدور السافرہ ص۱۰۰ سے ص۱۰۹ میں احادیث کی بنیاد پر بیان کیا گیا ہے کہ لوح محفوظ سے تمام نامۂ اعمال عرش کو جو محشر میں لایا گیا ہوگا۔ جمع کر دیئے جائیں گے تو اللہ ایک ہوا بھیجے گا کہ ہر ایک کو اُس کا نامۂ اعمال جس ہاتھ میں دینا ہوگا۔ پہنچا دیا جائے گا اور ہر نامۂ عمل کی پہلی تحریر اِقْرَاْ كِتٰبَكَ جو اس کے نام اور باپ کے نام کے ساتھ پکار کر حکم دیا جائے گا پڑھا اور اَن پڑھ سب اپنا نامۂ اعمال پڑھ لیں گے۔ اس لئے حدیث میں آیا ہے کہ اولاد کے اچھے نام رکھا کرو۔ غیر ثابت النسب ماں کے نام سے بلائے جائیں گے۔ ناخواندہ لوگوں کا نامۂ اعمال کو پڑھنا خلاف عقل نہیں۔ جو علم خدا کسی کو تعلیم اُستاد کے ذریعہ سکھانا ہے۔

الہامی طریقے سے بغیر اُستاد کے بھی سکھاتا ہے جیسے انبیاء علیہم السّلام کے علوم اور حیوانات کے علوم مثلاً عنکبوت کو جالا بُننے کا علم، شہد کی مکھی کو چھتہ بنانے کا علم، چیونٹیوں کو اجتماعی امورات کا علم جو علم الحیوانات میں بیان ہے۔ خود اس زمانے میں نابیناؤں کو اُبھرے حروف کی کتاب دی جاتی ہے اور وہ اس پر انگلیاں پھراتے ہوئے پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ جس کو مشرقی پاکستان میں ہم نے خود دیکھا ہے۔

شہادت

۱۔ **شہادت انبیاء و علماء** اثبات جُرم کے لئے قابلِ اعتماد اور ثقہ گواہان کی شہادت ضروری ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ انسانوں کو انبیاء علیہم السّلام کے ذریعہ حق اور احکامِ خداوندی پہنچے ہیں یا اُس پر خود انبیاء علیہم السّلام بطور گواہ پیش ہوں گے اور اگر پہنچانے والے ورثۂ انبیاء یعنی علماء ہوں گے تو وہ پیش ہوں گے۔ قرآن میں ہے وَجِیْٓئَ بِالنَّبِیّٖنَ وَ الشُّھَدَآءِ۔ فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ بِشَہِیْدٍ وَّجِئْنَا بِکَ عَلٰی ھٰٓؤُلَآءِ شَہِیْدًا ط (نساء : ۴۰)

۲۔ **شہادت کرام کاتبین** دوم یہ کہ انسانوں نے احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی کی ہے یا نہ؟ اس پر تین قسم کی شہادتیں پیش ہوں گی۔ کراماً کاتبین جو معصوم ملائکہ ہیں۔ اُن کی شہادت یوم یقوم الاشہاد ای الملائکۃ۔ اِذْ یَتَلَقَّی الْمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الْیَمِیْنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ ہ مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْہِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ ط وَ جَآءَتْ کُلُّ نَفْسٍ مَّعَھَا سَآئِقٌ وَّ شَہِیْدٌ ط جب انسان کے اعمال کو دو فرشتے اخذ کرنے والے اخذ کرتے رہتے ہیں اور دائیں بائیں بیٹھے رہتے ہیں۔ کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالنے پاتا۔ مگر اُس کے پاس تاک لگانے والا تیار ہے اور ہر شخص اِس طرح آئے گا: کہ ایک فرشتہ اس کو میدانِ حساب میں لانے والا ہوگا اور ایک گواہ ہوگا۔ درمنثور میں حدیث مرفوع

ہے کہ یہ دو فرشتے وہی کاتبِ حسنات و کاتبِ سیئات ہوں گے۔

۳۔ شہادتِ اعضاء | شہادتِ اعضاء، فاعلہ یعنی جن اعضاء نے عمل کیا ہے وہ بھی گواہی دیں گے۔

اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓی اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَآ اَیْدِیْهِمْ وَ تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ط (یٰسٓ آیۃ: ۶۵)

آج ہم اُن کے منہ پر مُہر لگا دیں گے اور اور اُن کے ہاتھ ہم سے کلام کریں گے اور اُن کے پاؤں گواہی دیں گے۔ جو کچھ یہ لوگ کیا کرتے تھے۔

وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ یَّشْهَدَ عَلَیْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَآ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ ط

اور تم نہیں بچتے اِس سے کہ تم پر گواہی دیں گے تمہارے کان اور آنکھ اور کھالیں۔ (حٰمٓ السجدہ: ۲۲)

وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَیْنَا ط قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ط (حٰمٓ السجدہ: ۲۱)

اور کہیں گے اپنی کھالوں سے تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی وہ کہیں گی کہ گویا کیا ہم کو اُس خدا نے جس نے ہر چیز کو گویا کیا ہے اور اُس نے تم کو پہلی بار پیدا کیا اور اُسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔

۴۔ شہادتِ مکان | قرآن میں ہے یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا[1]۔ ابنِ عباس اِس آیت کی تفسیر فرماتے ہیں کہ زمین خبر دے گی جو کچھ عمل انسان نے اُس پر کیا ہے۔

یہ کل چار قسم کی شہادتیں ہوئیں۔ اوّل و دوم انبیاء علیہم السّلام اور ملائکہ کی شہادت ہے اور وہ دونوں معصوم ہیں۔ اس لئے اُن کی شہادت قابلِ اعتماد ہے۔ باقی اخیر کی دو[2] شہادتیں یعنی اعضاء اور مکان عمل کی شہادت ہے یہ بوجہ خرق عادت ہونے کے قابلِ اعتماد ہیں کیونکہ بظاہر زبان کے سوا اور اعضاء۔ اسی طرح زمین جہاں پر گناہ ہوا، شہادت اور کلام

[1] الزلزال آیۃ ۴

پر قدرت نہیں رکھتے۔ یہ بطور خرقِ عادت شہادت دیں گے اور خرقِ عادت فعلِ الٰہی ہے جس سے ان دونوں کے بیان کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ اعضاء نے جو کچھ بولا یا زمین نے، یہ درست اور صحیح ہے۔ یہ شبہہ نہ کیا جائے کہ اعضاء اور زمین کس طرح بولیں گے کیونکہ جب انسان ایک قول کو جامد ٹیپ ریکارڈ میں بند کر کے سوئی پھیرنے سے جامد اور بے جان سے وہی ٹیپ کردہ باتیں ظاہر کر سکتا ہے تو خالقِ کائنات بھی ایسا کر سکتا ہے کہ انسان کے اقوال وافعال کو اعضاء انسانی اور زمین کے قطعات میں ٹیپ کر کے میدانِ حساب میں مشیتِ الٰہی کی سوئی پھیر کر اُن سے نطق کرالے۔ اس کے علاوہ انسان کے دیگر اعضاء اور زبان میں بات کرنے کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں بجز اس کہ خالقِ کائنات نے زبان میں نطق اور کلام کی قابلیت اور استعداد رکھی ہے اور دوسرے اعضاء میں نہیں رکھی اب وہ ایسا کر سکتا ہے کہ زبان سے وہ قدرت سلب کر دے اور دیگر اعضاء میں وہ قابلیت پیدا کر دے یا زبان کی قابلیت دیگر اعضاء کی طرف منتقل کر دے۔ اس کے علاوہ جدید تحقیق کی بنیاد پر جمادات، نباتات، حیوانات انسان میں حسبِ مراتب زندگی بھی ہے اور گویائی بھی۔ لیکن انسان کے علاوہ دیگر اشیاء کی گویائی انسان کی قوتِ سامعہ سے مستور اور پوشیدہ ہے۔

آیات | وقالت نملة - وعلمنا منطق الطير - وان منها لما يهبط من خشية الله - يسبح لله ما في السموات والارض - كل قد علم صلوته وتسبيحه - حضور علیہ السلام کو سلام حجر اور کلامِ جبل احادیث میں ثابت ہے۔ یہ سب دال ہے کہ ان سب کو نطق حاصل ہے جس کو ہم دنیا میں نہیں سنتے۔ وہ بطور خرقِ عادت آخرت میں مسموع ہوگا کیونکہ آخرت جہانِ خوارق ہے۔ قیامت میں انسان کے تمام اعمال خدا کو معلوم ہیں۔ اس لحاظ سے نہ شہادت کی ضرورت تھی نہ تحریری ثبوت اور نامۂ اعمال کی حاجت تھی لیکن شرعی اور قانونی ضابطہ کے تحت یہ ضرور ہیں کہ اعمال قلم بند ہوں تاکہ تحریری ثبوت عدالتِ الٰہی میں پیش کیا جاسکے اور اگر مجرم نے فراموش کر دیا ہو تو اس کو تحریر دکھلا کر یاد دلایا جائے اور

اگر پھر بھی تردد ہو تو اس کے اثبات پر شہادت عادیہ جیسے انبیاء علماء اور ملائکہ کی شہادت ہے اس کو پیش کیا جائے اور مزید تقویت ثبوت کے لئے معجزانہ شہادتِ اعضاء اور زمین کی بھی پیش کی جائے تاکہ ثبوت میں کسی قسم کا تردد نہ رہے۔ یہ سب شہادتیں ایسی ہیں جو معتمد ہونے کے علاوہ غیر جانبدار بھی ہیں اور اُن پر کسی قسم کی جرح نہیں کی جاسکتی کیونکہ بنیادی جرحیں دو ہیں شہادت کو ناقابلِ اعتماد گردانا اور ظاہر ہے کہ شہادتِ عادیہ انبیاء اور ملائکہ ہے اور علماء کی شہادت تصدیقِ نبی سے مؤید ہے اور شہادت خارقہ اعضاء و زمین بھی معتمد ہے اور یہ چاروں شہادتیں غیر جانب دار بھی ہیں کیونکہ جانب داری گناہ ہے اور انبیاء اور ملائکہ معصوم ہونے کی وجہ سے گناہ سے پاک ہیں۔ باقی اعضاء اور زمین کے متعلق تو گناہ کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا کہ زمین مکلف نہیں اور عضوِ انسانی انسان سے الگ ہو کر مکلف نہیں اور اس کی جانب داری کا تصور تو اس لئے نہیں کیا جاسکتا کہ شہادت اعضاء کی صورت میں خود اعضاء کا ضرر ہے کہ خود اعضاء کو اسی جرم مشہود علیہ پر جہنم کی سزا ہوگی۔

وزنِ اعمال

قرآن کا ارشاد ہے۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ط وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ط وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ط (الانبیاء: ۴۷)	ہم انصاف کے ترازو قیامت کے دن رکھیں گے پھر کسی نفس پر ظلم نہ ہوگا اور اگر عمل کی مقدار رائی کے دانے کے برابر ہوگی۔ ہم اس کو لائیں گے اور ہم حساب لینے کے لئے کافی ہیں۔
وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ٍالْحَقُّ ط	قیامت کے دن اعمال کا تول حق ہے۔
فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ٥	جس کی بھاری ہوئیں تولیں تو وہ

فَهُوَ فِیْ عِیْشَۃٍ رَّاضِیَۃٍ ط — رہے گا من مانے گذران میں اور جس
فَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُہٗ ہ — کی ہلکی ہوئیں تولیں۔ تو اُس کا
فَاُمُّہٗ ھَاوِیَۃٌ ط (القارعۃ:۶-۹) — ٹھکانا گڑھا ہے۔

ان آیات و دیگر آیات اور متعدد احادیث اور اجماعِ اہلِ سُنّت سے آخرت میں اعمال کا تولا جانا حق ہے البتہ معتزلہ اور سلف میں مجاہد اعمش اور ضحاک کی رائے یہ ہے کہ قرآن میں جہاں وزن کا ذکر ہے اس سے اعمال کا تول مراد نہیں۔ بلکہ منصفانہ فیصلہ اور عدلِ الٰہی مراد ہے لیکن یہ رائے بقول امام آمدی اس لئے غلط ہے کہ میزان قرآن میں ثقل وخفت یعنی بھارے اور ہلکے ہونے کے ساتھ موصوف ہے۔ لیکن انصاف کو بھارا اور ہلکا نہیں کہا جاسکتا اور ... وہ ثقل اور خفت سے موصوف ہوسکتا ہے اس لئے جمہور کی رائے درست ہے کہ جس ترازو سے اعمال کا وزن ہوگا وہ جسمانی اور حسّی ہوگا۔ معنوی میزان بمعنی انصاف مراد نہیں جیسے معتزلہ کا خیال ہے۔ میزان حسّی کے ثبوت میں سلمان فارسی سے مرفوع حدیث آئی ہے۔

یُوْضَعُ الْمِیْزَانُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ — ترازو کھڑا کیا جائے گا جو اس قدر کشادہ ہوگا
فَلَوْ وُضِعَ فِیْہِ السَّمٰوٰتُ — اگر تمام آسمان اور زمین اس میں رکھے جائیں
وَالْاَرْضُ لَوَسِعَۃٌ۔ — تو اس میں سما سکتے ہیں۔

اس حدیث کو حافظ ابنِ حجر نے بخاری کی آخری حدیث کی شرح میں حاکم سے بروایت سلمان اور ابنِ مردویہ سے بروایت عائشہ اور بیہقی سے بروایت انس اور طبرانی سے بروایت ابوہریرۃ نقل کی ہے اور سلمان کی روایت ابن المبارک نے کتاب الزہد ابوالقاسم الالسکائی نے کتاب السُّنۃ نیز الوسی نے تفسیر سورۃ اعراف میں نقل کیا۔

میزان واحد ہے یا متعدد | حافظ ابنِ حجر کی رائے یہ ہے کہ میزان واحد ہے اور جمع کی تعبیر جو قرآن میں آئی ہے جیسے مندرجہ صدر روایت میں موازین آیا ہے یا باعتبار اعمال متعدد کے جمعیۃ اعتباری ہے یا تعظیم کی وجہ سے جمع لایا گیا ہے کہ میزانِ آخرت اگرچہ ایک ہے لیکن

عظیم ہونے کی وجہ سے ایسا ہے کہ کثیر التعداد کہلانے کا مستحق ہے جیسے كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِيْنَ حضرت نوح علیہ السلام سے تعظیم مرسلین کے ساتھ تعبیر کی گئی ہے اور بعض کی رائے یہ ہے کہ حقیقۃً میزان متعدد ہے یا ہر آدمی کے لئے ایک میزان ہے یا ہر عمل کیلئے جداگانہ میزان ہے پہلا قول راجح ہے۔

موزون لہم کا بیان کن اشخاص کے اعمال تولے جائیں گے۔ قسطلانی نے امام غزالی سے نقل کیا ہے کہ تین گروہ کے اعمال نہیں تولے جائیں گے باقی سب مکلفین کے اعمال تولے جائیں گے۔ وہ تین گروہ معصومین انبیاء علیہم السلام اور میرے نزدیک اطفال المسلمین بھی اس میں داخل ہیں اور مجنونین وقت بلوغ بھی دوسرا گروہ جو بلا حساب جنت میں داخل ہوگا وہ چار ارب نوے کروڑ ہیں۔ تیسرا گروہ کفار کیونکہ اعمال میں باہمی وزن ہوگا اور اس کے لئے متضاد اعمال کا ہونا ضروری ہے جو ان تینوں گروہوں میں نہیں۔ اسی طرح آیت فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا میں قرآنی تصریح ہے کہ ہم کفار کے لئے وزن قائم نہیں کریں گے لیکن امام بخاری کی رائے تعمیم ہے کہ انہوں نے ان اعمال بنی آدم وقولهم يوزن فرمایا کہ آدم کی اولاد کا عمل وقول تولا جائے گا۔ یہی قول مختار، حافظ ابن حجر اور علامہ الوسی کا ہے۔ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا میں مراد وزن سے تول نہیں بلکہ قدر اور مرتبہ ہے یعنی کفار کے اعمال کے لئے خدا کے ہاں قدر و منزلت نہ ہوگی۔ باقی اعمال متضادہ کا جواب امام قرطبی نے یہ دیا ہے کہ ایک پلڑا کفار کا نیکیوں سے خالی ہوگا کیونکہ کفر کے ساتھ کوئی نیکی نیکی نہیں رہتی۔ اور دوسرے پلڑے میں کفر اور گناہ ہوں گے تو یہ پلڑا بھاری ہوگا۔ یا اگر کفار کے صدقات اور خیرات کا تخفیف عذاب میں اثر مانا جائے کیفاً نہ کماً تو وہ ایک پلڑے میں ہوں گے اور دوسرے پلڑے میں کفر اور گناہ ہوں گے تو کفر والا پلڑا بھارا ہوگا۔ تیسرا قول شرح عقائد نسفی میں امام ماتریدی سے منقول ہے کہ کفار کے لئے میزان تمیز ہوگا کہ اس کے ذریعہ کفار کے مختلف طبقات میں ان کے اعمال تول کر یہ فیصلہ ہوگا کہ کن کفار کے گناہ زیادہ ہیں۔ کن کے کم۔ تاکہ ابدی عذاب

میں شریک ہونے کے باوجود اُن کے گناہوں کی کثرت وقلت کے مطابق ان کے مناسب اعمال طبقات متعین کیے جائیں۔ حافظ ابن حجر نے بھی قصہ ابی طالب و ابی لہب سے استدلال کر کے کفار کی بعض نیکیوں کو تخفیفِ عذاب میں مؤثر تسلیم کیا ہے۔ سورۃ مؤمنین جزء ۱۸ کے آخر کی آیت سے کفار کے اعمال کا وزن ثابت ہوتا ہے۔ آیت یہ ہے۔

وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِیْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ۝ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِیْهَا كٰلِحُوْنَ ۝ اَلَمْ تَكُنْ اٰیٰتِیْ تُتْلٰی عَلَیْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ (الآیۃ ۱۰۳-۱۰۵)

جن کے تول ہلکے ہوں گے یہ وہ لوگ ہونگے جو اپنے نفسوں کو نقصان میں ڈالے ہوئے ہیں جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ دوزخ کی آگ اُن کے چہروں کو جلائے گی اور اُن کے منہ اس میں بگڑے ہوئے ہونگے ان سے کہا جائیگا کیا تم کو ہماری آیتیں نہیں سُنائی گئیں۔ جن کو تم نے جھٹلایا۔

آخری فقرہ سے جس میں تکذیبِ آیات کا ذکر ہے ان کا کافر ہونا ثابت ہوا اور آیت کا پہلا فقرہ خفت موازینہ سے ان کے اعمال کا وزن ثابت ہوا۔

بیان الموزون میزان میں کیا چیز تولی جائے گی۔ اس میں تین قول ہیں۔ اوّل ابن عباس کا قول ہے کہ اعراض و اعمال کو اجسام بنا کر تولا جائے گا۔ اس کو قسطلانی نے بلفظ یُقَلِّبُ اللّٰهُ الْاَعْرَاضَ اَجْسَامًا کے نقل کیا ہے اور بدور السافرہ ص۱۳۵ میں شعب الایمان بیہقی سے بلفظ یُؤْتٰی بِالْحَسَنَاتِ بِاَحْسَنِ صُوْرَةٍ وَیُؤْتٰی بِالسَّیِّئَاتِ بِاَقْبَحِ صُوْرَةٍ کے ساتھ نقل کیا۔ یعنی نیکیوں کو اچھی صورت اور گناہوں کو بُری صورت میں لایا جائے گا۔ اس قول کو طیبی نے شرح مشکوٰۃ میں ترجیح دی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ نامہائے اعمال تولے جائینگے جن کا بوجھل اور ہلکا ہونا اعمال کی نوعیت پر ہوگا۔ جس کی دلیل حدیث البطاقہ ہے۔ جس کو امام ترمذی نے عبداللہ ابنِ عمرو بن العاص سے نقل کر کے اس کی تحسین کی ہے اور ابن حبان

نے بھی اس کو اپنے صحیح میں لایا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

يُؤْتٰى بِتِسْعٍ وَّتِسْعِيْنَ سِجِلًّا	یعنی ننانوے دفتر لاکر ایک پلڑے میں رکھے
فَتُوْضَعَ فِىْ كَفَّةٍ وَيُؤْتٰى بِالْبِطَاقَةِ	جائیں گے اور پرچی دوسرے پلڑے میں۔
فَتُوْضَعُ فِىْ اُخْرٰى۔ فَطَاشَتِ	ننانوے دفتر ہلکے ہوں گے اور پرچی بھاری
السِّجِلَّاتُ وَثَقُلَتِ الْبِطَاقَةُ	ہو جائے گی۔

اس کو امام الحرمین نے ترجیح دی اور کہا کہ ثقل اجر کے انداز پر ہوگا۔ قرطبی نے بھی اس کو ترجیح دی اور یہ ابن عمر کا قول ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ نفسِ اعمال تولے جائیں گے جس پر ابو داؤد اور ترمذی کی مرفوع حدیث دال ہے اور ابن حبان نے اس کی تصحیح کی۔ لفظ حدیث یہ ہے۔

مَا يُوْضَعُ فِى الْمِيْزَانِ اَحْسَنُ	میزان میں اخلاق حسنہ سے بڑھ کر کوئی
مِنْ خُلُقٍ حَسَنٍ۔	عمل نہیں رکھا جائے گا۔

اس کو حافظ ابنِ حجر نے ترجیح دی ہے۔ اعمال کا قول پہلے زمانہ میں بعید از عقل سمجھا جاتا تھا لیکن تھرما میٹر سے بدن کی گرمی یا موسم کا درجۂ حرارت معلوم کیا جاتا ہے حالانکہ عرض ہے۔ اِس لئے اب اس میں استبعاد نہیں رہا۔ ہمارے نزدیک ان اقوال میں اختلاف نہیں یہ ہو سکتا ہے کہ تینوں طریقوں سے وزن اعمال ہو۔ اعمال کو اجسام بنا کر تولنا، نامہائے اعمال کا تولنا، خود نفسِ اعمال کا تولنا۔ تینوں طریقے برتے جائیں گے تاکہ انسان کی قسمت کے آخری فیصلے صادر ہونے میں شک و شبہہ کی گنجائش نہ رہے۔ ذہبی نے فضل علم میں عمران بن حصین سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث لائی کہ علماء کی سیاہی اور شہداء کا خون تولا جائے گا تو علماء کی سیاہی بھاری ہوگی۔ (بدور صہ۱۴۱)

وازن اعمال تولنے کے لئے تولنے والا ضروری ہے۔ وہ کون ہوگا؟ مختلف روایات کے تحت اس میں چار اقوال ہیں۔

۱- اللہ جل مجدہ تولنے والا ہوگا۔ یہی امام غزالی کا قول ہے۔ الدرۃ الفاخرۃ فی کشف علوم الآخرۃ میں۔ جس کی دلیل قرآن کی آیت ونضع الموازین، ہم رکھیں گے تولوں کو اس میں اللہ نے اپنی طرف نسبت کی ہے۔

۲- دوسرا قول یہ ہے کہ وازن ملک الموت ہوگا۔ بہتوں نے انس بن مالک سے اس کی روایت کی ہے۔

۳- سوم یہ کہ وازن حضرت آدم ہوں گے۔ طبرانی نے معجم صغیر میں ابوہریرۃ سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے۔

یَا اٰدَمُ قَدْ جَعَلْتُکَ حَکَمًا بَیْنِیْ	اے آدم میں نے تم کو منصف ٹھہرایا ہے اپنے اور آپ کی
وَبَیْنَ ذُرِّیَّتِکَ قُمْ عِنْدَ الْمِیْزَانِ۔	اولاد کے درمیان۔ جاکر کھڑے ہو میزان کے پاس۔

۴- چوتھا قول یہ ہے کہ وازن حضرت جبرئیل ہوں گے۔ اس کو ابوالقاسم الالاسکائی نے حذیفہ کی روایت سے نقل کیا ہے۔

میرے نزدیک ان چار اقوال میں کوئی اختلاف نہیں۔ چاروں قول درست ہیں۔ اللہ جل مجدہ اس لحاظ سے تولنے والا اور وازن ہے کہ قول کا حکم وہی دے گا۔ اس لئے اللہ کو نسبت بحیثیت آمر کے ہے۔ ملک الموتؑ نے دنیا سے آخرت کی طرف مردگان کا چالان کیا ہے۔ جس طرح پولیس چالان کرتی ہے۔ تو عدالت الٰہیہ میں چالان کنندہ عملہ یعنی ملک الموت کی حاضری اور بیان بھی ضروری ہے۔ جیسے انسانی عدالتوں میں پولیس کا بیان لیا جاتا ہے۔ حضرت جبرئیلؑ چونکہ قانون الٰہی، قرآن کے پہنچانے والے ہیں اس لئے آپ کی موجودگی مقدمہ قانون شکنی کی پیشی میں ضروری ہے۔ حضرتؑ آدم کی اولاد کا مقدمہ درپیش ہے اس لئے بحیثیت سرپرست آپ کی حاضری بھی ضروری ہے۔

وزن اعمال کی حکمت اعمال کے تولنے سے اللہ کی کوئی غرض وابستہ نہیں۔ وہ عالم الغیب ہونے کے لحاظ سے اعمال کے ایک ایک ذرہ سے باخبر ہے بلکہ وزن اعمال عدالتی

کارروائی کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔

ا۔ تاکہ نامۂ اعمال کے ذریعہ خود عمل کرنے والوں کو اپنے اعمال کا علم ہو جائے اور اگر بھول گئے ہوں تو یاد آجائے جیسے ڈائری میں نظر ڈالنے سے گذشتہ آمور یاد آجاتے ہیں اور نفسیاتی طور پر تسلیم کرلیں کہ یہ سب کچھ درست ہے خواہ زبان سے اقرار کریں یا نہ۔ جیسے اِقْرَاْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ حَسِيْبًا میں اسی حکمت کی طرف اشارہ کیا گیا۔

۲۔ دوم یہ کہ وزنِ اعمال سے اعمال کی مقدار عام طور پر معلوم ہو جائے تاکہ اعمال نیک کی جزاء سے اللہ کے فضل اور احسان کا ظہور ہو اور اعمالِ بد کی سزا میں اللہ کے عدل کا ظہور ہو کہ مجرم کے ساتھ بے انصافی نہیں ہوئی۔

۳۔ شہادتِ انبیاء علیہم السلام و علماء و شہادتِ ملائکہ، شہادتِ اعضاء اور شہادتِ قطعاتِ زمین سے یہ ظاہر کیا جائے کہ جو کچھ عدالتی کارروائی ہو رہی ہے وہ مبنی بر حقیقت ہے۔

۴۔ اس سب کارروائی سے یہ بھی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ یہ سب انتظامات انسانی اعمال کی اہمیت کو ظاہر کر رہے ہیں کہ کائنات کی تخلیق کا مقصد یہی نتائج اعمال تھے۔ اسی وجہ سے اس کے لئے یہ وسیع انتظامات کئے گئے۔

راجح اور مرجوح کی پہچان نیکی اور بدی کے پلڑے کے بھاری اور ہلکے ہونے کی معرفت کی علامت کیا ہوگی۔ اس میں تین اقوال ہیں۔

ا۔ جمہور کا قول یہ ہے کہ دنیا کے دستور کے مطابق نیچے جھکنے والا پلڑا اُس کے بھاری ہونے اور اوپر چڑھنا اُس کے ہلکے ہونے کی نشانی ہے جیسے دنیا کے تول میں یہی قاعدہ ہے۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ دُنیا کے دستور کے برعکس ہوگا کہ جو پلڑا اوپر چڑھے گا وہ بھارا ہوگا۔ اور جو نیچے جھکے گا وہ ہلکا ہوگا کیونکہ حیز اور مرکز میلان کی آخرت میں تبدیل ہوگی۔ نیکیوں کا مرکز اوپر ہوگا جہاں جنت ہے اور بدیوں کا مرکز نیچے ہوگا جہاں دوزخ ہے۔ یہی قول بدرالدین زرکشی کا ہے البرہان فی علوم القرآن میں اور شاہ عبدالعزیز کا مختار ہے فتح العزیز میں۔

۳۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اگر حسنات کے پلے سے نورانی ستون نکلے تو نیکی کا پلہ بھاری ہے اور اگر سیئات کے پلے سے ظلمانی اور سیاہ ستون نکلے تو سیئات کا پلہ بھاری ہے۔ اس کو علامہ الوسی نے تفسیر سورۃ قارعہ میں نقل کیا ہے۔

مقام وزن حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں اور ابوالقاسم اللالکائی نے کتاب السنۃ میں نقل کیا ہے کہ میزان نصب کیا جائیگا اللہ کے سامنے۔ حسنات کا پلہ عرش سے دائیں طرف اور سیئات کا عرش کے بائیں طرف ہوگا۔ حسنات کے بالمقابل جنت اور سیئات کے بالمقابل دوزخ ہوگا۔

عبورِ صراط و نور قرآن میں ہے۔

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ	یعنی تم میں سے کوئی نہیں جو پل صراط کے
عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۝	ذریعہ دوزخ پر وارد نہ ہو۔ یہ اللہ کا قطعی
ثُمَّ نُنَجِّى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّ	فیصلہ ہے پھر ہم اللہ سے ڈرنے والوں کو بچا
نَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ۝	دیں گے اور ظالموں کو آیں گھٹنوں کے بل
(سورۃ مریم آیۃ ۷۱-۷۲)	گرا کر چھوڑیں گے۔

اس آیت میں سب کے لئے دوزخ میں وارد ہونا مذکور ہے۔ مسند احمد حاکم نے تصحیح سند کے ساتھ اور بیہقی نے ابوسمیۃ سے باسناد جابر مرفوعاً نقل کیا ہے کہ وارد کا معنی داخل ہونا ہے اور اسی طرح مستدرک حاکم میں ابن مسعود و ابن عباس سے بھی منقول ہے جس سے سب کا جہنم میں دخول مراد لیا گیا ہے۔ امام قرطبی نے اس قول کو ترجیح دی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وارد ہونے سے گزرنا پل صراط پر مراد ہے داخل ہونا نہیں۔ یہ نووی کا مختار ہے۔ یہ قول مسند احمد اور ترمذی میں ابن مسعود سے مرفوعاً منقول ہے جس میں مذکور ہے کہ بعض اعمال کے اندازے کے مطابق بجلی کی طرح گزریں گے۔ بعض ہوا کی طرح، بعض تیز گھوڑے، بعض پرندوں کی طرح اور بعض سواری کی طرح گذریں گے اور بعض کو آگ لگے گی زخمی ہو کر بچیں گے اور بعض گر پڑیں گے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ وارد سے قریب ہونا مراد اور دوزخ کو دیکھنا مراد ہے کہ حساب دوزخ کے قریب ہی ہوگا۔ پھر کافروں کو اس میں ڈالا جائے گا اور مسلمانوں کو جنت پہنچایا جائے گا جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ولما ورد ماء مدین آیا ہے یعنی حضرت موسیٰ جب مدین کے پانی پر وارد ہوئے جس کا معنی پانی میں داخل ہونا نہیں بلکہ اُس کے قریب اور پاس ہونا مراد ہے۔ اگر پہلا قول لیا جائے تو داخل ہونا عذاب کو مستلزم نہیں کیونکہ آگ لوگوں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح برد اور سلام بن جائے گی۔ جیسے طبرانی اور بیہقی میں خالد بن معدان سے منقول ہے کہ مومنوں کو پتہ بھی نہ لگے گا۔ وہ کہیں گے کہ میں تو حسب وعدہ دوزخ پر وارد نہ ہوا۔ اللہ کی طرف سے جواب دیا جائے گا مَرَرْتُمْ عَلَيْهَا وَهِيَ خَامِدَةٌ۔ تم اس پر گذرے لیکن وہ بجھی ہوئی تھی۔ طبرانی اور ابن عدی نے یعلی بن منیہ سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ دوزخ مومن کو کہے گی کہ گذر جا تیرے نور نے میری گرمی بجھا دی۔ جز یا مومن اطفأ نورك لهبي۔ بدور السافرہ صـ۱۵۲ و صـ۱۵۳۔ پل صراط کے خطرناک وقت میں تاریکی ہوگی۔ ہتھیلی نظر نہ آئے گی۔ مومنوں پر اعمال کے مطابق ایمانی نور تقسیم ہوگا۔ بعض کے ساتھ پہاڑ کے برابر روشنی ہوگی۔ بعضوں کے پاس درخت کھجور کے برابر اور کم سے کم عمل والوں کے پاس انگوٹھے کے برابر۔ ابن جریر عن ابن مسعود۔ جس کو دیکھ کر منافق مومنوں سے درخواست کریں گے۔

اُنْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ۔	کہ کچھ ٹھیر جاؤ کہ ہم تمہاری روشنی میں گذر جائیں۔
قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَاءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا۔	وہ جواب دینگے واپس جاؤ دنیا میں وہاں سے نور حاصل کر کے لاؤ۔

کیونکہ نور عمل سے حاصل ہوتا ہے اور دار العمل دنیا ہے نہ آخرت۔ آخرت دار الجزاء ہے۔

(بدور السافرہ مع تشریح صـ۱۴۵ و صـ۱۴۶)

حقیقت صراط

پُل صراط کی ہیئت ریلوے اسٹیشن کے پُل کی طرح معلوم ہوتی ہے۔ ابنِ عساکر نے فضیل بن عیاض سے نقل کیا ہے کہ جہنم کے اوپر پُل صراط کا طول پندرہ ہزار سال کی مسافت کے اندازہ پہ

ہے۔ ایک تہائی حصہ چڑھنا ہے اور ایک تہائی اُترنا اور ایک تہائی سیدھا برابر چلنا ہے۔ بدور صـ ۱۴۹ بیہقی میں انس سے مرفوعاً منقول ہے کہ ادق من الشعر واحد من السیف۔ اسی طرح مسلم میں ابو سعید خدری اور ابن جریر میں ابن مسعود سے اور مستدرک حاکم میں بعض کے حق میں بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے تیز ہوگا اور بعض کے حق میں کشادہ میدان کیطرح ہوگا۔

پُل صراط اور نُور کی حکمت

پُل صراط پر چلنا موقف یعنی میدان حساب سے شروع ہوگا اور یہ پُل دوزخ کے اُوپر ہے اور گذر جانے کے بعد جنت کی حد شروع ہوگی اور جنت میں داخلہ ہوگا۔ جیسے کہ بدور السافرہ میں روایات سے ثابت ہے۔ اگر سب کو گزرنا ہے جیسے کہ ایک قول یہ ہے تو اہلِ تقویٰ کو اس میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی اور کفار اور فجار کو تکلیف ہوگی۔ یہ اس صورت میں کہ وارد سے مرور یعنی گزرنا مراد ہو اور اگر دخول مراد ہو جیسے کہ ایک قول یہ بھی ہے تو بھی اتقیاء کو کوئی تکلیف نہ ہوگی کیونکہ اُن کے مرور اور گذرنے کے وقت آتشِ دوزخ برد وسلام ہوگی اور اُس کی تپش نور ایمان سے بجھ جائے گی جیساکہ ہم نے اس کی روایات نقل کی ہیں اور خود قرآن میں بھی مذکور ہے۔ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوا وَّ نَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا۔ (مریم آیۃ ۷۱ و ۷۲) پھر ہم تقویٰ والوں کو پُل صراط اور آتشِ دوزخ سے نجات دیں گے اور کفار وفجار کو اس میں گھٹنوں کے بل گرادیں گے۔ باقی اگر نفسِ پُل کی باریکی اور اُس کی دھار کی تکلیف کے خیال سے گزرنے میں تکلیف کا اندیشہ ہو تو وہ بھی نہ ہوگا کیونکہ ہم نے گذشتہ روایت میں ثابت کیا کہ پُل صراط کی بال سے باریک ہونا اور تلوار کی دھار سے تیز ہونا سب گذرنے والوں کے حق میں نہیں۔ کفار یا بعض فجار کے حق میں ہے۔ اتقیاء کے حق میں ایک وسیع سڑک اور میدان کی طرح ہوگا۔ جس سے معلوم ہوا کہ اس پل میں گذرنے والوں کے اعمال کے مطابق مختلف شعبے اور شاخیں ہیں۔ ہر ایک کو اپنے اعمال کے مطابق کی راہ سے گزرنا ہوگا۔ دوسری صورت کہ اگر بالفرض سب کی ایک ہی گذرگاہ ہے تو بھی مؤمن کے لئے ڈر نہیں۔ جیسے امام بدرالدین زرکشی نے البرہان فی احکام القرآن میں ذکر کیا

ہے کہ عالمِ آخرت میں حیز اور مرکز بدلا جاتے گا۔ دنیا کے دستور کے مطابق نہ ہوگا۔ بلکہ بقول شاہ ولی اللہ احکامِ روح احکامِ بدن پر غالب ہوں گے لہٰذا کفار کے لئے مرکز میلان نیچے یعنی جہنم کی طرف ہوگا اور اتقیاء اور نیکو کاروں کے لئے مرکز میلان اوپر جنت کی طرف ہوگا۔ جس سے کفار پل بھر بوجھ پڑ جانے کی وجہ سے زخمی ہوں گے، لڑکھڑائیں گے، گریں گے۔ اور اتقیاء کا جھکاؤ اوپر کی طرف ہوگا۔ تو پل بھر بوجھ نہ ہوگا تو وہ تکلیف سے محفوظ رہیں گے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ اگر آدمی تلوار کی دھار پر قدم رکھے تو تکلیف ہوگی لیکن اگر قدم ہوا میں اٹھا کر اس قدم پر تلوار رکھ دیں تو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ کیونکہ قدم کا جھکاؤ تلوار کی طرف نہیں بلکہ نیچے کی طرف ہے۔ احیاز اور مرکز میلان کی تبدیلی کا سبب یہ ہے کہ کفار نے جہنمی اعمال دنیا میں کئے ہیں جن کو اپنے مرکز جہنم کی طرف میلان اور جھکاؤ ہے اور اتقیاء نے جنتی اعمال کئے تھے جن کی وجہ سے انہوں نے اپنے عملوں میں اوپر یعنی جنت کی طرف میلان اور جھکاؤ پیدا کیا۔ باقی جہنم کفر و معصیت کی صورت مثالی ہے اور جنت ایمان و طاعت کی صورت مثالی ہے اور پل صراط شریعت اسلامی کی صورت مثالی ہے۔ گناہوں کا مزاج ناری و ظلماتی ہے اور گرم ہے اور طاعت اور نیکی کا مزاج نوری، بارد اور سرد ہے جسکی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا میں اشارہ ہے۔

اَللّٰھُمَّ اغْسِلْ خَطَایَ بِمَاءِ الثَّلْجِ وَالْبَرَدِ۔ — اے خدا میرے گناہوں کو برف اور اولوں کے پانی سے دھو کر دور کر۔

صحیحین کی حدیث میں آیا ہے۔

حُفَّتِ الْجَنَّۃُ بِالْمَکَارِہِ وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّھَوَاتِ ط — جنت کو تکلیفات نے گھیرا ہے اور دوزخ کو خواہشات نے۔

لہٰذا جنت جانے تک دوزخ کے پل پر گزر جانے سے اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ جو اس پل سے بچ کر سالم گذر کر جنت پہنچ گئے یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے شریعت پر چلنے کے لئے ہر قسم کی تکلیفات اٹھا کر جنت کی سڑک تیار کی تھی اور نورانی اعمال کی وجہ سے اس نورانی دارالسلام اور بہشت میں پہنچ گئے اور جن لوگوں نے شریعت کی سڑک اور پل پر گزرنا ترک کیا تھا۔ یا کچھ

شریعت پر چلے تھے اور کچھ طبیعت پر، ان کی گذرگاہ اور شاہراہِ جنت ان کے لئے جیسے دنیا میں ان کو سخت دشوار اور ناگوار معلوم ہوتی تھی وہی ناگواری اور دشواری صراط کی شکل میں پیش کی گئی کہ اب ان کو جنت کی رسائی مشکل ہوئی۔ دنیا میں ان کو شریعت اسلامی کی راہ پر چلنا دشوار تھا۔ جس کی وجہ سے آخرت میں اس شریعت کی شکل ہیبتناک اور بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے تیز شکل میں بصورت پُل صراط پیش کی گئی۔ شریعت پر دنیا میں چلنا اتقیاء اور صلحاء کیلئے آسان تھا۔ اسی شریعت کو اُن کے آگے آسان شکل میں پیش کیا گیا اور جیسے جنت کی شاہراہ اور سڑک دنیا میں صرف ایک تھی یعنی شریعت اسلامی۔ جن کو دنیا میں اس پر گزرنا آسان تھا آخرت میں بھی آسان ہوگا اور اس کو عبور کرکے جنت میں داخل ہوں گے اور جن کے لئے شریعت پر چلنا مشکل تھا اور نفس اور خواہشات کی پیروی آسان تھی اُن کے لئے پُلصراط پر گزرنا اور جنت تک رسائی ناممکن ہوگی اور پُل پر قدم رکھنے کے ساتھ اپنے مرکز میلان یعنی خواہشات اور گناہوں کے مرکز یعنی دوزخ میں جا پڑیں گے۔ یہی حقیقت ہے کہ پُل صورت کی آخرت کا سارا نقشہ دنیاوی اعمال کی شکل وصورت پر بنایا گیا ہے۔

نُور کے اسباب

الصلوٰۃ نُور۔ واتبعوا النور الذی انزل معہ۔ اَلصَّبْرُ ضِیَاءٌ۔ وَالظُّلْمُ ظُلُمَاتٌ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ۔ صراط پر روشنی نماز، قران اور ترک ظلم سے حاصل ہوتی ہے (بدور ص۱۴۷)

پُل صراط پر آسانی سے گذر جانے میں مؤثر اعمال | ۱۔ حکومت کے ظلم سے کمزور آدمی کو اپنے اثر سے چھڑانا۔ (طبرانی عن عائشہؓ)

۲۔ مساجد سے دین کے کام کیلئے تعلق اور بار بار آنا۔ (بزاز باسناد حسن عن ابی الدرداء)

۳۔ دین میں اپنی رائے سے زیادتی نہ کرنا اور سُنّت کی تعلیم دینا۔ (دیلمی فی الانابۃ بدور السافرہ ص۱۵۰)

جنّت و دوزخ

اہلِ سُنّت والجماعۃ اس عقیدہ پر متفق ہیں کہ جنت و دوزخ کی تخلیق ہو چکی ہے۔ امام ابوالحسن الاشعری نے مقالات الاسلامین واختلاف المصلین میں بلفظِ مَا اَجْمَعَ عَلَیْہِ اَصْحَابُ الْحَدِیْثِ وَاَھْلُ السُّنَّۃِ یعنی جن عقائد پر اہلِ حدیث اور اہلِ سُنّت متفق ہیں ان کی تفصیل میں فرماتے ہیں۔

وَاَنَّ الْجَنَّۃَ وَالنَّارَ مَخْلُوْقَتَانِ۔ کہ جنت و دوزخ پیدا شدہ ہیں۔

امام ابن قیم نے صحابہ، تابعین و تبع تابعین واہل سنت والحدیث و فقہاء واہلِ التصوف کا اس عقیدہ پر حادی الارواح میں اجماع نقل کیا ہے۔ معتزلہ کا یہ کہنا کہ اس وقت جنت و دوزخ مخلوق نہیں۔ قیامت میں ان کی تخلیق ہوگی کہ ضرورتِ تخلیق اُس وقت ہے بالکل غلط ہے۔ جنت و دوزخ کی فی الحال موجودیت عبث نہیں بلکہ اس میں فوائد ہیں۔

جنّت و دوزخ کے حالی وُجُود کے دلائل

۱۔ تمام انبیاء علیہم السّلام نے جنت کی بشارت سنائی اور دوزخ سے ڈرایا اور ابشار و انذار کی اصلاحی تاثیر اس صورت میں قوی ہے کہ ابشار و انذار کے وقت جنت و دوزخ موجود ہوں۔

۲۔ موت کے وقت اور عذاب و ثواب قبر کی صورت میں جنت و دوزخ کا معائنہ اور اس کے راحت و الم سے متاثر ہونا احادیثِ صحیحہ میں ثابت ہے جو جنت کے وجود سے متعلق ہے۔ بعض اخیار کا مثلاً شہداء، صدیقین وانبیاء بلکہ بعض مؤمنین کی روحوں کا بعد از موت جنت کی نعمتوں سے فائدہ اور اشرار کا دوزخ کے آلام سے ضرر پذیر ہونا صحیح احادیث میں مذکور ہے جس سے معلوم ہوا کہ قبل از قیامت بھی انسانی ارواح کو جنت و دوزخ کے وجود سے ارتباط موجود ہے اس لئے ان کی پیدائش قبل از قیامت ان فوائد پر مشتمل ہے۔

دلائلِ نقلیہ وجودِ جنّت و دوزخ

آدم علیہ السلام کی سکونت جنت میں اور پھر زمین پر اترنا قرآن میں مذکور ہے اور یہی جنت جنتِ آخرت اور دارالثواب تھی۔ یہی صحیح قول ہے۔ امام رازی کی نقل کے مطابق کہ مسکنِ آدم زمینی باغ تھا یہ ابوالقاسم بلخی معتزلی ابومسلم اصفہانی کا قول ہے یا امام موصوف کا اِس مسئلہ میں خود توقف اختیار کرنا یا جبائی کا یہ کہنا کہ ساتویں آسمان کی جنت ہے یا بعض صوفیاء کا یہ کہنا کہ جبلِ یاقوت کا ایک باغ تھا یا یہود و نصاریٰ کا باغِ عدن یا فلسطین یا اصفہان کا تعین کرنا یہ سب خلافِ عقل و نقل ہے بوجوہات ذیل۔

مسکنِ آدم آسمانی جنت تھا ۱۔ کہ جنت کا لفظ جب لام تعریف کے ساتھ ذکر ہو اور الفاظ میں زمین کے کسی باغ مراد لینے کا قرینہ موجود نہ ہو تو جنت سے مراد دارالثواب ہوگی بالخصوص کہ مسکنِ آدم میں آسمانی جنت کے دو قرینے خود الفاظ قرآن میں موجود ہیں۔ ایک یہ کہ سورہ طٰہٰ میں اِس جنت کی جو صفات مذکور ہیں وہ زمینی جنت یا باغ کی صفات نہیں۔ بلکہ اس جنت کے صفات ہیں جو دارالجزاء ہے اور عالمِ بالا میں ہے۔ اللہ نے آدم کو جنت میں بسانے کے بعد ارشاد فرمایا۔

فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ۝ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى سہ یہ پانچ صفات ایسے ہیں جس سے دنیا کا کوئی مقام خالی نہیں۔ مثلاً یہ کہ اس جنت سے نکلنے کے بعد تم کو تکلیف ہوگی اور یہ کہ اس جنت میں تم کو نہ بھوک لگے گی اور نہ ننگا ہونا پڑے گا اور نہ پیاس لگے گی اور نہ دھوپ لگے گی۔ یہ تمام خصوصیات بہشتِ بریں کے ہیں نہ باغ دنیا کے۔ باغ دنیا میں اگر کچھ تھوڑے بہت فوائد ہیں تو اس سے نکلنے کے بعد کسی دوسرے باغ میں چلے جانے سے بھی وہ فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

۲۔ دوسرا قرینہ کہ مسکن آدم بہشت تھا سورۃ بقرہ میں ہے۔ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عہ

سہ سورۃ طٰہٰ آیۃ ۱۱۷ تا ۱۱۹ عہ سورۃ البقرۃ آیۃ ۳۶

عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ط جنت سے اُترنے پر اس آیت میں دو نتیجے مرتب کئے گئے۔ اوّل یہ کہ تمہاری اولاد میں دشمنی ہوگی۔ جیسے اس سے پیشتر ملائکہ کی زبان سے بھی یہ ظاہر کیا گیا کہ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ط کہ تم ایسے لوگوں کو زمین میں جانشین بناتے ہو جو اس میں فساد اور خونریزی کریں گے۔ آیت مذکورہ میں اھبطوا کہ اُترو۔ اس کے بعد جمع کے لفظ سے فرمایا کہ تمہاری اولاد ایک دوسرے کے دشمن ہونگے اور دوسری یہ کہ تم اور تمہاری اور اولاد کو زمین میں ایک مقرر وقت تک رہنا ہے اور اس سے فائدہ اٹھانا ہوگا۔ اگر مسکنِ آدم آسمانی نہ ہوتا بلکہ زمینی ہوتا تو یہ الفاظ اللہ نہ فرماتا کیونکہ عداوت زمینی زندگی کا خاصہ ہے اور یہ بھی نہ فرماتا کہ تم اُترنے کے بعد زمین میں رہوگے جبکہ وہ پہلے بھی زمینی باغ میں رہتے تھے۔ معلوم ہوا کہ جس جنت سے اُتارے گئے وہ زمینی باغ نہ تھا۔ بھوک باطنی ذلت ہے اور ننگاپن ظاہری ذلت۔ پیاس باطنی گرمی ہے اور دھوپ ظاہری گرمی جن میں تقابل ہے۔ مسکنِ آدم ان سب سے پاک تھا۔

مسکنِ آدم کے متعلق استدلال

حدیثی استدلال صحیح مسلم میں ابوہریرۃ و حذیفہ سے مرفوعاً حدیث آئی کہ قیامت میں اولادِ آدم، آدم علیہ السّلام کو جنت کے کھلوانے کی درخواست کرے گی جس کے جواب میں آپ فرمائیں گے وَهَلْ اَخْرَجَكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ اِلَّا خَطِيْئَةُ اَبِيْكُمْ۔ کہ تم کو جنت سے تو اپنے باپ کی غلطی نے نکلوایا۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ جس جنت سے حضرتِ آدم نکالے گئے۔ یہ وہی جنّت تھی جس میں آخرت میں جزائے اعمال کے طور پر داخلہ ہوگا۔ جب جنت کا حالی وجود ثابت ہوا تو دوزخ کا بھی ہوا کیونکہ فرق کا کوئی قائل نہیں

قرآنی استدلال دوسری دلیل یہ کہ جنت کے متعلق قرآن میں آیا کہ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ اور دوزخ کے متعلق آیا اُعِدَّتْ لِلْكَافِرِيْنَ۔ یعنی جنت متقیوں کے لئے تیار کی گئی ہے اور

دوزخ کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے ۔ یہ دو تعبیر ماضی اور گذشتہ کے لئے ہیں جو جنت و دوزخ کے سابق موجودگی کی دلیل ہے ۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ فرعون اور لشکر فرعون کے غرق کر دینے کے متعلق قرآن میں آیا ہے کہ أُغرِقُوا فَادْخِلُوا نَارًا کہ وہ غرق کئے گئے اور دوزخ میں داخل کئے گئے ۔ فرعون کا واقعہ گذشتہ ہے ۔ اگر دوزخ قبل از قیامت موجود نہیں تو کس میں داخل کئے گئے ۔

مسکنِ آدم کے بہشت ہونے پر شبہات کا ازالہ

جن لوگوں نے مسکنِ آدم کے جنت الخُلد ہونے سے انکار کیا ان کے شبہات درجِ ذیل ہیں ۔

۱۔ داخلۂ جنت قیامت میں ہوگا نہ قبل از قیامت اور آدم کا داخلۂ بہشت قیامت سے پہلے تھا ۔

۲۔ جنت میں برہنہ ہونا تکلیف اور غم پیش آنا نہیں ہوگا لیکن حضرت آدم علیہ السلام کو شجرہ ممنوعہ میں سے کھانے کے بعد یہ اُمور پیش آئے جو اس کے مسکن کے جنت الخلد ہونے کی دلیل ہے ۔

۳۔ جنت آسمانی میں امر و نہی کی تکلیف نہیں دی جائیگی لیکن مسکنِ آدم میں نہی کا معاملہ پیش آیا ۔

۴۔ جنتِ آسمانی میں داخلے کے بعد نکلنا نہ ہوگا لیکن حضرت آدم علیہ السلام نکالے گئے ۔

ان چار شبہات کا جواب ایک ہے ۔ وہ یہ کہ یہ سب امور اس وقت سے متعلق ہیں جب مومنوں کا داخلہ بعد از قیامت بطور جزائے اعمال کے ہو جائے ۔ ایسا داخلہ قیامت کے بعد ہوگا ایسے داخلہ کے بعد برہنہ ہونے اور غم و رنج کی نوبت بھی نہ آتے گی ۔ ایسے داخلہ کے بعد امر و نہی کے ساتھ اہلِ جنت مکلف بھی نہ ہوں گے اور ایسے داخلہ کے بعد جنت سے نکلنا بھی نہ ہوگا ، اور اس کی دلیل قرآنی آیات کا سیاق و سباق ہے جس میں اس داخلہ کی تصریح ہے ۔ جو بطور جزائے اعمال کے بعد از قیامت ہوگا ۔

باقی پانچواں شبہہ کہ جنت کا داخلہ شیطان وسوسہ ڈالنے کے لئے کیسا ہوا جب کہ وہ

جنّت سے نکال دیئے گئے تھے۔ تو اس کا جواب پہلا تو یہ ہے کہ وسوسہ ڈالنے کے لئے داخلِ جنّت ہونا ضروری نہیں۔ جنّت سے باہر رہ کر بھی وسوسہ کا اثر ڈال سکتا ہے۔ جیسے کروڑوں میل دُور سورج ہم کو گرمی اور روشنی کا اثر پہنچا سکتا ہے جو جسمِ کثیف ہے۔ شیطان لطیف کا اثر اس سے بھی قوی تر ہے۔ دوم یہ کہ داخلہ بغرض اقامت و رہائش ممنوع تھا نہ یہ کہ عارضی طور پر بطور امتحان و آزمائش کے داخلے کی بھی بندش تھی۔ سوم یہ کہ داخلے کی بندش قانونی تھی۔ جیسے کسی مجرم کا داخلہ حکومت کی طرف سے قانوناً بند کیا جائے۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ چوری چھپکے بھی نہیں جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی حکمت کے تحت چوری چھپکے انداز میں علمِ الٰہی کے باوجود اس کے داخلے میں مداخلت نہیں کی گئی۔

چھٹا شُبہ کہ حضرت آدم زمین پر خلیفہ بنائے گئے تھے تو آسمان پر کیوں لے جائے گئے اس کا جواب یہ ہے کہ جیسے حضرت عیسٰی علیہ السلام زمین کے پیغمبر تھے لیکن کسی مصلحت کے تحت آسمان پر اٹھائے گئے اور پھر زمین پر اتارے جائیں گے۔

آسمانی جنّت میں سکُونتِ آدم اور تناولِ شجرہ کی وجہ سے اُتارنے کی حکمت

پہلی حکمت ایک حکمت تو اس میں یہ تھی کہ آدم اور اولادِ آدم میں یہ شعور راسخ اور مضبوط کیا جائے کہ انسانیت کا وطنِ اصلی زمین نہیں بلکہ آسمانی بہشت ہے تاکہ اس کے حصول کے لئے جو واحد ذریعہ ہے وہ صرف انبیاء علیہم السلام کی ہدایت اور تعلیمات کی پیروی ہے۔ اس کے لئے وہ زمینی زندگی میں پوری کوشش صرف کر دے تاکہ آبائی وطن کو پا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں آدم علیہ السلام کے نزول کے بعد یہ مضمون مذکور ہے۔ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ط (البقرہ آیۃ ۳۸) یعنی زمین پر اُترنے کے بعد جب اللہ کی طرف سے سامانِ ہدایت انبیاء اور آسمانی کتب کے ذریعہ آ جائے تو جو اُس پر چلیں گے وہ وطنِ اصلی یعنی بہشت کی وہ زندگی پائیں گے جو خوف اور غم سے پاک ہے۔

دُوسری حکمت | اللہ کی نافرمانی کے خطرناک اور دیرپا نتائج سے ڈراتا جو اس واقعے سے مفہوم ہوتا ہے۔ آدم علیہ السّلام جو تمام انسانیت کے باپ اور پیغمبر ہونے کے لحاظ سے مقبول و محبوب خدا تھے۔ اُس نے ممنوعہ درخت سے کھایا جو گناہ یقیناً نہ تھا کیونکہ گناہ کے لئے قصد و ارادہ شرط ہے اور قرآن کا بیان ہے کہ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ط ہم نے آدم کا قصد درخت کھانے میں نہیں پایا کہ قصد تھا ہی نہیں ۔ ورنہ اللہ کا علم اس کو ضرور پاتا ۔ دوم یہ کہ جنّت شرعی احکام کا محل نہیں۔ لہذا یہ ممانعت تشریعی حکم نہ تھا۔ تشفیقی یعنی شفقت اور مہربانی کے اظہار کے لئے ایک حکم تھا۔ جس کا توڑنا گناہ تو نہیں ہوتا لیکن اس کی تعمیل نہ کرنے میں ضرر ہوتا ہے۔ جیسے ڈاکٹر یا حکیم کسی مریض کو کسی چیز کے کھانے سے روک دے۔ اس پر بھی وہ اگر کھائے تو گناہ تو نہیں ہوگا لیکن بدپرہیزی کے ضرر کا خمیازہ اس کو بھگتنا پڑے گا۔ پھر یہ صورت بھی قرینِ قیاس ہے کہ لفظ ہذا کے تحت معین درخت کی بندش ہوئی۔ جس سے مرادِ الٰہی اس معین درخت کے تمام اقسام کی بندش تھی لیکن آدم علیہ السّلام نے شخصی بندش سمجھی جو گناہ نہیں۔ لیکن اجتہادی غلطی ہوسکتی ہے۔ ان سب اُمور سے یہ ظاہر ہوا کہ آدم علیہ السّلام کا درخت سے کھالینا حقیقی گناہ نہیں تھا۔ صوری حکم شکنی تھی۔ اور اسی صوری حکم عدولی پر عصٰی آدمُ ربّهٗ فغوٰی کا اطلاق کیا گیا کہ آدم نے ظاہری عصیان و غوایت کا ارتکاب کیا اور صوری مناسبت سے عربی زبان کے قواعد کے لحاظ سے بھلائی پر بھی ہم شکلی کی وجہ سے برائی پر اطلاق کیا جاتا ہے۔ جیسے جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (الشوریٰ: ۴۰) اور فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ط (البقرۃ آیۃ ۱۹۴) یعنی بُرائی کا بدلہ بُرائی ہے۔ اور جو تم پر ظلم اور زیادتی کرے تم بھی اُسی مقدار میں اُس پر ظلم اور زیادتی کرو۔ حالانکہ جوابی کارروائی جائز ہے نہ کہ بُرائی ہے اور نہ ظلم و زیادتی ہے۔ لیکن تھپڑ کے مقابلہ میں تھپڑ چونکہ دونوں تھپڑ کی صورت اور شکل کے اعتبار سے ایک جیسے ہیں۔ اگرچہ ابتداءً تھپڑ ناجائز اور بُرائی ہے اور جوابی تھپڑ قانوناً جائز ہے اور بُرائی نہیں لیکن ہم شکلی کی وجہ سے اس پر بھی بُرائی اور زیادتی کا لفظ بولا گیا۔ یہی معاملہ حضرت آدم علیہ السّلام کا درخت

میں سے کھانے کا بھی ہے کہ اس کی ظاہری صورت حکم توڑنے کی تھی اگرچہ حقیقی حکم شکنی نہ تھی کیونکہ نہ حکمِ الٰہی شرعی حکم تھا نہ آپ کا فعل ارادے سے تھا۔ تاہم معصیۃ و غوایۃ کے الفاظ اس پر اطلاق کئے گئے۔ ان سب باتوں کے باوجود آدم اور اولادِ آدم کو جنت کی راحتوں سے محروم ہونا پڑا۔ جب صوری نافرمانی کا یہ حال ہے تو حقیقی نافرمانی کا انجام تو اس سے بھی خطرناک ہوگا۔ یہی تصور واقعہ آدم سے پیدا ہوتا ہے تاکہ گناہ کی نفرت راسخ ہو۔ پھر اس صوری اور غیر حقیقی نافرمانی کے کس قدر دُور رس اور خطرناک نتائج نکلے کہ جنت کی زندگی میں تمام اسبابِ مسرّت حاصل تھے اور رنج و تکلیف کا نام و نشان نہ تھا۔ اس سے محرومی ہوئی اور دنیوی زندگی کی بے پناہ تکلیفات اور غموم و آلام میں خود آپ کو اور آپ کی تمام اولاد کو قیامت تک مبتلا ہونا پڑا۔ جب غیر حقیقی نافرمانی کے یہ نتائج ہیں تو زمین پر اگر کوئی انسان حقیقی گناہ کرے اور وہ ایک نہیں بلکہ متعدد ہوں تو اُس کے نتائج آخرت کی زندگی کے لئے کس قدر خطرناک ہوں گے۔ جب جنت کی زندگی کی غیر حقیقی نافرمانی کے نتائج دنیا کی زندگی میں یوں نمودار ہوئے تو دنیوی زندگی کی نافرمانی کے نتائج آخرت میں کس قدر خطرناک صورت میں سامنے آئیں گے۔ اس لئے اولادِ آدم کو اپنے باپ کی اس تاریخی واقعہ سے سبق لینا چاہیئے تاکہ نافرمانی نہ ہونے پائے۔

تیسری حکمت یہ ہے کہ جنت دار الراحت ہے اور زمین دار المحنت ہے لہٰذا اِس دار المحنت میں دین کے لئے محنت کرنا حقیقی راحت یعنی جنت کے حصول کا واحد ذریعہ ہے لہٰذا زمین کی زندگی میں دین کے لئے مشقّت اُٹھاؤ تاکہ جنت کی راحت نصیب ہو۔

براحتے نرسید آنکہ محنتے نہ کشید

دنیا کا نظام بھی ایسا ہے کہ جو محنت کرتا ہے وہی راحت پاتا ہے۔

چوتھی حکمت واقعہ آدم و ابلیس سے اولادِ آدم کو یہ ذہن نشین کرانا ہے کہ شیطان انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے جس کا کام طاعتِ خداوندی سے ہٹانا ہے اور خواہشِ نفس میں لگانا ہے لہٰذا انسانیت اور ابلیسیت کے درمیان مسلسل عداوت رہے گی اور فلاحِ انسانی کا راز اسی میں

مضمر ہے کہ وہ ابلیسی لغزشوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے تاکہ اس کو وطنِ اصلی اور آبائی مقام نصیب ہو ورنہ وطنِ اصلی سے محرومی نصیب ہوگی۔

پانچویں حکمت حضرت آدم علیہ السلام کو جنتی زندگی سے زمینی زندگی کی طرف منتقل کرنے میں ایک حکمت یہ تھی کہ جنت کی پُرمسرت زندگی کا وہ دنیا کی پُرآلام زندگی سے موازنہ کریں اور یہ تاریخی حقیقت اولادِ آدم میں تسلسل کے ساتھ منتقل ہو کہ قابلِ ترجیح حیاتِ آخرت ہے تاکہ وہ دُنیا کے دھندوں میں منہمک ہو کر جنت و آخرت کی حقیقی زندگی سے غفلت نہ برتیں تاکہ وَالْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی ط (اعلیٰ آیۃ ۱۶) آخرت اور جنت کی حیات بہتر اور پائیدار ہے کا تصور اولادِ آدم کو جنت کی زندگی کمانے کی جدوجہد میں برقی رو پیدا کر دے۔

چھٹی حکمت قصہ آدم علیہ السلام عداوت ابلیس کا مظہر ہے جس سے اس حکمت کا اظہار مقصود ہے کہ تکمیلِ انسانیت کے لئے ابلیسی عداوت کا وجود ضروری ہے کیونکہ ایک مخفی، مکار اور عظیم دشمن کا وجود انسانیت کے حدود کے تحفظ کا محرک ہے اور ایسے خطرناک دشمنِ دین کی عداوت کا تصور محافظتِ دین کا سامان ہے۔ انسانی وجود کے اندر ایک چھوٹی حکومت کا نمونہ موجود ہے۔ انسانی اعضاء رعیت کی مانند ہیں۔ روحِ انسانی ایک بادشاہ اور حکمران ہے۔ شرع اور قانونِ الٰہی اس چھوٹی سی حکومت کا دستورِ مملکت ہے۔ شیطان یا ابلیسیت بدنی اعضاء کی رعیت کو شرعی دستورِ مملکت سے بغاوت پر آمادہ کرتی ہے۔ اگر روحِ انسانی دفاعِ مملکت اور ڈیفنس سے غافل رہے تو دشمن اس مملکت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو جائیگا اور انسان کی اندرونی مملکت کا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور اگر دشمن سے بچاؤ کی حفاظتی تدابیر پہ ہر وقت نظر رہے گی تو ڈیفنس اور دفاع مضبوط ہو کر ابلیسی تدابیر ناکام ہوں گی۔ اس اس کی واضح مثال مملکتِ پاکستان کے پہلو میں بھارت کی دشمن حکومت کا وجود ہے۔ اگر پاکستان کے پہلو میں بھارت جیسی دشمن اور مکار حکومت نہ ہوتی تو پاکستانی عوام اور حکومت دونوں غفلت کا شکار ہو کر دفاع اور تحفظِ مملکت کا پُرجوش انتظام نہ کرتے اور پاکستان کی بری

بحری، ہوائی فوج نہ ہونے کے برابر ہوتی اور اسلحہ جنگ اور جنگی قوتوں کو بروئے کار لانے کا کوئی انتظام نہ ہوتا اور ہماری تمام مخفی دفاعی قوتیں معطل ہو کر رہ جاتیں۔ اب جو کچھ پاکستان کی دفاعی ساز و سامان کی روز افزوں ترقی ہمیں نظر آتی ہے یہ سب بھارت جیسے دشمن کے وجود کے تصوّر کا صدقہ ہے۔ یہی راز ہے کہ آدمیت کی تکمیل کے لئے اس کے ساتھ ساتھ ابلیسی عداوت کا کارخانہ بھی وجود میں آیا۔ دشمن کے وجود کا یہ فلسفہ حضرت علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اپنے مرید کو سمجھایا جس نے حضرت کو دشمنوں کی ضرر رسانی کی شکایت کی آپ کا جواب اقبالؒ نے نظم کیا۔ فرمایا ؎

راست می گوئم عدو ہم یار تست ہستیٔ او رونقِ بازار تست
ہر کہ دانائے مقامات خودی است فضل حق داند اگر دشمن قوی است
کشت انسان را عدو باشد سحاب ممکناتش را بر انگیزد ز خاک

حقیقت حیاۃ الجنّت | جنت کی حقیقت اور اس کی نعمتیں اس قدر بلند ہیں کہ انسان کا تصوّر اس کی بلندی تک رسائی سے قاصر ہے۔

فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّآ اُخۡفِیَ لَهُمۡ مِّنۡ قُرَّةِ اَعۡیُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ۝ (السجدۃ آیۃ ۱۷)

یعنی مشاہدہ سے قبل کوئی نفس ان نعماء جنت کو نہیں جانتا جو ہم نے مخفی رکھی ہیں۔ آنکھوں کو ٹھنڈی کرنیوالی نعمتیں جو انکے عمل کا بدلہ ہوگا

بخاری و مسلم میں حضور علیہ السّلام کا ارشاد ابوہریرہؓ کی روایت سے منقول ہے کہ اللہ فرماتا ہے کہ میں نے جنت میں وہ وہ نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی ہیں نہ کسی کان نے ان کی تعریف سنی ہے اور نہ کوئی دل اس کا تصوّر کر سکتا ہے۔ چونکہ ان نعمتوں کے ساتھ دنیا کی نعمتوں کو کوئی نسبت نہیں اس لئے ان کی صحیح حقیقت کا انکشاف قبل از مشاہدہ اور استعمال ناممکن ہے لیکن اُن کا اجمالی تعارف چونکہ علوم الآخرۃ کے تحت ضروری تھا اور انسان صرف دنیوی نعمتوں سے متعارف ہے۔ اس لئے دنیا کی نعمتوں کی تعبیر کے ذریعے قرآن اور حدیث نے ہم کو نعماءِ جنت سے متعارف

کرایا۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ جنت کی نعمتوں کے لئے دنیوی اشیاء کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں یہ صرف رسمی اور تعبیری مناسبت کی وجہ سے ہے ورنہ حقیقت دنیا اور آخرت کی نعمتوں کی مختلف ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جنت میں بھی پانی ہوگا اور دنیا میں بھی پانی ہے۔ لیکن دونوں میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ اگر پوری دنیا کی دولت خرچ کرکے ایک گلاس عمدہ شربت تیار کیا جائے تو یہی شربت جنت کے پانی کے مقابلے میں ایسا ہے کہ جس نے جنت کا پانی پیا ہو اس کو یہی شربت دیکھ کر قے آئے گی۔ اُس پانی کی جو لذت اور بدنی و رُوحانی اثرات ہیں وہ دُنیا کے پانی میں کہاں۔

اجمالی نقشہ حیاتِ آخرت قرآن حکیم نے حیاتِ جنت کا منفی انداز میں یہ نقشہ کھینچا ہے لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ کہ وہ زندگی خوف اور غم سے کُلیتہً پاک ہے، اور مثبت انداز میں یہ بیان کیا ہے۔ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ[1] کہ جنت کی زندگی میں تم کو جو کچھ جی چاہے، وہ ملے گا اور جو کچھ طلب کروگے وہ بھی ملے گا یعنی دِل اور زبان کے تمام مطلوبات حاصل ہوں گے اور تم کو خود انتظام کرنے کی ضرورت بھی نہ ہوگی کہ تم تمام عرصہ حیاتِ جنت میں خدائے غفور و رحیم کے مہمان ہوگے۔ مہمان کو ضروریات کے لئے خود کچھ نہیں کرنا پڑتا، سب کچھ میزبان کے ذمّہ ہوتا ہے احادیث میں جو بدور السافرہ میں ہیں اس اجمالی حیاتِ طیبہ کی یہ تفصیل آئی ہے۔ غِنًا وَلَا فَقْرَ صِحَّةٌ لَا مَرَضَ شَبَابٌ لَا هَرَمَ حَيَاةٌ لَا مَوْتَ۔ یعنی حیاتِ جنت میں بے نیازی اور غنا ہے فقر و محتاجی نہیں۔ تندرستی ظاہری و باطنی ہے مرض نہیں۔ جوانی ہے بڑھاپا نہیں۔ زندگی ہے موت نہیں۔ یہ وہ مختصر نقشہ ہے کہ اس نقشہ کے مطابق ایک منٹ کی زندگی بھی کسی بڑے سے بڑے شہنشاہ کو دنیا میں نصیب نہیں۔ اس لئے اللہ کا ارشاد ہے۔ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ[2] کہ صرف آخرت کی زندگی ہی حقیقی زندگی ہے۔ حدیث میں آیا ہے

---

[1] حٰم السجدۃ آیۃ ۳۱۔ ۳۲ [2] عنکبوت آیۃ ۶۴

کہ جنّتی زندگی میں ایک شخص کی طاقت ایک سو قوی جوان اشخاص کے برابر ہوگی جو ہمیشہ ایک ہی حالت میں رہے گی۔ اس میں کمی نہیں آئے گی۔ حُسن اور خوبصورتی اس کی بے مثال ہوگی، اور اس میں دائمی اضافہ ہوتا رہے گا جیسے احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ اس کے علاوہ دیدارِ الٰہی کی لذّت ایسی ہوگی جو ان تمام لذتوں سے بالاتر ہوگی جو جنّت میں دیگر ذرائع سے حاصل ہونگی۔

قیامت کی علامات میں سے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کا آسمان سے نزول کی بحث بھی شامل ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان کو اُٹھایا جانا اور اس وقت زندہ ہونا اور آخری زمانے میں زمین پر نزول فرمایا اہلِ اسلام کا متفقہ عقیدہ ہے کہ تقریباً چودہ ۱۴۰۰ سو سال سے لے کر اب تک اسلام کے تمام فرقے اسی پر متفق چلے آتے ہیں اور اسلامی فرقوں میں اس عقیدے کے متعلق کوئی کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا حالانکہ دیگر بیسیوں اعتقادی مسائل میں اختلاف موجود رہا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب وسنت کی روشنی میں اس مسئلہ کو اس قدر واضح اور صاف کیا گیا ہے کہ جس کو اسلام کے ساتھ معمولی تعلق بھی ہو وہ اس مسئلہ میں اختلاف کا روادار نہیں اور اسلام اور مسئلہ حیات ونزول مسیح علیہ السلام کو لازم وملزوم سمجھتے رہے ہیں اور یہ کہ تسلیم اسلام کے ساتھ اس مسئلہ کا انکار قطعاً جمع نہیں ہوسکتا۔ تفسیر بحر المحیط ج ۲ ص ۴۷۳ میں امام ابنِ عطیہ سے اجماع کے الفاظ منقول ہیں۔

حَيَاةُ الْمَسِيْحِ بِجِسْمِهٖ اِلَى الْيَوْمِ	حضرت مسیح علیہ السلام کا جسم کے ساتھ اس وقت
وَنُزُوْلُهٗ مِنَ السَّمَاءِ بِجِسْمِهٖ	تک زندہ ہونا اور جسم عنصری کیساتھ آسمان سے
الْعُنْصُرِيِّ مِمَّا اَجْمَعَ عَلَيْهِ	اُتر کر آنا ایسا عقیدہ ہے جس پر پوری اُمّت کا اتفاق
الْاُمَّةُ وَتَوَاتَرَ بِهِ الْاَحَادِيْثُ۔	ہے اور پیغمبرؐ کی متواتر احادیث سے ثابت ہے

تفسیر جامع البیان میں اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ کے تحت تفسیر وجیز سے نقل کیا گیا ہے۔

وَالْاِجْمَاعُ عَلٰی اَنَّهٗ حَیٌّ فِی	اس پر اجماع ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام
السَّمَاءِ یَنْزِلُ یَقْتُلُ الدَّجَّالَ	آسمان پر زندہ ہیں اُتریں گے، دجال کو قتل کریں گے

وَيُؤَيِّدُ الدِّيْنَ ۔ اور دین اسلام کو مضبوط کریں گے ۔

اسی طرح امام شوکانی کے رسالہ التَّوْضِيْحِ فِيْمَا تَوَاتَرَ فِي الْمُنْتَظَرِ وَالدَّجَّالِ وَالْمَسِيْحِ اور امام سیوطی کے الْاِعْلَامِ بِحُكْمِ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامِ میں تواتر اور اجماع مذکور ہے۔ صحیح الکرامۃ ص۲۳۴ میں امام شوکانی کی انتیس ۲۹ احادیث درباره نزول عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر کے بعد تواتر اور اجماع کا ذکر کیا گیا ہے ۔ اسی طرح حافظ ابن حجر نے تلخیص الحبیر کتاب الطلاق میں لکھا ہے اَلْاِجْمَاعُ عَلٰى اَنَّهٗ رُفِعَ بِبَدَنِهٖ حَيًّا ۔ کہ اس پر اجماع ہے کہ وہ بدن کے ساتھ زندہ اُٹھائے گئے ہیں ۔ اسی طرح فتح الباری میں ذکر ادریس کے سلسلہ میں حضرت مسیح کے نزول پر اجماع منقول ہے ۔ اسی طرح تفسیر ابن کثیر میں تواتر نزول کی صراحت کی گئی ہے ۔ اسی طرح :-

۱ ۔ مرزا غلام احمد نے براہین احمدیہ ص۴۹۸ میں حضرت مسیح علیہ السلام کے زندہ ہونے اور دوبارہ آنے کی تصریح کی ہے اور یہ کتاب اس کے اقرار کے مطابق اس وقت لکھی گئی تھی کہ وہ بزعم خود نبی تھا ۔ (دیکھو ایام الصلح ص۷۵)

۲ ۔ مرزا غلام احمد براہین احمدیہ حاشیہ ص۵۰۵ میں وان عدتم عدنا کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس میں مسیح کے جلالی طور پر آنے کا اشارہ ہے ۔ اگر نرمی قبول نہ کروگے تو وہ زمانہ بھی آنے والا ہے کہ جب مسیح علیہ السلام جلالت کے ساتھ دنیا پر اُتریں گے اور جلال الٰہی گمراہی کو نیست و نابود کر دے گا ۔ میرا زمانہ اس زمانہ کے لئے بطور ارہاص واقعہ ہوا ہے ۔

۳ ۔ مرزا غلام احمد هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ کی تفسیر براہین ص۴۹۸ میں یوں کرتے ہیں کہ جب حضرت مسیح علیہ السلام دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں گے تو اُن کے ہاتھ سے دین اسلام جمیع آفاق و اقطار میں پھیل جائے گا ۔

۴ ۔ ازالہ اوہام ص۲۲۵ پر مرزا غلام احمد لکھتے ہیں کہ آنحضرت ؐ نے عمر کو قتل سے منع کیا ، اور فرمایا اگر یہی دجال ہے تو اس کا صاحب عیسیٰ بن مریم ہے جو اس کو قتل کرے گا ہم اسے قتل نہیں کر سکتے ۔

حیات و نزولِ مسیح کے مسئلہ پر ہم مختصراً قرآنی، حدیثی، تاریخی اور عقلی حیثیت سے روشنی ڈالیں گے۔ اجماعی حیثیت سے ہم نے مسئلہ پر روشنی ڈال دی ہے۔

حیاتِ مسیح علیہ السلام قرآنی روشنی میں

۱۔ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ط وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ ط (آل عمران آیۃ ۵۴)

یہود نے حضرت مسیحؑ کے خلاف تدبیر کی اور اللہ نے ان کو بچانے کی تدبیر کی۔ اللہ کی تدبیر سب تدبیر کرنے والوں کی تدبیر سے بہتر ہے۔ مرزا صاحب نے اس آیۃ کا مطلب یہ بیان کیا یہودیوں نے حضرت مسیحؑ کے لئے قتل و صلیب کا حیلہ سوچا تھا خدا نے مسیح کو وعدہ دیا اور کہا کہ تیرا اپنی طرف رفع کروں گا۔ (اربعین جلد ۳ صفحہ ۱) ۔ پھر آئینہ کمالات صفحہ ۴۰ و صفحہ ۴۶ میں لکھتے ہیں کہ وعدے کے الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ وہ وعدہ جلد پورا ہونے والا ہے۔ پھر مرزا صاحب ازالہ اوہام صفحہ ۳۸۰ میں لکھتے ہیں کہ پھر بعد اس کے ان کے (یہود) کے حوالے کیا گیا۔ تازیانے لگائے گئے۔ گالیاں سُننا طمانچے کھانا، ہنسی اور ٹھٹے میں اڑائے جانا اُس نے دیکھا۔ آخر صلیب پر چڑھا دیا۔ آیت مذکورہ کی مرزائی تفسیر نہ صرف یہ کہ بے دلیل اور تحریف ہے خود ایک عظیم بہتان اور ذاتِ خداوندی کی شان کے بھی خلاف ہے۔ بقول مرزا یہود نے حضرت مسیح کے خلاف تدبیر کی اور اللہ نے بچانے کی۔ پھر یہود نے اُس کو تازیانے بھی لگائے، گالیاں بھی دیں، ٹھٹھا اور تمسخر بھی اڑایا، سولی پر بھی چڑھایا پھر بھی قرآن نے یہ کہا کہ اللہ خیر الماکرین ہے اور اسکی تدبیر بہتر و کامیاب رہی۔ اگر مرزائی تحریف کے اس خود ساختہ شوشے کو بھی مان لیا جائے کہ سولی پر اُتارنے سے یہود نے اس کو مُردہ سمجھا لیکن اس کی آخری رمق باقی تھی اور علاج سے اچھے ہوئے۔ پھر کشمیر جا کر بہت مدت کے بعد طبعی موت سے مر گئے، تو بھی موت کے وقوع کی راہ میں یہود کی غلط فہمی آڑے آگئی۔ نہ کوئی خرقِ عادت کارنامہ آیتِ مذکورہ کی روح اللہ کی حفاظتی تدبیر کا یہودی تدبیر سے موازنہ کرکے اللہ کی تدبیر کی پوری کامیابی اور عظمت کا بیان کرنا مقصود ہے لیکن مرزا کی تفسیر کے تحت اس وعدہ الٰہی کے باوجود یہود نامسعود

حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ جو کچھ کرنا چاہتے تھے وہ سب کچھ کر چکے لیکن پھر بھی بقول مرزا تدبیر اور وعدہ الٰہی بلند اور کامیاب رہا۔ اس طرح مرزا نے حضرت مسیح اور خدائے قرآن دونوں کی یہود کے مقابلے میں توہین اور تذلیل کی۔ اگر دماغ میں کجی اور الحاد نہ ہو تو آیت کا مطلب صاف ہے کہ یہود نے حضرت مسیح کے خلاف تدبیر کی کہ ان کو بے عزت کر کے سولی پر چڑھا دیا جائے لیکن اللہ کی تدبیر بچانے کی تھی لہٰذا اللہ کی تدبیر غالب رہی کہ اللہ نے اس کو آسمان پر اٹھا لیا اور یہود اس کا بال تک بیکار نہ کر سکے۔ تقریباً چودہ سو سال سے قرآنی علوم کے ماہرین صحابہ و تابعین وغیرہ نے یہی مطلب سمجھا لیکن چودھویں صدی میں مسیحیت کی دوکان جمانے والے نے یہ نامعقول مطلب تراشا۔

۲۔ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰىٓ اِنِّىْ	جس وقت کہا اللہ نے اے عیسیٰ میں لے
مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ	لوں گا تجھ کو اور اٹھا لوں گا تجھ کو اپنی طرف
مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ	اور پاک کر دوں گا تجھ کو کافروں سے اور رکھوں گا
الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا	ان کو جو تیرے تابع ہیں غالب ان لوگوں سے جو
اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ	انکار کرتے ہیں قیامت کے دن تک پھر میری طرف
فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ	تم سب کو آنا ہے پھر میں فیصلہ کر دوں گا جس بات
تَخْتَلِفُوْنَ ط (آل عمران: ۵۵)	میں تم جھگڑتے تھے۔

توفی کے متعلق کلیات ابی البقاء میں ہے۔

اَلتَّوَفِّىْ اَلْاِمَاتَةُ وَقَبْضُ الرُّوْحِ	یعنی توفی کا لفظ عوام کے ہاں موت دینے اور
وَعَلَيْهِ اسْتِعْمَالُ الْعَامَّةِ وَ	جان لینے کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن بلغاء کے
الْاِسْتِيْفَاءُ وَاَخْذُ الْحَقِّ وَ	نزدیک اس کے معنی پورا وصال کرنا اور ٹھیک
عَلَيْهِ اسْتِعْمَالُ الْبُلَغَاءِ۔	لینا ہے۔

گویا ان کے نزدیک موت پر توفی کا اطلاق اس حیثیت سے ہے کہ اس میں کسی خاص عضو سے نہیں بلکہ پورے بدن سے جان لی جاتی ہے تو اگر خدا نے کسی کی جان بدن سمیت لی تو اس پر توفی کا

اطلاق بطریقِ اولیٰ ہوگا اور روح مع البدن لینا توفّی کے مفہوم میں داخل ہے۔ عام طور پر چونکہ روح بدن کے بغیر لی جاتی ہے اس لئے موت پر توفی کا اطلاق کثرت سے آیا اور یہاں یہ راز ہے، کہ عیسیٰ علیہ السلام کی حالت چونکہ عام حالات سے مختلف تھی اس لئے اہم ترین ضرورت کے موقع پر بھی اللہ نے عیسیٰ علیہ السلام کے حق موت کا اطلاق نہیں کیا بلکہ توفّی کا کیا جو قبضِ روح اور قبضِ روح مع البدن دونوں کو شامل ہے۔ یہ غلط ہے کہ فاعل اگر خدا ہو اور مفعول ذی رُوح ہو، تو توفی موت کے معنی میں ہوگا۔ بالفرض اگر موت کے معنی میں ہو تو ضحاک شاگرد ابنِ عباس نے معالم میں تقدم و تاخیر کا قول نقل کیا ہے۔ یعنی متوفیک، میں تم کو موت دوں گا زمین پر اتارنے کے بعد۔ کی دلیل یہ ہے کہ سورۃ زمر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِھَا ط یہاں فاعل اللہ اور مفعول ذی روح ہے پھر بھی نیند کی حالت کے متعلق فرمایا کہ اللہ جان لیتا ہے موت کے وقت اور وہ جان بھی لیتا ہے جو نیند کی حالت میں مری نہیں۔ یہاں نیند پر توفّی کا اطلاق آیا اور توفّی کو عدمِ موت کے ساتھ جمع کیا۔ اس حقیقت کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق توفّی کے لفظ میں موت کا معنی مراد نہیں بلکہ اٹھا لینے کا معنی مراد ہے اور یہی معنی ابنِ عباس کا صحیح قول ہے جو روح المعانی میں مذکور ہے اور مناسب حال عیسیٰ علیہ السلام بھی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہودی محاصرہ کے وقت جو پریشانی لاحق تھی وہ مندرجہ ذیل امور کی وجہ سے تھی۔

۱۔ کہ میں یہود کی دست بُرد اور جور و ستم سے بچ جاؤں گا یا نہیں۔ اس کے جواب میں یٰعیسیٰ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ۔ میں تم کو لے لوں گا اور دست بُرد سے بچا لوں گا جیسے وَاِذْ کَفَفْتُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَنْکَ ط میں بنی اسرائیل کو تم تک پہنچنے سے روکوں گا۔

۲۔ دوسری یہ تشویش تھی کہ میرا بچانا زمین کے کسی حصہ میں ہوگا کہ ان کو میری طرف پہنچنے نہ دیا جائے گا یا اور کوئی صورت ہوگی۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ میں تجھ کو اپنی طرف آسمان

ؔ۱ سورہ زمر آیۃ ۴۲ ؔ۲ آل عمران آیۃ ۵۵ ؔ۳ سورۃ المائدہ آیۃ ۱۰۹

پر اُٹھالوں گا۔

۳۔ اپنی والدہ اور خاندان کے حال سے مشوّش تھے کہ وہ ان پر داغ لگاتے تھے۔اس کے متعلق کیا انتظام ہوگا ؟ اس کے متعلق فرمایا۔ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا[۱]۔میں منکروں سے تم کو اور تمہاری والدہ اور تمہاری والدہ کو پاک کر دوں گا۔چنانچہ اس کا انتظام قرآن اور خاتم الانبیاء علیہ السّلام کی زبان سے کیا گیا کہ آپ اور آپکی والدہ کی زندگی بے داغ ہے۔

۴۔کہ میرے اُٹھاتے جانے کے بعد میری اُمت یا متبعین کا ان منکروں کے مقابلہ میں کیا حال ہوگا تو فرمایا۔ وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ[۲] ط کہ قیامت تک تیرے تابع تیرے منکروں پر غالب ہوں گے۔ یہ وعدہ آج بھی ایک حقیقت ہے۔اسرائیل کا وجود اس وعدے پر اثر انداز نہیں کہ خود قرآن نے یہود کی ذلّت اور مسکنت میں دو استثنائی صورتیں بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ یہود اسلام لاکر اسلام کی پناہ میں آجائیں۔ دوم یہ کہ کسی قوم عیسائی کی پناہ میں آجائے۔ اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ[۳] ط یعنی ذلّت اور مسکنت کی دو صورتیں مستثنائی ہیں۔اسلام لاکر اللہ کی پناہ میں آجانا یا عیسائی قوم کی پناہ میں آنا۔اسرائیل برطانیہ، امریکہ اور عیسائی اقوام کی پناہ کی وجہ سے موجود ہے جس کا استثناء خود قرآن نے کیا ہے۔یہود کی قوّت اور اقتدار عیسائیوں کے سہارے قائم ہے لیکن مسلمانوں کا اقتدار عیسائیوں کے سہارے کا محتاج نہیں۔خواہ امریکہ ہو یا روس۔ بلکہ خود آپس میں متحد ہو کر سامانِ قوّت کی فراہمی کا محتاج ہے کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا[۴] ط کے تحت نوّے کروڑ مسلمان ایک منظم بلاک بن جاتے اور واعدوا لهم ما استطعتم من قوّة[۵] کے تحت سامان قوت کی تیاری میں لگ جاتے اور اپنی خداداد مشترک دولت اس میں صرف کر دے تو مستقل عزت مسلمانوں کے لئے اب بھی پہلے کی طرح حاصل ہوگی لیکن حبل اللہ اور اسلام پر عمل پیرا ہونے سے مسلمانوں کی قوّت ہے نہ کہ اسلام کو چھوڑ کر مغربیت اختیار کرنے اور اسلام میں تحریف کرنے سے وہ قوی

---

[۱] و [۲] سورۃ آل عمران آیۃ ۵۵ [۳] آل عمران [۴] آل عمران [۵] انفال

ہوں گے ۔ یورپ کی قوّت بھی تعلیمِ اسلامی کے اجزا سے ہے ۔ یعنی سامانِ قوّت کی تیاری اور اور قوانین قدرت کا علم حاصل کرکے اس سے استفادہ کرنا ۔ ان کے غیر اسلامی اجزاء یعنی اُن کے تمدّن کو ان کی ترقی میں دخل نہیں بلکہ ان کی وجہ سے مادی ترقی کے باوجود ان کا زوال شروع ہوگیا ہے ۔ وہ غیر اسلامی اجزاء خدا اور آخرت فراموشی ، انبیاء علیہم السّلام کے اخلاقی اقدار کو زندگی زندگی سے خارج کرنا ، نسل و وطن کے بت کی پرستش کرنا ، زنا ، جوا بازی ، لواطت ، شراب نوشی ، سُود ، عیاشی جنہوں نے مغربی قوّت کے اعصاب کو کمزور کر دیا ہے اس کمزوری کی وجہ سے مغرب کی نمبر ایک طاقت کوریا اور ویت کانگ کی معمولی بے سروسامان ریاستوں کے ہاتھوں پٹ رہی ہے اور اب توبہ کرنے پر آمادہ ہے لیکن توبہ بھی قبول نہیں ہوتی ۔ مغرب زدہ مسلمانوں کی یہ بدقسمتی ہے کہ اُن کے ذہنی انحطاط نے ان کو سامان قوّت کے ترک اور سامان زوال کے اپنانے پر آمادہ کیا ہے مسلمانوں کی بڑی قوّت اسلام ہے وہ اس میں تحریف کر رہے ہیں اور اسبابِ زوال میں خطرناک چیز یورپ کی شیطانی تہذیب ہے اس کو وہ اپنا رہے ہیں ۔

۳۔ وَبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۝ وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ج وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ط وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ط مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ج وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ط وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝	یہود کے دلوں پر بندش ہدایت کی مُہر لگ چکی ان کے کفر کی وجہ سے اور حضرت مریم پر بڑا بہتان باندھنے کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے عیسیٰ بن مریم کو جو خدا کے رسول تھے قتل کر ڈالا اور اُنہوں نے اسکو نہ قتل کیا نہ سولی پر چڑھایا لیکن شبہ پڑ گیا اُنکو اور جو حضرت عیسیٰ کے متعلق اختلاف کرتے تھے وہ شک میں ہیں انکو علم نہیں صرف اٹکل پچو باتوں پر چلتے ہیں اور انہوں نے یقیناً حضرت عیسیٰ کو قتل نہیں کیا بلکہ اس کو اللہ نے اپنی طرف اُٹھا لیا اور وہ غالب اور حکمت

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۚ (النساء: ۱۵۶ تا ۱۵۹)

والا ہے اور اہل کتاب کا کوئی گروہ نہیں مگر وہ حضرت عیسیٰؑ پر اس کے مرنے سے پہلے ایمان لائے گا اور وہ ان کے اعمال پر گواہ ہوں گے۔

اس آیت میں چند امور بیان ہوئے ہیں۔

(۱) کہ حضرت عیسیٰ نہ قتل ہوتے نہ سولی پر چڑھائے گئے۔ جو لوگ قتل اور صلب کے قائل ہیں جیسے یہود و نصاریٰ وہ قطعاً غلطی پر ہیں۔ قرآن نے واضح الفاظ میں ان کی تردید کی۔ مرزائیوں یا مرزا کا یہ کہنا کہ سولی پر چڑھائے گئے ہیں لیکن سولی پہ مرے نہیں۔ یہ قول بھی یہود و نصاریٰ کی طرح قرآن کے خلاف ہے۔ مَا صَلَبُوْهُ کا یہ معنی تراشنا کہ سولی پر نہیں مرے لغت عرب کے خلاف ہے۔ صلب کے معنی سولی پر چڑھانا اور ما صلب کا معنی سولی پر نہ چڑھانا ہے۔ یہ قطعاً قرآن کی تحریف ہے کہ ما صلبوہ کا یہ معنی لیا جائے کہ یہود نے حضرت عیسیٰ کو سولی پر چڑھایا لیکن سولی پر اس کو موت نہیں آئی۔

(۲) آیت میں وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا کے بعد فرمایا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ یعنی حضرت عیسیٰ قتل نہیں ہوتے اللہ نے اس کو اپنی طرف اٹھایا۔ ما قتلوہ اور بل رفعہ اللہ میں ضمیر حضرت عیسیٰ کو راجع ہے اور عیسیٰ نام ہے جسم اور روح دونوں کا یعنی عیسیٰ جو مجموعہ روح و جسم کا ہے اس پر قتل واقع نہیں ہوا بلکہ بجائے قتل کے رفع الی اللہ واقع ہوا۔ یہ ظاہر ہے کہ مراد یہ ہے کہ یہاں جس ذات سے قتل کی نفی ہوئی اسی کے لئے رفع کا اثبات ہے اور قتل نہ صرف جسم کا ممکن ہے اور نہ صرف روح کا بلکہ جسم اور روح کے مجموعہ پر قتل واقع ہو سکتا ہے کیونکہ قتل کا مفہوم یہ ہے کہ کسی خارجی مؤثر کے ذریعہ روح کو جسم سے الگ کیا جائے۔ جب غیر مقتول جسم مع روح ہے تو مرفوع الی اللہ بھی جسم و روح کا مجموعہ ہوگا۔

(۳) اس کے علاوہ جب رفع حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر واقع ہے تو جب تک اس کے

خلاف قرینہ نہ ہو تو جسمانی رفع ہی مراد ہو گا جیسے سورۃ یوسف میں وَرَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَى الْعَرْشِ کہ حضرت یوسفؑ نے والدین کو تخت پر اُٹھایا جس کا معنی جسم اور روح دونوں کا اٹھانا ہے نہ کہ والدین کی رُوح کو اُٹھانا۔

(۴) اگر روحانی رفع لیا جاوے تو یہ چند وجوہات سے غلط ہے۔

ایک وجہ یہ کہ مجاز کو اختیار کرنا ہے بلا قرینہ مثلاً یَرْفَعُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ یہاں چونکہ جسمانی رفع مراد نہ تھا دینی رفع مراد تھا تو لبطور قرینہ لفظ درجات لایا گیا۔ اسی طرح وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ۔ یہاں بھی قرینہ موجود ہے جو لفظ درجات ہے۔

دُوسری وجہ رُوحانی رفع مراد لینے کے غلط ہونے کی یہ ہے کہ وَمَا قَتَلُوْهُ یَقِیْنًا بَلْ رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ کہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو اپنی طرف اُٹھایا۔ اب روحانی رفع مراد لینے میں معنی یہ ہو گا، کہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کا مرتبہ بلند کیا جو بالکل تحریف اور غلط ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام اس واقعہ سے قبل چالیس۴۰ سال پیغمبر کی حیثیت سے زمین پر رہے اور پیغمبر کے مرتبہ کی بلندی پیغمبر کے وقت سے ان کو حاصل ہوتی ہے تو اس وقت مرتبہ کی بلندی کی تخصیص بے فائدہ ہے اس کے علاوہ عربی زبان میں بَلْ کا استعمال دو مقابل چیزوں میں ہوتا ہے لیکن یہاں اگر رفع سے روحانی رفع اور مرتبہ کی بلندی مرزائی تحریف کے مطابق لی جائے تو مقابلہ فوت ہو جائے گا جس سے بَلْ کا استعمال غلط پڑے گا کیونکہ معنی یہ ہو گا کہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو مصلوب و مقتول نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کا مرتبہ بلند کیا۔ اگر کوئی پیغمبر یا مومن ناحق مقتول و مصلوب ہو جائے تو وہ شہید ہو گا اور شہید کا مرتبہ بلند ہوتا ہے تو اس کا مقابلہ بل رفعہ اللہ کے لئے درست ہو گا جب کہ اس سے بھی مرتبہ کی بلندی اور رفع رُوحانی مراد ہو گا۔ مرزائی تحریف کا یہ دعویٰ کہ بائیبل کی رو سے مصلوب ملعون ہوتا ہے اس لئے ملعونیت کی نفی اور مرتبہ کی

بلندی میں مقابلہ صحیح ہوا، یہ بھی جھوٹ اور غلط ہے۔ بائبل میں صاف لکھا ہے کہ جو کسی جرم سے مصلوب ہو وہ ملعون ہے نہ وہ مصلوب جو ناحق سولی دیا گیا ہو بلکہ وہ تو شہید ہوگا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ روحانی رفع اللہ نے ہر نبی کو عطا کیا ہے خصوصاً خاتم الانبیاء کو سب سے بڑھ کر روحانی رفع عطا ہوئی۔ تو اگر یہی معنی مراد ہوتا اور رفع جسمانی آسمانی مراد نہ ہوتا، تو بَلْ رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ کے الفاظ ہر نبی کے حق میں مذکور ہوتے خصوصاً خاتم الانبیاء علیہ السلام کے حق میں تو حضرت مسیحؑ سے رفع کی خصوصیت باقی نہ رہتی۔ خصوصیت صاف بتلا رہی ہے کہ یہ رفع جسمانی جو صرف حضرت مسیحؑ سے خاص ہے یا جس کو رفع جسمانی ہو چکا ہو۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ اس رفع کے بعد قرآن میں وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا کے الفاظ آئے ہیں جو اسی انداز میں کسی اور نبی کے بارے میں نہیں آئے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رفع جسمانی مراد ہے جس میں قدرت و قوت کا بھی ظہور ہے جس پر لفظ عزیز دلالت کرتا ہے اور حکمت کا بھی ظہور ہے جس پر لفظ حکیما دلالت کرتا ہے جس کو ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

دوسرا امر جو آیت مذکورہ سے معلوم ہوتا ہے وہ ہے وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اہلِ کتاب کا کوئی فرقہ نہ ہوگا مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائیں گے حضرت عیسیٰ کی موت سے پہلے۔ بِهٖ اور مَوْتِهٖ دونوں ضمیروں کا مرجع حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہے۔ لَيُؤْمِنَنَّ کا لفظ جس میں نون تاکید ثقیلہ ہے جو مضارع کو مستقبل سے مختص کرتا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے مضمون کا تعلق نزول قرآن کے مابعد زمانے سے ہے اور ایسے زمانے سے ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اہلِ کتاب سے زمینی تعلق قائم ہو جو نزول مسیح کا زمانہ ہے جس سے مسیح کا نزول ثابت ہوا اور بل رفعہ اللہ سے صعود ثابت ہوتا ہے تو پوری آیت رفع و نزول دونوں پر مشتمل ہے یہی وجہ ہے کہ صحیحین کی حدیث بروایت ابی ہریرۃ نزول مسیح علیہ السلام کی حدیث مرفوع کے بعد ابوہریرۃ فرماتے ہیں فاقرؤا ان شئتم وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ۔ جس

میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ نزولِ مسیح من السمار کے بعد اہلِ کتاب ان پر ایمان لائیں گے۔ یہ مسئلہ خالص نقلی ہے۔ عقل سے معلوم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ابوہریرہؓ کا موقوف اس میں مرفوع کے حکم میں ہے یعنی حضور علیہ السلام سے ابوہریرہؓ نے یہ ضرور سن لیا ہوگا کہ تمام کتابیوں کا حضرت علیہ السلام پر ایمان لانا اُن کے آخر زمانے میں نازل ہونے اور تشریف لانے کے بعد ضرور ہوگا۔ باقی مَوْتِہٖ کی ضمیر کتابی کو لوٹانا صحیح نہیں۔ ایک تو انتشار ضمائر شان بلاغت کے خلاف ہے دوم مَوْتِہٖ کی قید لغو ہو کر شان بلاغت کے خلاف ہوگی کیونکہ معنی یہ ہوگا کہ ہر کتابی اپنے مرنے سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے گا حالانکہ ایمان تو مرنے سے پہلے لایا جاتا ہے جیسے نماز روزہ کو مرنے سے پہلے ادا کیا جاتا ہے۔ تو جو چیز عقل سے معلوم ہو اس کو بطور قید لانا کہ وہ مرنے سے پہلے ایمان لائیں گے ایسا ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ میں نے روٹی کھائی مرنے سے پہلے، پانی پیا مرنے سے پہلے اور ظاہر ہے کہ یہ غیر بلیغ کلام ہے۔ اگر یہ توجیہ کی جائے کہ حالتِ نزع میں ایمان لائیں گے تو یہ ایمان غیر معتبر ہے ورنہ فرعون بھی مومن قرار پائے گا تو ایسے غیر معتبر ایمان کا ذکر ہی ——— عبث ہے اس کے علاوہ نزع کی حالت میں تو ہر کافر اپنے نبی پر ایمان لاتا ہے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اس امر کی تخصیص نہیں رہی۔

۴۔ وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ○ وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ○ (الزخرف آیۃ ۶۱،۶۲)	حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی نشانی ہے قیامت میں شک نہ کرو اور میری پیروی کرو یہی سیدھی راہ ہے شیطان تم کو اس بات کے ماننے سے نہ روکے۔ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کو قیامت کی علامت دو وجہ سے ٹھہرایا گیا۔ ایک ان کی بلا باپ پیدائش جو مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی دلیل ہے۔ دوم قیامت کے قریب ان کا آسمان سے نزول جو قربِ قیامت کی نشانی ہے۔ سیاق وسباق کے مطابق اِنَّهٗ کی ضمیر کا مرجع عیسیٰ علیہ السلام ہے

اور اس کے سوا جو بھی رائے ہو وہ ضعیف ہے۔ ابن ماجہ صـ ۳۰۹ باب فتنۃ الدجال میں حدیث اسراء کے تحت حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قیامت کا سوال ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ اس کے واقع ہونے کا وقت تو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جب دجال کا ذکر ہوا تو حضرت عیسیٰ نے فرمایا میں نازل ہوں گا اور اس کو قتل کروں گا۔ اس آیت کی تفسیر میں ابن جریر نے آسمان سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول قیامت سے پہلے ابن عباس، ابی مالک، عوف، مجاہد، قتادہ، سدی ضحاک و ابنِ زید کی روایات سے نقل کیا ہے جو آپ کے نزول کی دلیل ہے اور آیت مذکورہ میں اسی نزول کے پیش نظر حضرت عیسیٰ کو قیامت کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ یہی صحیح معنی ہے۔ اگر بغیر باپ کی پیدائش کی علامت ہوتی تو اس اطلاق کے زیادہ حق دار حضرت آدم تھے جن کی پیدائش ماں اور باپ دونوں کے بغیر ہوئی لیکن قرآن میں علم للساعۃ کا اطلاق اُن پر نہیں آیا۔ معلوم ہوا کہ مراد الٰہی علامت قیامت کا حضرت عیسیٰ کا آسمان سے قرب قیامت میں نزول ہے اور جو اس عقیدے سے روک دے وہ شیطان ہے۔ فَلَا یَصُدَّنَّکُمُ الشَّیْطَانُ تم کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان سے نازل ہونے کے عقیدے سے شیطان روک نہ دے۔ یعنی اس عقیدے سے روکنے والا قرآن کے اس ارشاد کے مطابق شیطان ہے۔

۵۔ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرْیَمُ	(اس وقت کو یاد کرو) جبکہ فرشتوں نے کہا کہ اے
اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکِ بِکَلِمَۃٍ مِّنْہُ	مریم بے شک اللہ تم کو بشارت دیتے ہیں ایک
اسْمُہُ الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ	کلمہ کی جو منجانب اللہ ہوگا اس کا نام مسیح عیسیٰ
مَرْیَمَ وَجِیْھًا فِی الدُّنْیَا وَ	بن مریم ہوگا با آبرو ہونگے دنیا میں اور آخرت میں
الْاٰخِرَۃِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ ط	اور منجملہ مقربین کے ہونگے۔ (آل عمران آیۃ: ۴۵)

یہاں عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں اُن کا مقربین سے ہونا بیان ہوا ہے۔ دوسری جگہ اہل جنت کے حق میں سورۃ واقعہ میں بیان ہوا ہے اُولٰٓئِکَ الْمُقَرَّبُوْنَ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ تیسری جگہ ملائکہ کے حق میں آیا ہے لن یستنکف المسیح ان یکون عبد اللہ و

ولا الملٰئِکَۃ المقرّبون ط مسیح کو اللہ کے بندہ ہونے سے عار نہیں اور نہ مقرّب ملائکہ کو عار ہے ۔ ان تینوں جگہ میں قرب سے مراد قرب جسمی و حسی و سماوی مراد ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اسی آیت کی تفسیر میں امام رازی نے تفسیر کبیر اور ابوالسعود نے اپنی تفسیر میں حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کا آسمان پر جسم کے ساتھ اٹھایا جانا ذکر کیا ہے اور مدارک ، خازن ، سراج المنیر اور کشاف میں ہے فکونہٖ مِنَ المُقَرَّبِیْن ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کا مقربین میں سے ہونا ، ان کو اسمان پر اُٹھانا اور ملائکہ کی صحبت اختیار کرنا اور پھر باقیماندہ امور کی تکمیل کے لئے ان کا زمین پر نزول فرمانا مثلاً نکاح ، حج ، جہاد کرنا اور مسیحی اقوام کے فتنوں کو مٹانا ۔

حیات و نزول مسیحؑ حدیث کی روشنی میں

۱۔ بخاری میں ابوہریرۃ نے حضور علیہ السّلام سے جو حدیث نقل کی ہے ۔ حضورؐ نے فرمایا قسم ہے خدا کی کہ عیسیٰ اوپر سے تم میں نازل ہوگا حضرت مریم کا فرزند جو حاکم ہوگا انصاف والا ، صلیبی قوت توڑ دے گا اور خنزیر کے قتل کا حکم دے گا اور تمام لوگوں کے مسلمان ہو جانے سے جہاد کی ضرورت نہ رہے گی اور لوگوں کو اس قدر مال دے گا کہ کوئی قبول کرنے والا نہ ہوگا اور عبادت کی محبّت اس قدر بڑھ جائے گی کہ لوگوں کو ایک سجدہ تمام دنیا کی دولت سے بہتر نظر آئے گا ۔ پھر ابوہریرۃ نے اس کی تصدیق کے لئے اس آیت کی طرف توجہ دلائی جس کا معنی یہ ہے کہ اس وقت کوئی کتابی نہ ہوگا مگر ایمان لائے گا عیسیٰ علیہ السّلام پر ۔ (بقول مرزا صاحب قرآن کے بعد اصح کتاب بخاری کی حدیث ہے)

۲۔ حدیث دوم یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ میرے اور عیسیٰ کے درمیان نبی نہیں اور وہ اُتریں گے جب اس کو دیکھو تو پہچان لو ۔ وہ قامت کے درمیانے ہیں سرخ و سفید ہیں ۔ دو زرد کپڑوں میں اُتریں گے ۔ سر کے بال اس کے ایسے معلوم ہوں گے کہ گویا اس سے پانی ٹپکتا ہے اگرچہ اس کو پانی نہیں پہنچا ہوگا تو اسلام پر لوگوں سے جہاد کریں گے ۔ صلیبی قوت توڑ دیں گے ۔ خنزیر

کے قتل کا حکم دیں گے جزیہ موقوف کریں گے۔ اس کے وقت اسلام کے سوا تمام ادیان کا خاتمہ ہوگا دجال کو قتل کریں گے زمین میں چالیس برس رہیں گے پھر وفات پائیں گے اور مسلمان اس پر نماز جنازہ پڑھیں گے۔ (ابوداؤد عن ابوہریرۃ مرفوعاً ج ۲ ص ۲۳۸)

۳۔ مشکوٰۃ باب نزول عیسیٰ میں عبداللہ بن عمرو نے حضور سے نقل کیا ہے کہ ابنِ مریم زمین پر اُتریں گے شادی کریں گے اور اولاد پیدا ہوگی اور ٹھہریں گے زمین پر پینتالیس برس پھر فوت ہوں گے اور دفن ہوں گے میرے مقبرہ میں تو قیامت میں اُٹھیں گے ہم اور عیسیٰ ابنِ مریم ایک مقبرہ سے، جو ابوبکر و عمر کے درمیان ہوں گے۔

۴۔ صحیح مسلم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰ دمشق کے مشرق میں سفید منارہ پر اُتریں گے دو کپڑوں میں درمیان دو فرشتوں کے۔ دونوں ہتھیلی فرشتوں پر رکھے ہوتے ہوں گے دجال کو باب لُدّ پر پائیں گے تو اس کو قتل کریں گے۔

آیات حیات مسیح علیہ السلام کثیر التعداد ہیں اور احادیث تو حدِ تواتر کو پہنچتی ہیں جو ۲۹ صحابہ سے منقول ہیں لیکن ہم نے بغرضِ اختصار پانچ آیات اور صرف چار احادیث پر اکتفاء کیا۔ ان احادیث میں حضور علیہ السلام نے تحفظِ ایمان اور گمراہی سے بچانے کے لئے حضرت مسیح کی جو علامات ذکر کی ہیں وہی کافی شافی ہیں اور جو گمراہ ہیں کہ استعارات اور مجازات سے وہ پوری تاریخ اور ایک دنیا کو بدلا سکتے ہیں اُن کے لئے قرآن و احادیث کا دفتر بھی بے کار ہے۔ ان چار احادیث سے حضرت مسیح موعود کی معرفت کی جو واضح علامات ہیں وہ نمبروار حسبِ ذیل ہیں

۱۔ مسیح موعود کا باپ نہ ہوگا اِس لئے عام ضابطہ کے خلاف وہ اپنی والدہ مریم سے منسوب ہوگا لیکن مرزا غلام احمد کا باپ تھا مرزا غلام مرتضیٰ تھا اور اس کی والدہ نام ممتاز بی بی تھا اور وہ باپ سے منسوب تھا نہ کہ ماں سے۔

۲۔ وہ حاکم ہوگا لیکن مرزا غلام تھا اور انگریزی حکومت کا غلام تھا۔

۳۔ عادل ہوگا۔ عدل اللہ کے قانون چلانے کا نام ہے۔ مرزا کے وقت شرعی قانون بند تھا اور

انگریز کا قانون خود اُس پر اور اس کے مریدوں پر بھی نافذ تھا۔

۴۔ صلیبی قوت کو توڑ دے گا۔ مرزا کے وقت میں صلیبی قوت کو اس قدر غلبہ حاصل ہوا کہ اس سے پہلے نہ تھا۔ خود اُن کا باپ اُن کے اقرار کے مطابق پچاس گھوڑوں کے سواروں کو مہیا کر کے تحریکِ آزادی ۱۸۵۷ء میں صلیبی قوت کو ہندوستان پر مسلط کرنے کے لئے لڑا اور خود مرزا نے تحفۂ قیصریہ میں اپنے آنے کا مقصد یہ ظاہر کیا کہ میں انگریز کی صلیبی حکومت کے لئے ایک ایسی فوج تیار کروں جو انگریز کی حکومت کی وفادار ہو۔

۵۔ اس کے وقت میں خنزیر خوری کا خاتمہ ہوگا لیکن مرزا کے وقت میں اس میں اضافہ ہوا۔

۶۔ وہ لوگوں پر اس قدر مال برسائے گا کہ کوئی قبول کرنے والا نہ ہوگا۔ مرزا نے مال نہیں دیا بلکہ لینا شروع کیا۔ چندہ عام اور چندہ بہشتی مقبرہ کو شرطِ ایمان قرار دیا۔

۷۔ عبادت کا ذوق اتنا بڑھے گا کہ ایک سجدہ کی قیمت لوگوں کی نگاہوں میں ساری دنیا سے زائد ہوگی لیکن مرزا کے وقت میں نصاریٰ نے مسلمانوں کو مرتد بنانا شروع کیا اور لاکھوں کو مرتد کیا۔

۹۔ وہ آسمان سے زمین پر اُتریں گے۔ لیکن مرزا زمین ہی میں پیدا ہوئے اور زمین ہی پر رہے۔

۱۰۔ فرشتوں پر ہاتھ رکھے ہوتے ہوں گے۔ لیکن مرزا کو کسی فرشتہ کا دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوا۔

۱۱۔ دمشق کے سفید منارہ پر نزول فرمائیں گے۔ لیکن مرزا کو عرب کی سرزمین کی زیارت بھی کبھی نصیب نہیں ہوئی۔

۱۲۔ بابِ لُدّ پر یہودی دجال کو قتل کریں گے۔ لیکن مرزا کو نہ لدّ کا دیکھنا نصیب ہوا، اور نہ دجال کا۔ البتہ اس کی رُوحانی اولاد نے دجال کی قوم یہود سے تل ابیب میں تعلق پیدا کیا جب کہ تمام عالمِ اسلام کا اُن سے تعلق منقطع ہو چکا ہے۔ شاید کہ ظہورِ دجال کے وقت امداد کے لئے حاضر رہیں۔

۱۳۔ اسلام کے سوا کوئی دین باقی نہ رہے گا۔ لیکن سب باطل ادیان مرزا کے وقت باقی رہے بلکہ اور نئے باطل ادیان بھی خلافِ اسلام پیدا ہوئے جن میں خود ایک دینِ مرزائیت ہے جو وحدتِ

اسلامی کے بر خلاف ایٹم بم ہے۔

۱۴۔ حج کریں گے۔ مرزا کو موت تک حج نصیب نہ ہوا۔

۱۵۔ وہ شادی کریں گے اور اولاد ہوگی یعنی نزول سے قبل نہ اُس نے شادی کی ہوگی اور نہ اولاد ہوگی۔ لیکن مرزا کی شادی اور اولاد دعویٰ سے قبل موجود تھی۔

۱۶۔ جہاد کریں گے اور جزیہ موقوف کریں گے۔ مرزا نے جہاد کرنے کی بجائے خود جہاد کو حرام ٹھہرا کر نصاریٰ کے استعمار کے لئے راہ صاف کیا۔ جزیہ کا تو سوال ہی نہیں رہا۔

۱۷۔ باشندگان زمین کا ایک ہی دین یعنی اسلام ہوگا۔ اس لئے مختلف مذاہب کی لڑائیاں موقوف ہوں گی۔ لیکن مرزا کے وقت میں مختلف مذاہب نے مسلمانوں پر ہندوستان ترکی، فلسطین، شمالی افریقہ میں جو مظالم کئے۔ اُن کی تاریخ میں نظیر نہیں۔ یہ سب مرزا کی برکت تھی۔

۱۸۔ امن قائم ہوگا اور جنگ ختم ہوگی۔ لیکن مرزا کے وقت میں اور اس کے بعد امن کا نام و نشان مٹ گیا اور جنگ کے لئے وہ مُہلک اوزار تیار کئے گئے کہ مرزا اور اس کے بعد کی ایک جنگ کی تباہی سابق زمانے کی سینکڑوں جنگوں کی تباہی سے زیادہ ہے۔

ان علامات کے لحاظ سے مرزا کی شخصیت ضدِ مسیح موعود ہے۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ مجازات و استعارات کی مشین سے پوری تاریخ بھی بدلائی جاسکتی ہے جس کی نہ قادیان میں کبھی کمی رہی نہ ربوہ میں۔ تو ایسی صورت میں تمام قرآن و حدیث بلکہ پوری تاریخ کو بازیچۂ اطفال بنایا جاسکتا ہے اور ایسا کرنے سے یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ پھر قادیانی و مرزائی تاویلات کے آگے ہر چیز کی حقیقت بدلائی جاسکتی ہے اور الفاظ اور تعبیرات سے کسی مقصد کا تعین ممکن نہیں بلکہ مرزائیوں کے لئے الفاظ ربڑ کا ایک ایسا تسمہ ہے کہ جہاں تک چاہو اس کو پھیلا سکتے ہو اور ایسی صورت میں کہ نزولِ مسیح کی علامات اس کی ضد پر بھی چسپاں کئے جاسکتے ہیں۔ تو پھر ان علامات کا بیان ہی بے فائدہ رہا کیونکہ علامات سے مسیح کی شخصیت کا تعین مقصود تھا اور جب نہ نام سے تعین ممکن نہ والدہ کے نام سے نہ مکان سے نہ مقاصدِ نزول سے بلکہ ان تمام علامات کی ضد شخصیت

کو بھی اس میں گھسیڑا جا سکتا ہے تو تمام نظامہائے سلطنت کے دفتری الفاظ بھی تاویل سے لغو اور بے فائدہ ہو سکتے ہیں۔

شیخ اکبر اور حیات عیسیٰ علیہ السلام | شیخ اکبر فتوحات مکیہ باب ۳۶۷ میں لکھتے ہیں۔

فِی حَدِیْثِ الْمِعْرَاجِ فَلَمَّا دَخَلَ	حدیث معراج میں ہے کہ وہ داخل ہوئے تو ان کو
بِجَسَدِہٖ فَاِنَّہٗ لَمْ یَمُتْ اِلیٰ	عیسیٰ جسم کیساتھ ملے کیونکہ وہ اب نہیں مرے بلکہ
الآنَ بَلْ رَفَعَہُ اللّٰہُ اِلیٰ ھٰذِہِ السَّمَاءِ	اللہ نے اسکو اس آسمان تک اُٹھایا اور اس میں
وَاَسْکَنَہٗ بِھَا وَحَکَّمَہٗ فِیْھَا وَھُوَ	بسایا اور اس کا حکم اسمیں چلتا رہا اور وہ ہمارے
شَیْخُنَا الَّذِیْ رَجَعْنَا عَلیٰ یَدِہٖ وَلَہٗ	پہلے شیخ ہیں جسکے ہاتھ پر ہم نے خدا کیطرف رجوع کیا۔
بِنَا عِنَایَۃٌ عَظِیْمَۃٌ وَلَا یَغْفُلُ عَنَّا	انکو ہم پر مہربانی ہے اور ہم سے وہ غفلت نہیں کرتے
سَاعَۃً وَاَرْجُوْ اَنْ اُدْرِکَہٗ فِیْ نُزُوْلِہٖ	مجھے اُمید ہے کہ اگر اللہ نے چاہا تو میں اس کے زمین
اِنْشَاءَ اللّٰہُ تَعَالیٰ۔	پر نازل ہونے کا زمانہ پا لوں گا۔

حیاتِ مسیح تاریخی نقطۂ نظر سے

حضرت مسیح حضور علیہ السلام کے قریب تر پیغمبر ہیں اور تمام نصاریٰ اور مسلمان ان کی عظمت اور شخصیت کو مانتے ہیں۔ نصاریٰ نے بالخصوص ہزاروں سال کے آثار قدیمہ کو دریافت کیا لیکن نہ خود نصاریٰ اور نہ مؤرخوں کو یہ پتہ لگا کہ عیسیٰ علیہ السلام مرنے سے بچ کر فلسطین سے طویل سفر کاٹ کر کشمیر آئے اور پھر وہیں فوت ہو کر محلہ خانیار میں دفن ہوئے اور نہ ہندوستان اور کشمیر والوں کو پتہ لگا۔ صرف مرزا کو دعویٰ مسیحیت کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے نئی تاریخ بنانی پڑی۔ اگر اس طرح فرضی تاریخ گھڑنا درست ہو تو تمام گذشتہ انبیاء اور سلاطین کی تاریخیں ناقابلِ اعتبار قرار پائیں گی بلکہ پوری تاریخ ناقابلِ اعتبار بن جائے گی۔

حضرت عیسیٰؑ کی حیات و نزول کی حکمت

۱۔ آپ کی ذاتی حیثیت کے اعتبار سے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نانا (عمران) جو زاہد اور امام تھے حضرت سلیمان علیہ السلام کی نسل سے تھے اور آپ کی بیوی حنہ بنت فاقوذ حضرت داؤد علیہ السلام کی نسل سے تھی۔ جو بنا بر تحقیقی قول حضرت ذکریا علیہ السلام کی بیوی الیشاع کی بھانجی تھی گویا حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت مریم علیہ السلام کے خالہ زاد بھائی تھے۔ حدیثِ معراج میں حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کو ابنا خالۃ یعنی خالہ زاد بھائی کہا گیا ہے وہ مجاز ہے کیونکہ عمران و حنہ کی حضرت مریم علیہ السلام کے سوا اور کوئی اولاد نہ تھی۔ مریم کے معنی سریانی زبان میں خادم کے ہیں۔ حضرت مریم سے حضرت مسیح عیسیٰ علیہ السلام نفخہ جبرائیل سے پیدا ہوئے۔ مسیح کے معنی مبارک ہے یا بمعنی سیاحت کرنے والے جس کا گھر نہ ہو۔ نفخہ جبرائیلی جو گریبان مریم میں پھونکا گیا وہ کلمہ کن تھا۔ اس وجہ سے کلمہ کہلائے۔ اس بنیاد پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت مادری رشتہ سے انسانی ہے اور نفخہ جبرئیلی کے اعتبار سے ملکی ہے۔ نفخہ جبرئیلی پدری تعلق کے قائم مقام تھا لہٰذا ذاتِ مسیح میں مادری اور پدری دونوں رشتوں کا جمع ہونا ضروری ہے۔ مادری رشتہ کے لحاظ سے زمین پر رہنا، زمینی خواہشات کھانا، پینا، میلان صنفی کا موجود ہونا ضروری تھا اور جبرائیلی اور ملکی رشتہ کے لحاظ سے ملکی خواص کھانے، پینے وغیرہ خواہشات کا منقطع ہونا لازمی تھا۔ اس حکمت کی بنیاد پر آپ میں زمینی اور انسانی زندگی کے صفات بھی جمع کئے گئے اور ملکی زندگی سے آسمانی زندگی اور انسانی خواہشات سے استغناء اور ملکی صفات آپ کو عطا کئے گئے۔ لہٰذا حضرت مسیح علیہ السلام کا طولِ حیاتِ سماوی اور ضروریات انسانی سے منقطع ہونا آپ کی شخصیت کے ملکی پہلو کا عقلی تقاضا ہے اور جب دوبارہ زمین پر نزول فرمائیں گے تو زمینی خواص سے موصوف ہوں گے۔ اس لئے حدیثِ نزولِ مسیح

میں آیا ہے کہ یَتَزَوَّجُ وَ یُولَدُ لَہٗ۔ کہ وہ شادی کریں گے اور ان کی اولاد بھی ہوگی۔ شیخ اکبر فتوحات باب میں لکھتے ہیں۔ نصفہٗ بشر و نصفہٗ ملك۔ یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کا نصف بشر اور نصف ملک ہے۔ آسمان پر ملکی خواص اور زمین پر انسانی خواص ہوں گے۔

ازالۂ شبہہ سطحی نگاہ والے شبہہ کرتے ہیں کہ اگر مسیح آسمان پر ہیں تو کھانا پینا کہاں سے ہے اس کا پہلا جواب تو اب گزرا کہ آسمانی زندگی ان کے ملکی طرز کی زندگی ہے جس میں وہ کھانے، پینے اور اس کے لوازمات سے بے نیاز ہیں۔ جس کے کچھ نظائر زمینی زندگی میں بھی موجود ہیں۔

۱۔ طبقات شافعیہ ج ۲ صـ ۲۷۵ میں شیخ عزیز الدین فاروقی سے روایت ہے کہ اُنہوں نے عراق میں ایک آدمی دیکھا کہ وہ نہ کھاتا تھا نہ پیتا تھا۔

۲۔ امام ذہبی فرماتے ہیں کہ اندلس میں ایک عورت تھی۔ جو بیس ۲۰ سال سے نہ کھاتی اور نہ پیتی تھی۔ جس کا واقعہ مشہور ہے۔

۳۔ حاکم تاریخ نیشاپور میں عیسیٰ بن محمد الطہمانی سے نقل کرتے ہیں کہ رحمت نام ایک عورت کا شوہر شہید ہو چکا تھا تو اُس نے شوہر کو خواب میں دیکھا کہ وہ جنت کا طعام کھاتا ہے تو اُس نے اس میں سے ایک ٹکڑا اپنی بیوی کو دے دیا۔ جب وہ خواب سے بیدار ہوئی تو اُس کو عمر بھر

بحوالہ مذکورہ طبقات دوسرا جواب یہ ہے کہ زمین کو آسمان سے ایسی نسبت ہے جیسے رائی کے دانہ کو پہاڑ سے۔ تو جب اس چھوٹی زمین پر اللہ تعالیٰ نے اربوں مخلوقات کے کھانے کا انتظام فرما دیا ہے تو کیا آسمان پر ایک فرد کی ضروریات کا انتظام کرنا اس کے لئے مشکل ہے؟ قطعاً نہیں۔

۲۔ حکمتِ نزولِ حضرت عیسیٰؑ بلحاظ ختمِ نبوۃ

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ	جب لیا اللہ نے عہد نبیوں سے کہ جو کچھ میں
لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ	نے دیا کتاب اور علم اور پھر آئے تمہارے

ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ	پاس بڑا رسول کہ سچا بتادے تمہارے پاس
لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ	والی کتاب کو تو اس رسول پر ایمان لاؤ گے
وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ط قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ	اور اس کی مدد کروگے۔ فرمایا کیا تم نے
وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ط	اقرار کیا اور اس شرط پر ہمارا عہد قبول کر لیا
قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ط قَالَ فَاشْهَدُوْا	بولے ہم نے اقرار کر لیا۔ فرمایا تو اب گواہ رہو
وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ط (آل عمران: ۸۱)	اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔

حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہؓ بن عباس کی تفسیر کے مطابق یہ عہد انبیاء علیہم السلام سے خاتم الانبیاء علیہ السلام کے بارہ میں لیا گیا گویا حضور کریمؐ نبی الامم اور نبی الانبیاء بھی ہیں۔ آیت مذکورہ میں انبیاء علیہم السلام نے خاتم الانبیاء کی نبوۃ کو اعتقاداً اور اقراراً تسلیم کیا اور نصرۃً بالواسطہ بھی انبیاء علیہم السلام نے حضورؐ کی نبوت کی تصدیق کردی اور اپنی اُمتوں کو آپ کے نبی ہونے اور امداد دینے کی تاکید فرمائی جیسے موسیٰ علیہ السلام نے توراۃ کی کتاب استثناء باب ۸، باب ۲۳، داؤد علیہ السلام نے زبور باب ۴۵، حضرت سلیمان علیہ السلام نے غزل الغزلات، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انجیل یوحنا باب ۱۹ آیت ۵ تا آیت ۱۵ میں اعلان کیا۔ اب ضرورۃ تھی کہ آپ کی نبی الانبیاء کا عملی بالذات ظہور ہو جس کی ایک صورت حدیث معراج میں آپ کی امامتِ انبیاء علیہم السلام کی شکل میں ہوئی اور دوسری عملی صورت یہ ہوئی کہ آپ سے قریب نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آخری زمانہ تک زندہ رکھ کر نبی ہونے کے باوجود اُمتی کی پوزیشن میں خدمتِ دینِ محمدی کے لئے آسمان سے نازل فرمانا طے کیا گیا تاکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جملہ انبیاء علیہم السلام سابقین کی نمائندہ کے طور پر شرعِ محمدی کی خدمت و نصرت عملی رنگ میں انجام دیں اور حضور کی نبی الانبیائی کے عہدہ کو نمایاں کردیں۔ نبی الانبیائی کے منصب کی عملی تکمیل آئندہ کسی نبی کے ذریعہ ممکن نہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ بند تھا، اس لئے سابق انبیاء علیہم السلام میں سے ایک نبی کو آخری وقت کی نصرتِ دینِ محمدی و اظہارِ شان نبی الانبیائی کے لئے باقی رکھنا پڑا جو حضور کریمؐ

کے بعد عطاء عہدۂ نبوت کی بندش کی دلیل ہے یہی حکمت نزولِ عیسیٰ علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ختمِ نبوت کی حیثیت سے ہے۔

۳۔ حکمت نزولِ مسیحؑ بلحاظ قتلِ عالمی و اصلاحِ عمومی

اس سلسلے میں حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے نزول کی حکمتیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ آپ کے نزول کا ایک مقصد دجالی فتنے کا استیصال اور قتلِ دجّال ہے۔ دجّال مدعیِ الوہیت ہوگا اور آپ توحیدِ باری قائم کرنے اور غیر اللہ کی الوہیت کی طرف دعوت دینے کے جُرم میں اس کو قتل کریں گے جس سے خود آپ کی اُمّت کی گمراہی جو خود حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو الٰہ مانتی ہے خود حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے اس عملِ قتلِ دجّال سے باطل قرار پائے گی اور نصاریٰ کو ذہن نشین ہو جائے گا کہ خدا کے سوا کسی اور کو الٰہ ماننا ایسا عقیدہ ہے جو موجبِ سزا ر قتل ہے۔

۲۔ یہود آپ کے قتل اور مصلوب ہونے کے مدعّی تھے۔ جب آپ کے ہاتھوں دجّال یہودی اور اس کے ماننے والے یہود قتل کئے جائیں گے۔ تو یہ عملاً یہود کے اس جھوٹے دعویٰ کی تردید اور سزا ، ہوگی۔

۳۔ آپ دجال میں اسمی مناسبت ہے کہ آپ مسیح ہدایت ہیں اور مکان نہ رکھنے کی وجہ سے سیاحت کرتے تھے اس لئے مسیح کہلاتے اور دجال مسیح ضلالت ہے جو دائیں آنکھ کے ممسوح ہونے کی وجہ سے مسیح کہلاتا تھا تو آپ ہی کے ہاتھوں دجال ممسوحُ العین کے قتل اور اس کے متبعین کی تباہی زیادہ موزوں تھی۔

۴۔ اس وقت تمدن جدید اور سائنسی ترقی نے عالمی تباہی کی جو صورت پیدا کی ہے اس کو دیکھ کر عالم موجود کی اس تباہی اور خون ریزی اور عالمگیر فساد کی اصلاح اور ازالہ مادی ذرائع سے ہونا ناممکن ہوگیا ہے۔ پوری دنیا مادیت پرستی کی وجہ سے جہنم کے کنارہ پر کھڑی ہے۔ انسانی اخلاق کا تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے۔ انسانی لباس میں اس وقت حیوانیت اور حیوانی خذبات

بر سرِ عروج ہیں۔ اصلاح کی راہیں مادی ذرائع سے کلیۃً مسدود ہو چکی ہیں۔ اس وقت کا مشرقی و مغربی بلاک یاجوج و ماجوج کی صورت میں دنیا کی تخریب میں مصروف ہے۔ یاجوج ماجوج کو عبرانی زبان میں غوغ ماغوغ اور انگریزی میں گاگ میگاگ کہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو عقیدۃ الاسلام ص ۲۹۸ روس اور اسی طرح چین یاجوج ہے اور برطانیہ اور اسی طرح امریکہ وغیرہ ماجوج ہے اور بعض کاس میکاس اور بعض چین ماچین سے تعبیر کرتے ہیں۔ ناسخ التواریخ نے ہبوط آدم علیہ السلام سے تاریخ تعمیر سد ذی القرنین تک کی تاریخ سنہ ۳۴۶۰ ہبوطی لکھا ہے اور کبھی یاجوج ماجوج کا اطلاق مطلق کافر پر کیا جاتا ہے حدیثِ حشر میں ہے۔

مِنْ يَاجُوْجَ وَمَاجُوْجَ اَلف وَّ مِنْكُمْ رَجُلٌ۔ یعنی دوزخ میں یاجوج ماجوج سے ہزار اور تم میں سے ایک ہوگا۔

یعنی کافروں سے ہزار اور تم سے ایک ہوگا۔ حافظ ابنِ حجرؒ اور قرطبیؒ نے اس کی تشریح کی ہے۔ اَیْ مِنْهُمْ وَمِمَّنْ كَانَ عَلَى الشِّرْكِ مِثْلُهُمْ وَرَجُلٌ مِنْكُمْ اَیْ مِنْ احوا بِهٖ وَمِمَّنْ كَانَ مِثْلُهُمْ۔ گویا ہزار سے مطلق کافر اور منکم سے مطلق مؤمن مراد ہیں۔ سنہدرین جو کمار الیہود سے ہے اور اُن کے ہاں حدیث کا درجہ رکھتا ہے۔ جو خزائن الروم میں عبرانی خط میں موجود ہے نقل کیا ہے کہ عالم سنہ ۴۲۹۱ کے بعد یتیم ہو جائے گا اور اس کے بعد گوگ ماگوگ کی لڑائیاں ہوں گی، اور باقی ایام ماشیح کے ہوں گے۔ صاحبِ ناسخ نے ماشیح مبارک کو خاتم الانبیاء پر محمول کیا ہے اور عبری کمار میں ماشیح کے بعد لکھا ہے کہ اس کے بعد عالم یتیم بلا راعی رہ جائیگا یعنی نبوت ختم ہوگی بہرحال دورِ حاضر میں عالمی فساد مادیت انتہائی کی شکل میں متشکل ہو گئی ہے اس کا ازالہ اپنی ضد یعنی روحانیۃ انتہائی کے بغیر ناممکن ہے جس کے لئے قدرت کی طرف سے حضرت مسیح علیہ السلام مقدر ہے کہ وہ روح القدس کی پھونک سے پیدا ہوئے یہ پہلی روحانیت ہوئی وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ کے تحت زمینی زندگی میں بھی آپ کی تقویت روح القدس سے کی گئی۔ یہ دوسری روحانی قوت ہوئی۔ آسمان پر روح القدس کے ذریعہ اٹھائے گئے یہ تیسری تقویت

روحانیت کی ہوئی۔ آپ کا نزول از روئے حدیث ایسی حالت میں ہوگا وَاضِعًا كَفَّيْهِ عَلٰى اَجْنِحَةِ مَلَكَيْنِ کہ آپ کی دونوں ہتھیلیاں دو فرشتوں کے بازوؤں پر رکھی ہوئی ہونگی جیسے مسلم کی حدیث میں نواس بن سمعان سے آیا۔ یہ پانچویں ملکی اور رُوحانی قوت ہوئی۔ ان تمام قوتوں کا اثر یہ ہوگا کہ آپ کا ایک دعائیہ جملہ کہ اسے خدا اِن مادی مفسد یاجوجی ماجوجی، قوتوں کو ہلاک کردے ایسا کام انجام دے گا کہ تمام مادہ پرست یاجوجی ماجوجی ہستیاں اپنی اپنی جگہ پر ہلاک ہوں گی اور خس کم جہاں پاک کے تحت تخریبی سائنس کے علمبرداروں کا خاتمہ ہو جائے گا اور پوری زمین ان کی لاشوں سے پُر اور بدبُودار ہو جائے گی۔ مسلم کی حدیث نواس بن سمعان میں آیا ہے کہ یاجوج ماجوج حضرت عیسٰی علیہ السلام کا اور ان کے متبعین کا بھی محاصرہ کریں گے۔ فَيَرْغَبُ اللّٰهُ عِيْسٰى وَاَصْحَابُهٗ رسلُ اللّٰه عَلَيْهِمْ حضرت عیسٰی اور ان کے ساتھی دعا کریں گے تو اللہ اُن پر گردن پکڑنے والی بیماری مسلّط کر دے گا۔ فَيَصْبِحُوْنَ كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ تو ہو جائیں گے سب کے سب مردہ لاشوں کا ڈھیر کہ گویا ان سب کا مرنا ایک آدمی کا مرنا ہوگا۔ بالشت بھر زمین خالی نہ ہوگی جو اُن کی لاشوں کی بدبُو سے پُر نہ ہوئی ہوگی تو اللہ بُختی اُونٹوں جتنے بڑے بڑے پرندے بھیجے گا جو اُن کی لاشوں کو اُٹھا کر کہیں اور جگہ پھینک دیں گے۔ سائنس نے جو موجودہ ایٹمی دور کو جنم دیا ہے اُس کے ازالے کی تدبیر مادی قوت سے ممکن نہیں۔ اگر کوئی صالح حکومت ان کے توڑ کے لئے کارخانے بنائے تاکہ ان کا مقابلہ کیا جاسکے تو یہ مفسد قوتیں اس قدر آگے نکل چکی ہیں کہ ان کی برابری مشکل ہے اور پھر سائنسی آلاتِ حرب سے مسلّح سلطنتیں مشرقی بلاک کی یا مغربی بلاک کی، سب تخریب عالم اور فساد اور خدا دشمنی پر متفق ہیں۔ فساد اس قدر زوردار ہے جس کی نظیر تاریخ بشری میں ناپید ہے اس لئے صحیح مسلم میں عمران حصین کی حدیث میں اس دجّالی فتنہ کے متعلق مذکور ہے۔

مَا بَيْنَ خَلْقِ اٰدَمَ اِلٰى قِيَامِ السَّاعَةِ اَمْرٌ اَكْبَرُ مِنَ الدَّجَّالِ۔ — دجالی فتنہ سے بڑا کوئی فتنہ پیدائش آدم سے قیامت تک نہیں۔

پانچویں حکمت

پانچویں حکمت یہ ہے کہ موجودہ دور کے عالمی فتنوں اور ایٹمی تباہیوں کے بانی مبانی یہود و نصاریٰ ہیں۔ اشتراکیت کا بانی کارل مارکس یہودی ہے۔ ایٹم بم کا موجد شوپن ہار یہودی ہے۔ تہذیب جدید کے خدا فراموشانہ، فاسقانہ معاشرہ اور انسان کش سامراجیت کی بنیاد مسیحی طاقتوں نے قائم کی ہے اور دیگر مذاہب والوں کو مثلاً مسلمانوں کو بگاڑنے والی بھی عیسائی قومیں ہیں۔ اس لئے ضروری ہوا کہ ایک اسرائیلی پیغمبر جو مسیحی اقوام کا پیشوا ہے انہی کے ہاتھوں ان کی اُمت کے پیدا کردہ فساد کا خاتمہ ہو۔ الغرض اُمتِ مسیح علیہ السلام نے مادی اور سائنسی ایٹمی ذرائع سے جو عالمی فساد برپا کیا ہے اور زمینی قوتیں اس کے مقابلہ سے عاجز ہیں اور اب بجز مذکورہ آسمانی تدبیر کے زمین کی اصلاح قطعاً ناممکن ہے اس لئے عقلاً بھی نزولِ مسیح علیہ السلام کی ضرورت ہے۔ جو خدا کی تدبیر نے ہزاروں سال پیشتر طے کر دیا ہے نہ کہ دجالی قوتوں کا وہ کاسہ لیس شخص جو مسیحیت کی دکان جما کر دجالی قوتوں کا دستِ بازو بن جاتے اور اسلام کے چودہ سو سال میں کمائے ہوئے مسلمانوں کو کافر کہہ کر سابق محنت کو بھی ختم کر دے۔

فائدہ

سدِ ذوالقرنین کے متعلق | دنیا میں اس وقت بہت سد ہیں۔ ایک دیوار چین جو طویل و عریض ہے جس کو منگولی زبان میں نکودہ اور ترکی زبان میں بوتورقہ کہتے ہیں۔

دوم بخارا اور ترمذ کے درمیان جس کو دربند کہتے ہیں یہ تیمور کے وقت میں موجود تھا۔

سوم داغستان کا سد۔ اس کا نام باب الابواب ہے اور دربند بھی کہتے ہیں۔ بستانی نے دائرۃ المعارف میں اس کی تفصیل بیان کی ہے۔

چہارم وہ سد جو کاکیشیا میں قفقاز کے پاس درہ داریال میں ہے۔ یاقوت نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ وہ پگھلے ہوئے تانبے کا ہے اور باقی تین سد پتھر کے ہیں۔ لہٰذا قرآنی تشریح کے مطابق

سدِ ذوالقرنین سے یہی سد چہارم مراد ہے۔ ناسخ التواریخ میں اس کی تصریح کی گئی ہے۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ خردار نے کتاب المسالک میں لکھا ہے کہ عباسی خلیفہ واثق باللہ نے سدِ ذوالقرنین کی تحقیق کے لئے ماہرین کا ایک کمیشن بھیجا تو اُس نے بھی اِسی سد کو مطابق قرآن قرار دیا۔ اسی سد ذوالقرنین کو فارس میں درہ آہنی اور ترکی زبان میں وامرکپو اور چینی زبان میں یچاگ کورائی ہے یعنی کورکا درہ۔ کور سے مراد گورش ہے۔ گورش سائرس یخسرو کا نام ہے۔

ذُوالقرنین

ذوالقرنین کے تین سفر قرآن میں ذکر ہیں۔ مغربی، مشرقی اور تیسرا سفر غالباً شمالی ہے۔

ذوالقرنین کون تھا؟ امام رازیؒ نے تفسیر کبیر سورہ کہف میں لکھا ہے کہ مقدونیہ کا سکندر بن فیلقوس تھا جو ارسطو کا شاگرد تھا۔ امام رازیؒ نے ارسطو کے کافر ہونے کی تصریح کی ہے۔ بعضوں نے کیقباد کہا ہے اور بعضوں نے مغفور چین بتلایا ہے۔ بعضوں نے یمن کا بادشاہ ذونواس حمیری بتلایا ہے اور بعضوں نے سامی بادشاہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر تھا، اس کو ذوالقرنین قرار دیا۔ بعض اس کو مصعب بن عبداللہ قرار دیتے ہیں جیسے ابن عبدالبر نے لکھا ہے۔ بعض نے عبداللہ بن ضحاک قرار دیا ہے اور بعض نے سائرس جس کو گورش بھی کہتے ہیں، ذوالقرنین قرار دیا۔ یہ آخیر قول صحیح ہے۔ باقی اقوال صحیح نہیں ہے یہاں اور اقوال بھی ہیں لیکن وہ بھی صحیح نہیں مصعب بن عبداللہ و عبداللہ بن ضحاک کی سند صحیح نہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے تردید کی ہے اور معاصر حضرت ابراہیم علیہ السلام خواہ مصعب ہو یا عبداللہ بن ضحاک ہو ان کی معاصرۃ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تاریخاً ثابت نہیں اور نہ تعمیر سد کا انتساب ان کو ثابت ہے۔ باقی سلاطین مؤمن نہ تھے۔ حالانکہ قرآن اُن کو کم از کم رجل صالح بتاتا ہے اور ان کی طرف اس معین سد کی تعمیر کی نسبت کی صحت بھی ضروری قرار دیتا ہے لہٰذا سائرس ذوالقرنین جو مؤمن صالح تھا جو ۵۵۹ھ قبل از مسیح میں گذرے ہیں۔ ان کے تین اسفار بھی تاریخاً ثابت ہیں۔ سکندر نے قفقاز کا سفر نہیں کیا۔ نہ دیگر

مذکورہ افراد نے سفر کیا ہے۔ ذوالقرنین کا مغربی سفر ایشیائے کوچک کا تھا اور سورج کا غروب عین حمئۃ میں سمرنا کے سمندر کے پانی میں تھا جو سیاہ ہے۔ سائرس نے بابل فتح کر کے بنی اسرائیل کو نجات دی اور بیت المقدس کی تعمیر کی اور یسعیاہ علیہ السلام نے ایک سو ساٹھ ۱۶۰ سال قبل اس تعمیر بیت المقدس کی پیشین گوئی کی تھی۔ یرمیاہ نبی نے پیشین گوئی کی تھی کہ بابل ستر سال یہودی قید رہیں گے۔ پھر بیت المقدس آباد ہوگا۔ امام رازیؒ نے بھی کبیر میں تصریح کی ہے کہ سد کی تعمیر سائرس نے کی۔ ذوالقرنین یقیناً سائرس ہے۔ سائرس دانیال علیہ السلام کے دین کا پیرو تھا۔ یہی تحقیق تاریخ کے علاوہ صحیفہ یسعیا علیہ السلام باب ۴۵ : آیۃ ۱ تا ۴ و مکاشفہ دانیال باب ۸ آیۃ ۱ تا ۸، زکریا کی کتاب باب ۶ آیت ۱۲ و عزرا باب ۱ آیت ۱ تا ۴ سے ماخوذ ہے۔ جو قدیم تاریخ کے اہم ترین ماخذ ہیں۔ ابراہیم زردشت بھی دانیال علیہ السلام کا شاگرد تھا۔ وہ موحد تھا اس کا اوستا اعوذ باللہ و بسم اللہ سے شروع ہوتا ہے۔ ابن کثیر کی بھی یہی تحقیق ہے کہ تھات اصطخر میں دارا کو بھی مومن اور دشمن مجوسیت قرار دیا گیا ہے۔ سائرس ذوالقرنین دارا سے پہلے ہو گذرے ہیں۔ یاجوج ماجوج کے متعلق اُن کے درازی قامت کے واقعات غلط ہیں۔ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں اور حافظ ابن حجر نے بخاری کے باب یاجوج ماجوج میں اس کی تردید کی ہے۔ اسی طرح ترمذی کی روایت ابی ہریرۃؓ کی روایت کہ وہ سد کھودتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ کل باقی کھودیں گے لیکن انشاء اللہ بھول جاتے ہیں تو سد اُسی طرح ہو جاتا ہے۔ جب وقت آئے گا تو انشاء اللہ کہدیں گے تو کھود کر آئیں گے یہ بھی ضعیف روایت ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ سے ابن کثیرؒ نے اپنی اپنی تفسیر جلد: ۳ ص۱۰۵ میں نقل کیا کہ یہ خلاف القرآن ہے۔

فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَ	یاجوج ماجوج نہ سد پر چڑھ سکتے ہیں اور
مَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا (الکہف:۹۷)	نہ اس میں شگاف کر سکتے ہیں۔

ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہ روایت حضرت ابو ہریرۃ نے کعب الاحبار سے لی ہے۔ لوگوں نے غلطی سے مرفوع سمجھ لیا ہے۔ یاجوج ماجوج کا خروج جیسے عقیدۃ الاسلام میں ہے کہ ان کا خروج

سدّ سے نہ ہوگا بلکہ بحیرہ کیسپین سے منچوریا تک کسی جگہ سے ہوگا۔ قرآن نے جہاں سدّ کا استحکام بیان کیا جاتا ہے تو اس کے توڑنے کو قیامت کی علامت قرار دیا ہے لیکن جہاں خروجِ یاجوج ماجوج کا ذکر کیا وہاں سدّ کا ذکر تک نہیں کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خروج سدّ کے راستے سے نہ ہوگا۔ حدیث متفق علیہ۔ ویل للعرب قد اقترب من فتح رُدم یاجوج وماجوج مثل ھذہ۔ عمدۃ القاری جلد ۱۱ میں کرمانی سے منقول ہے کہ یہ استعارہ ہے شیوع فتن سے کہ بند فتنے انگلی کے حلقے کے انداز پر کھل گئے۔ خود سدّ کا کھل جانا مراد نہیں۔ دیکھو عقیدۃ الاسلام ذوالقرنین کی تشریح میں مختلف اقوال ہیں لیکن اصطخر کے آثار قدیمہ سے ذوالقرنین کا جو مجسمہ برآمد ہوا ہے اس میں ذوالقرنین کی آہنی ٹوپی کے دائیں بائیں لوہے کے ابھرے ہوئے سینگ کی طرح لوہے کے سینگ نما خول بنے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ تسمیہ زیادہ درست ہے۔

تتمہ

کفّار کے عذاب کا خلود امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں خَتَمَ اللّٰہُ کی آیت کے تحت کفّار کے دائمی عذاب پر اشکالات پیش کئے ہیں۔ احقر بحمد اللہ اس اہم مسئلہ پر شبہہ نقل کر کے جواب عرض کرے گا۔

پہلا شُبہہ کفار کے دوام عذاب پر بڑا اشکال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ یہ خدائی انصاف کے خلاف ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دوام عذاب انصاف ہے ظلم نہیں۔ ظلم کا مفہوم یہ ہے کہ دُوسرے کی ملکیت میں تصرف کیا جائے اور کفار ملک خدا ہے۔ ان میں خدا کا تصرف اپنے ملک میں تصرف ہے غیر کے ملک میں تصرف نہیں۔

دوسرا شُبہہ دوسرا شُبہہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ دوام عذاب رحمتِ خداوندی کے خلاف ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مجرم کی سزا عین رحمت ہے اور جس حکومت میں مجرم کی سزا نہ ہو اس کو

علوم القرآن پر دیگر مستند مطبوعات

الاتقان	علامہ جلال الدین سیوطیؒ
علوم القرآن	مفتی محمد تقی عثمانی
آیات متعارضہ اور انکا حل	مولانا محمد انور گنگوہی
احکام القرآن	مولانا شمس الحق افغانیؒ
منازل العرفان فی علوم القرآن	مولانا محمد مالک کاندھلویؒ
فضائل القرآن	مولانا ذکریا کاندھلویؒ
قصص القرآن	مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ
لغات القرآن	مولانا عبدالرشید نعمانیؒ
مطالعہ قرآن کے اصول ومبادی	مولانا ابوالحسن علی ندویؒ
تاریخ ارض القرآن	علامہ سید سلیمان ندویؒ
دینی دعوت کے قرآنی اصول	مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ
تدوین قرآن	مولانا مناظر احسن گیلانیؒ
فہم قرآن	مولانا سعید احمد اکبرآبادی

مستند تفاسیر قرآن

تفسیر ابنِ کثیر	امام حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ
تفسیر فتح المنان المشہور بہ تفسیر حقانی	مولانا ابومحمد عبدالحق حقانی دہلویؒ
تفسیر بیان القرآن	مولانا اشرف علی تھانویؒ
تفسیر عثمانی	مولانا شبیر احمد عثمانیؒ
تفسیر معارف القرآن	مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ
تفسیر معارف القرآن	مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ
انوار البیان فی کشف اسرار القرآن	مولانا عاشق الٰہی البرنی مہاجر مدنیؒ